گناہ اور سائنس

Sin and Science

ڈائی سن کارٹر

Dyson Carter

تعارف

جو شخص کسی جدید شہر کے ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے وہ جانتا ہے کہ جرم، گناہ اور سائنس کے معنی کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ دنیا میں اکثر لوگ یا کم از کم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی اکثریت گناہ کی تعریف اپنے اپنے مذہب کے مطابق کرتی ہے۔ مسلمان کے لیے شراب پینا گناہ ہے اور ہندو کے لیے گائے کا گوشت کھانا۔ لیکن عیسائی شراب بھی پیتا ہے اور گائے کا گاشت بھی کھاتا ہے اور جھرجھری تک نہیں لیتا چونکہ گناہ کا یہ رنگا رنگ تصور سماج کو کسی منزل پر نہیں لاسکتا۔ اس لیے بعض افعال کو روکنے کے لئے قانون کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان افعال پر جرائم لیبل لگایا جاتا ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو پولیس اور عدالت سے سزا دلائی جاتی ہے عدالت سے سزا دلانے کے لئے جرم کا ثبوت اور ملزم کو مروجہ قانون کے مطابق مجرم قرار دینا لازمی ہے۔ لیکن گناہ کا ثبوت اور اس کی سزا کا تعین اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا گناہ کی سزا اگلے جہان یا اگلے جنم پر موقوف کردی جاتی ہے۔ سائنس مذہبی اور عدلی قوانین سے آزاد ہے۔ اور سائنس میں محتاط تجربات یا مشاہدات کی منطقی اور مادی تشریح کے بعد نتیجے نکالے جاتے ہیں مثلاً جو شخص زہر کی ایک خاص مقدار نگل جائے، وہ یقیناً مر جائے گا، خواہ اس کا یہ فعل خلاف قانون ہو یا نہ ہو۔ ہم کسی بیماری کے جراثیم کو ایک خاص تعداد تک اپنے جسم میں پرورش پانے دیں تو ایک خاص مدت کے بعد ہمیں وہی بیماری ضرور لگ جائے گی خواہ خدا کی ایسی مرضی ہو یا نہ ہو۔

اگر یہ تینوں نظریئے ایک ہی طرف اشارہ کریں اگر گناہ کرنے سے بیماری لگنے کا امکان ہوا اور ایسے فعل کا ارتکاب جرم بھی ہو تو سماج ایسی برائی کی جڑ کاٹنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ مرد و عورت کے باہمی تعلقات سے متعلق قوانین اور مخصوص جنسی تعلقات سے پیدا ہونے والے مسائل مثلاً طلاق، جنسی بیماریوں اور عصمت فروشی سے متعلق قوانین ہمارے دعوے کا واضح ثبوت ہیں اسی طرح شراب نوشی کے فرد خاندان اور بحیثیت مجموعی سماج پر برے اثرات کے پیش نظر جو مشین کے زمانے میں حادثات کی کثرت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کی ممانعت سے متعلق قوانین ہمارے دعوے کا ایک اور ثبوت ہے۔

ڈائی سن کارٹر نے ان طریقوں کو نہایت خوبصورتی اور غیر جانبداری سے بیان کیا ہے جو عہد حاضر کی دو بالکل مختلف اور اپنی قسم کی واحد اور نمونے کی دنیاؤں میں مذکورہ برائیوں کو نیست و نابود کرنے کے

لئے حال ہی استعمال کئے گئے۔ کسے انکار ہے کہ امریکہ نے سائنس میں عظیم الشان ترقی کی ہے اور اس کی پولیس اس سے بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور طاقت ور ہے۔ ان دو قوتوں کے علاوہ بوقت ضرورت امریکہ کے تمام مذہبی فرقے بھی اپنی کوششیں سماجی مسائل کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ تاہم وہاں طلاق کی شرح دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اور اس کی تعداد دنیا بھی میں سب سے زیادہ ہے۔ اخلاق سدھار سیاسی مہموں، سپیشل پولیس کی بھاگ دوڑ اور منبروں سے وعظ کی یورش کے باوجود جنسی بیماریوں، عصمت فروشی اور شراب نوشی ختم نہیں ہوئی سوویت یونین ایک نئے قسم کے سماج کا سب سے پہلا اور عظیم نمائندہ ہے۔ وہاں ایسی مہلک بیماریوں کے پھیلنے کا ہر ممکن سبب موجود تھا جو جدید سماج کا خاصہ ہیں۔ انقلاب سے مذہب کی منظم حیثیت ختم ہوگئی۔ بہت سی پرانی پابندیاں دور ہوگئیں بدکار کو مجرم گردان کر سزا دینا بند کر دیا گیا طلاق لینا بہت ہی سہل ہو گیا اور حکومت نے خود سستی شراب مہیا کرنا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ بیرونی سرمایہ دار ممالک کی مسلح مداخلت سے جو تباہی پھیلی اور اس کے باوجود وہاں پیداوار کی مسلسل بڑھتی ہوئی شرح کو دھیان میں رکھا جائے تو ان حالات میں سرمایہ دارانہ منطق کے مطابق یہی نتیجہ نکلا جا سکتا ہے کہ وہاں عیاشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ روس میں عصمت فروشی کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ طلاق کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے اور آج ایک ایسے ملک میں آدمی شراب کا نام تک نہیں لیتا جو کبھی اپنے ہاں کے کسانوں اور مزدوروں کی بلانوشی کے لئے بدنام تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں خلاف قیاس اور محض واہمہ معلوم ہوں لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے روس میں ہر سماجی مسئلے کی سائنسی تحقیقات کی گئی اس کی تہ تک پہنچا گیا اور جو حقیقت نکلی اس کی منطقی پیروی کی گئی اس کے بعد یہ خوشگوار نتیجے حاصل کئے گئے۔ سرمایہ دار ممالک میں ایک پولیس کا سپاہی جو سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا ایک مذہبی پیشوا پوچھ نہیں سکتا اور ایک سائنسدان پوچھتا ہی نہیں وہ سوال یہ ہے کہ آخر یہ خرابیاں سماج کیوں پائی جاتی ہیں اس کا اشتراکی جواب یہ ہے کہ یہ برائیاں اس لئے پائی جاتی ہیں کہ آبادی کے بعض طبقے ان برائیوں کے بل پر بھاری منافع کماتے ہیں۔ بدطینت لوگ حرام کاری کو بھی اپنی غرض کے لئے استعمال کرتے ہیں حرامکاری لاتعداد عوام کی اس لوٹ کھسوٹ کا ایک عام نتیجہ ہے جو انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو برے کاموں پر مجبور کرتی ہے۔

عام لوٹ کھسوٹ ختم ہوئی تو بداخلاقی کا بنیادی سبب دور ہو گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو سخت سزائیں دی گئیں جنہوں نے بدکاری سے منافع کمانے کی کوشش کی۔ لیکن یاد رہے سزائیں ان لوگوں کو نہیں دی گئیں جو بدکار تھے بلکہ منافع خوروں کو، رنڈیوں کو نہیں بلکہ چکلہ داروں کو اور شرابیوں کو نہیں بلکہ ناجائز طور پر شراب درآمد کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سب کے لئے باعزت روزگار کے مواقع پیدا کئے گئے۔ اور کام کا حق تہذیب وتمدن کا ایک لازمی جزو بن گیا اس اقدام کے بعد نئی آزادی کے اثرات کا مشاہدہ کرنا اور نئے قوانین، پارٹی پراپیگنڈے اور لوگوں کی سائنٹفک تعلیم کی طرف رجوع کرنا آسان ہو گیا۔ اس کے علاوہ سب کے لئے آرام اور تفریح کی مختلف سہولتیں پیدا کی گئیں مکمل تعلیم اور سستے اور اعلیٰ لٹریچر اور عمدہ موسیقی کا بندوبست کی گیا۔ سنیما اور ذہنی اور جسمانی تربیت کے مختلف ادارے قائم کئے گئے۔ چونکہ ان خرابیوں کے بنیادی سبب کو ختم کر دیا گیا اس لئے وہ ناپید ہوگئیں اور زندگی سب سے پہلی مرتبہ اس قدر خوشگوار بن گئی کہ آئندہ اس سے گریز کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

ہمیں اپنے ملک میں ایسے ہی مسائل کا سامنا ہے اور ہم امریکی طریقہ کار آزما رہے ہیں۔ اس میں

شراب نوشی کی ممانعت بھی شامل ہے۔لیکن ہر منافع خور کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم کر کے انہیں غیر طبعی موت مارے۔ چونکہ وہ باعزت طبقے کا فرد ہے اس لئے اس کا یہ مذموم فعل قابل مواخذہ نہیں۔ پولیس الٹا مظلوموں کو دباتی ہے اور اس ظالم کی ذات اور اس کے منافع کی حفاظت کرتی ہے۔ جو لوگ منافع کے خالق ہیں، وہ فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ غلیظ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور علم کی روشنی سے محروم ہیں۔لیکن ایک سائنسدان اس طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ وہ سرمایہ دار کو فنی مشورے دینے اور اس کی طبی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے حتیٰ کہ انعام کی غرض سے اس کی خوشامد کرنے سے بھی نہیں چوکتا، سبب؟ یہی کہ امیر آدمی کے سوا اور کون جی کھول کر خرچ کر سکتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اس کا داعی یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مظلوموں کو اگلے جہاں میں اجر ملے گا۔ یا یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ غریب اور مظلوم لوگ اس دنیا میں اس لئے یہ دن بھگت رہے ہیں کہ انہوں نے اپنے پچھلے جنم میں برے کام کئے تھے حاصل کلام یہ کہ غریبوں کو یکسر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یا انہیں پہلے سے بھی زیادہ سنگ دلی سے کچلا جا سکتا ہے اپنی نیک نیتی کے باوجود، ایک مصلح قوم انقلاب کے بغیر انقلاب کا پھل چکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروفیسر ڈی۔ڈی کوسامی

آغاز بلا معذرت

مجھے تنبیہہ کی گئی ہے کہ میں یہ کتاب نہ لکھوں اور بلا شبہ بہت سے لوگوں کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ اسے مت پڑھیں لیکن یہ کتاب نہ کسی کو گناہ پر اکساتی ہے نہ کسی کی دل شکنی کرتی ہے بلکہ یہ ایک حقیقت کا سیدھا سادا اظہار ہے۔

اس کتاب میں جن موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور جو سوال اٹھائے گئے ہیں انہیں روائتاً بداخلاقی اور گناہ کے دو مبہم لفظوں سے تعبیر کر کے چپ سادھ لی جاتی ہے بداخلاقی، عصمت فروشی، نوجوان لڑکیوں کی تجارت، جنسی امراض، اسقاط حمل، حرام کی اولاد، طلاق، نوجوانی کی بدکاریوں کے نہایت ہی افسوس ناک پہلو اور شراب کی تجارت اس کتاب کا خاص موضوع ہے۔

حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔لیکن مجھے احساس ہے کہ ان صفحات میں بعض مواد جس بے تکلفی سے پیش کیا گیا ہے۔اس پر حساس قاری حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ میں ایسے قاریوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔تاہم یہ کتاب کوئی سنسنی خیز انکشاف نہیں کرتی اور اس میں گناہ کا ذکر بھی داخلی اور مقبول عام انداز سے نہیں کیا گیا۔ایسی ہزاروں کتابیں پہلے سے موجود ہیں، لیکن یہ کتاب ان سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اظہار حقیقت اس قدر حملے اور خفگی کا موجب نہیں بنے گا جتنا کہ مندرجہ ذیل مقصد اور عملی نتیجے۔اس کی وجہ میں بدکاری کو ایک اچھوتے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔اس میں سائنس اور خارجہ طریقے سے بداخلاقی کے مسائل کا عملی عام فہم اور سو فیصدی کامیاب حل پیش کیا گیا ہے۔

آپ اس دعویٰ کا استقبال نفرت اور مذاق سے کریں تو آپ حق بجانب ہوں گے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ انسانی سماج اخلاقی بدی کے بوجھ تلے صدیوں سے بری طرح پس رہا ہے۔ مطالعے، پرچار،

تصنیف وتالیف، قانون سازی غرضیکہ ہر دیانت دارانہ طریقے سے گناہ پر قابو پانے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش ناکام ہے، جنگ کے دوران میں ہمارے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اخلاقی اقدار کی انتہائی گراوٹ اور جنگ کے بعد اخلاقی معیار کے پہلے سے بھی زیادہ پست ہوجانے سے ہر حقیقت شناس مبصر یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہم بڑ ماری ہے۔ پھر نہایت بے شرمی سے یہ دعویٰ کون کرسکتا ہے۔ کہ جہاں باقی تمام چیزیں ناکام رہیں وہاں ایک کتاب ضرور کامیاب ہوجائے گی۔

کم از کم راقم الحروف میں تو ایسی جرأت نہیں

اب ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کتاب سماجی اخلاق سے متعلق ایک تجربے کی ہی رپورٹ ہے۔ جو وسیع پیمانے پر کیا گیا جس میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور جسے میں من وعن یہاں پیش کردیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے عام پبلک کو اس تجربے سے آج تک آگاہ نہیں کیا گیا۔ جن بااختیار لوگوں کا اس پر تصرف تھا۔ انہوں نے ان حقائق کو اب تک چھپایا ہے اور ڈاکٹروں اور رضا کاروں سے مخفی رکھا ہے۔

مجھے یہ بات دہرانے کی اجازت دیجئے کہ اس کتاب میں حقائق کا ذکر ہے۔ اور اس میں ایسے مسلمہ عملی اقدام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جن کے ذریعے جدید سماج سے بداخلاقی اسی طرح مٹائی جا سکتی ہے جس طرح قرون وسطیٰ کی پلیگ سی وبائیں ختم کی جاچکی ہیں۔

اس سیدھے سادھے دعوے پر وہ قاری یقیناً حیران رہ جائیں گے جو جنسی امراض پر قابو پانے کی غرض سے ایک سائنٹفک پروگرام قبول کرنے کے لئے تو تیار ہیں لیکن جنہیں یقین ہے کہ گناہ کی چند ایسی صورتوں کے لئے روحانی طریقہ ہی موزوں ہے جن کا تعلق خاندانی شرافت، طلاق اور دونوں صنفوں کے درمیان اخلاقی تعلقات، حرام کاری، یا شراب نوشی سے انسانی وقار کی تباہی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بداخلاقی فرد کی اپنی روحانی زندگی تک محدود ہے لہذا اسے خارج از بحث سمجھنا چاہیئے۔ دوسری طرف ایسے لوگ ملتے ہیں جن کے نزدیک صرف طبی تحقیق ہی بداخلاقی اور بدکاری کو دور کرسکتی ہے۔ گویا سماجی برائی ایک قسم کا فاسد مادہ ہے اور ماہر کیمیا گروں کو تجربے کی آزادی دے دی جائے تو وہ اسے ایسی سہولت سے دور کریں گے جس طرح نئی دوا پنسلین سوزاک کو ختم کردیتی ہے۔

آج کل ان دونوں خیالوں کے زبردست حامی ملتے ہیں۔ چونکہ ان طریقوں میں سے ہر ایک بڑی حد تک کامیاب طریق کار ہے اس لئے وہ بہت سے لوگوں کو موزوں نظر آتا ہے۔ تاہم سب سمجھ دار اور دیانت دار لوگ ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک عملی صورت کا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں گناہ کے خلاف نہ نام نہاد طبی طریقہ موثر ثابت ہوا ہے نہ خالص مذہبی طریق ہی، بدکاری گھٹنے کا نام ہی نہیں لیتی، اخلاقی گراوٹ اتنی شدید ہے کہ آج تک دیکھی نہ سنی۔

گزشتہ چند سالوں کے واقعات سماجی زندگی کی کوئی دلکش تصویر پیش نہیں کرتے۔

مصنف

''سن اینڈ سائنس'' (گناہ اور سائنس) کے مصنف آمسٹر ڈائی سن کارٹر ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈ اور انگلستان میں بہت زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ''سی آف ڈسٹنی'' (تقدیر کا سمندر)، ''نائٹ آف فلیم'' (شعلے کی رات)، ''سٹالنس لائف'' (حیات استالین)، ''مین، مشینز اینڈ مائیکرو بس'' (انسان، مشینیں اور جراثیم) کے علاوہ ''اف یووانٹ ٹوانونیٹ'' (اگر آپ کچھ ایجا د کرنا چاہتے ہیں)، جیسی مشہور و معروف کتب بھی شامل ہے جسے ''بک آف دی منتھ کلب'' (ماہ حال کی بہترین کتاب) کا انتخاب کرنے والی انجمن نے موجدین کے لیے معیاری درسی کتاب قرار دیا ہے۔

سائنسی ترقیات کے موضوع پر مصنف کے مقالے مختلف قومی رسائل و جراید میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور وہاں سے انگریزی دان دنیا میں منتخب مضامین کے مخزنوں میں دوبارہ نقل کیے جاتے ہیں۔ آپ نے کینیڈ اوی براڈ کاسٹنگ کار پوریشن سے نشر ہونے والے سلسلہ مضامین ''سائنس ان دی نیوز (سائنس کی خبریں) اور رشین ڈائری (روسی روز نامچہ) بھی لکھی ہیں، آپ لیکچرر کی حیثیت سے بھی بہت زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی سب سے زیادہ مقبول عام تصنیف ''رشیاس سیکرٹ دیپن'' (روس کا خفیہ ہتھیار ہے) جسے بے نظیر شہرت حاصل ہوئی، بڑے بڑے مدیروں نے اسے سراہا اور یہ کتاب مختلف روز ناموں میں چھاپی گئی۔ اس کا سات زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

مصنف نے اپنی کسی ابتدائی تصنیف میں اشارہ کیا تھا کہ وہ بوقت فرصت گناہ کے مسئلے پر سائنسی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالیں گے۔ لہذا موجودہ کتاب قاریوں کے پرزور اصرار اور تقاضے پر لکھی گئی۔

وکٹری گرل

ایسے حضرات جن کا کام محض عیب جوئی ہے اس شاندار بہانے سے کہ گناہ تو آدم اور حوا سے چلا آتا ہے تمام اخلاقی مسائل کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں سے دور اٹھا پھینکتے ہیں۔ یہاں ہمیں گناہ کی ابتدا کے مذہبی تصور سے متعلق کچھ نہیں کہنا۔ جہاں تک موجودہ زمانے کی جمہوریت پسند قوموں کو بدکاری کے خلاف اقدام پر ابھارنے کا تعلق ہے۔ ایک سائنس دان سب سے زیادہ مبارک باد کا مستحق ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ صحت کے سابق سرجن جرنل ڈاکٹر ٹامس پیران نے 1936 میں ایک رسالے میں ایک تاریخی مقالہ لکھا۔ اس مقالے کو پڑھ کر لاکھوں انسان دم بخود رہ گئے۔ ایک بین الاقوامی شہرت کے مالک ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ جنسی امراض کے موضوع کو اس ریاکارانہ سنسر شپ سے آزاد کر دیا جس نے بزعم خویش اسے عام تعلیم یافتہ لوگوں سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے دو ایسی بیماریوں آتش اور سوزاک کو ہر نوجوان و پیر کے آگے رسوائے اشاعت کر دیا جن کا ذکر اخباروں کے اداریوں میں کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ وہ حیران کن حقائق جو سرجن جنرل نے افشا کئے مختصراً درج ذیل ہیں۔

1936 میں تیس لاکھ سے زیادہ امریکی آتشک میں مبتلا تھے اور تقریباً نوے لاکھ سوزاک کے مریض تھے۔ مزید بریں ہر سال پانچ لاکھ افراد آتشک سے متاثر ہوتے تھے اور اس سے تگنے سوزاک سے۔ ہر سال لاکھوں افراد دل کی بیماریوں سے مرتے تھے جن کا سبب آتشک تھا۔ آتشک سے پاگل

ہونے والے لوگوں کی حفاظت پر ہر سال کروڑوں ڈالر خرچ ہوتے تھے ان دونوں بیماریوں سے براہ راست جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ناکارہ ہونے والے لوگوں کی تعداد اس قدر بھیانک تھی جس کا تصور بھی محال ہے کینیڈا، برطانیہ اور اکثر دوسرے ملکوں میں بھی صورت حال اتنی ہی بری تھی یا اس سے بھی بدتر۔ ڈاکٹر پیران نے جنسی امراض کے بارے میں حق گوئی سے کام لیا انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ بیماریاں بعض لوگوں کے نجی گناہوں کی سزا ہیں۔ بلکہ انہوں نے بتایا کہ دونوں بیماریوں ایسے سماجی طاعون ہیں جو ہر قسم کے پیشہ ر مذہبی، نسلی اور معاشرتی لوگوں کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ اور اس رفتار سے بڑھ رہے ہیں کہ ان سے قوم کی مجموعی صحت خطر میں ہے ڈاکٹر پیران نے قوم سے کچھ کرنے کی اپیل کی۔ ان کی دعوت عمل کے خلاف شرمیلا سا احتجاج تو ہوا لیکن بدکاری پر طبعی حملے کو شرک قرار دینے کے باوجود بہت سے پادریوں نے بھی جنسی بیماریوں کی روک تھام کے لئے ڈاکٹروں، رضا کاروں، مدیروں اور قانون سازوں کا ساتھ دیا۔ سرجن جنرل کے اس اعلان سے ان لوگوں کی کچھ ہمت بندھ گئی کہ سب سے زیادہ مہلک مرض آتشک کو تیس سال کے عرصے میں ختم کیا جا سکتا ہے۔

یہ 1936 کا واقعہ ہے۔ مہم کہیں دو سال بعد شروع ہوئی۔ قانون پاس کئے گئے۔ ان گنت روپیہ جمع کیا گیا۔ رہائشی شفا خانے اور تجربہ گاہیں کھولی گئیں لاکھوں اشتہار بانٹے گئے لاکھوں مریضوں کے خون کا معائنہ کیا گیا اور مہم کا آغاز بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

ڈاکٹر پیران نے 1940 میں ایک اور مقالہ لکھا جس میں انہوں نے بتایا کہ آتشک کے بیس فیصد مریض شفایاب ہو چکے ہیں لیکن سوزاک کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جنسی بیماریوں کے خلاف جو جہاد شروع کیا گیا تھا۔ اس میں حسب توقع کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے فوراً بعد سرکاری اعداد و شمار شائع کئے گئے جن سے پتہ چلا کہ مہم کا نتیجہ تو بالکل الٹ نکلا ہے ان اعداد و شمار کے مطابق 1942 میں امریکی افواج میں جنسی بیماریوں کے مریضوں کے تعداد 1939 کے مقابلے میں بڑھ گئی تھی۔

یہ صورت حال دیکھی تو امریکی فوج کے منتظمین نے اپنے طور پر مہم چلائی انہوں نے پوری طاقت سے بدکاری کا صفایا کرنے کی ٹھان لی۔ ان حضرات نے ماضی کے تجربے سے آنکھیں بند کر لیں اور گشتی گاڑیوں میں گناہگاروں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا انہوں نے جنم جنم کی مظلوم، قربانی کی بکری طوائف کی نگرانی اور بھی کڑی کر دی اس قسم کے اخلاق پرست لوگ جو موقع بے موقع، سرم، جرم اور سزا کی رٹ لگائے رکھتے تھے وہ بڑے جوش و خروش سے سزا کا مطالبہ کرنے لگے اللہ اللہ کہاں وہ موثر سنہری سیکم جہاں چند سال پیشتر جنسی بیماریوں کو سائنسی شائستگی کے ساتھ ملیا میٹ کرنے بیڑا اٹھایا گیا تھا اور کہاں یہ سزا کا نعرہ۔

دیوالیہ پن کی انتہا اس وقت ہوئی جب کہ بہت سی مشہور و معروف ہستیوں خصوصاً جین ٹیٹے نے مردوں سے شریفانہ اپیلیں شروع کر دیں کہ گناہ کرنا چھوڑ دو، عورت کو بھول جاؤ اور بیماری کا خاتمہ اس ابدی قدر سے کر دکھاؤ جسے زہد و تقوی کہتے ہیں لاکھوں فوجی سپاہی کچھ عرصے کے لئے اپنے آپ کو نامرد تصور کرنے پر مجبور ہوئے اور انہیں یوگی بننا پڑا۔ اس اصول کی بنا یہ سچائی تھی کہ یوگی کو جنسی بیماری نہیں لگتی اس طرح زربفت میں لپٹا ہوا سائنسی جہاد وکٹوریائی موعظت پر ختم ہوا۔

1943 کے شروع میں برعظیم امریکہ ایک بار پھر چونک گیا فوجی افسروں اور دفاع صحت اور بہبود کے محکموں کے منتظمین کے درمیان ایک اچھوتی جھڑپ جاری ہو گئی یہ محکمے امراض کے بڑھتے ہوئے

طوفان پر بوکھلا گئے اور شور مچانے لگے کہ تمام بڑے بڑے شہروں میں ''بے حیائی کے اڈوں'' سے عورتوں کو نکال دیا جائے انہوں نے مطالبہ کیا کہ خطرناک مقامات کو دوسری آبادی سے قطعاً الگ تھلگ کر دیا جائے پادریوں کو جو موقعہ ملا انہوں فوراً اس تجویز کی حمایت کا اعلان کیا اور وہ منظّم بدکاری کے خلاف لوگوں کو ابھارنے لگے اور عصمت فروشی کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکانے میں آسانی سے کامیاب ہو گئے حالانکہ بہت سے لوگ یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ یہ علت ایک مدت سے ختم ہو چکی ہے لیکن افواج نے اس مہم کے خلاف بھی زبردست احتجاج کیا تو یہ لوگ اور بھی بھونچکے رہ گئے۔ بعض فوجی منتظمین نے اس مسئلے کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو اس قدر آزادی کے ساتھ پیش کیا کہ اخلاق پرست حضرات لاحول پکار اٹھے انہوں نے کہا کہ بدکاری کے اڈوں سے عورتوں کو نکال دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شہر میں ان کا تعاقب جاری ہو جائے گا انہیں مخصوص اور محدود علاقوں میں اپنا کاروبار جاری رکھنے دیا جائے۔ تو فوجی پولیس کم از کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ باوردی سپاہیوں کو ان علاقوں میں نہ گھسنے دے۔

ایڈیٹروں اور رضا کاروں کی تو گویا زبانیں گنگ ہو گئیں ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہو گیا کہ وہ اس خطرناک جھگڑے میں کس کا ساتھ دیں لیکن دفاع صحت اور بہبود کے محکموں کے ایک افسر مسٹر چارلس پی ٹافٹ کو اپنی تجویز کی کامیابی کا سو فیصدی یقین تھا۔ اعداد و شمار ایک نہایت ہی لذیذ لقمہ لے کر آگے بڑھے ان کی ایجنسی کے پاس یہ ثبوت تھا کہ ایک طوائف اپنے کوٹھے میں ایک رات میں کوئی پچاس سپاہیوں کو بیماری لگا سکتی ہے اس کے برعکس اس عورت سے اس کا اڈہ چھین لیا جائے اور اسے گلی محلے میں چوری چھپے کاروبار چلانا پڑے تو وہ ایک رات میں زیادہ سے زیادہ آدھی درجن گاہکوں کو بیماری لگا سکے گی۔ مسٹر ٹافٹ تقدس اور زہد و تقویٰ میں ہرگز یقین نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے فوجی افسروں سے کہا کہ حرام کاری کو شہر کے ممنوعہ علاقے میں بند کر کے اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور وہ یہ ہے کہ اس سے عام سپاہیوں میں عموماً اور نوجوان سپاہیوں میں خصوصاً گناہ کی رغبت پیدا ہو گی اور حرام کاری کا پرچار ہوگا۔

لیکن ایک بحث کا مفید نتیجہ ضرور نکلا۔ لاکھوں شریف انسانوں نے شدت سے محسوس کیا کہ عصمت فروشی کا منظّم کاروبار کتنی نفرت انگیز چیز ہے اور اس حقیقت کا احساس پیدا ہوا کہ گاہکوں کی بڑی تعداد ایسے شہریوں پر مشتمل ہو گی جو مضافات میں رہتے ہیں۔

مسٹر ٹافٹ اور ڈاکٹر پیران کی قائم کردہ کمیٹیوں نے تین سو سے زیادہ شہروں میں چکلے بند کرا دیئے۔ اس سے بہت سے مقامات پر جنسی بیماریوں کا پھیلاؤ عارضی طور پر رک گیا۔ اس کے بعد سیہ کاری کے خاص اڈوں مثلاً سستے ہوٹلوں، سیاحوں کی رہائش گاہوں، تفریح گاہوں وغیرہ کے خلاف مہم شروع ہو گئی۔ بری اور بحری فوج نے اپنی طبی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ رخصت پر جانے والے سپاہیوں اور جہازیوں کو مانع امراض دوائیں پہلے سے زیادہ استعمال کرائیں گئیں۔ چند ماہ کے بعد یہاں وہاں سے جو اعداد و شمار جمع کئے گئے وہ کافی حوصلہ افزا تھے سپاہیوں میں بحیثیت مجموعی جنسی امراض میں کمی واقع ہوئی لیکن اس کا ایک سبب یہ تھا کہ سپاہیوں کو سمندر پار میدان جنگ میں بھیج دیا گیا تھا۔ البتہ شہری آبادی میں جنسی امراض میں کمی کی رفتار حوصلہ افزا نہ تھی۔

اس اثنا میں سیہ کاری کے مخالفین کی لغت میں کیا نئے لفظ.....وکٹری گرل کا اضافہ ہوا امریکہ کی بحری فوج کے دو ڈاکٹروں نے اچانک اشاعتی تاریپڈ و داغ دیئے لفٹیننٹ کمانڈر روشن گراؤ نے نیویارک کے

رہنے والوں کو اپنے بیان سے حیران کر دیا کہ دنیا کے سب سے بڑے شہر نیویارک میں طوائف اتنی خطرناک چیز نہیں رہی۔ چار سے تین جہازیوں کو غیر پیشہ ور لڑکیوں سے بیماری لگتی ہے یہ جہازی خیال کرتے تھے کہ اتفاقاً ہاتھ لگی ہوئی چیز بے ضرر ہوتی ہے لفٹیننٹ کمانڈر بکلے نے فلاڈیفیا کے اعداد وشمار جمع کئے اور نتیجہ نکالا کہ نوجوان اوباش لڑکیوں کی تعداد بدکار عورتوں سے چوگنی ہے۔ آخر یہ لڑکیاں کون تھیں۔ چودہ برس یا اس سے زیادہ عمر کی دوشیزائیں۔

اخبار ٹائم کے نامہ نگار مقیم نارفوک نے لکھا ہے کہ پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے سے پہلے نارفوک میں طوائفوں کی اکثریت پیشہ ور تھی۔ اور آج پچاسی سے نوے فیصدی طوائفیں عام فیشن پرست عورتوں پر مشتمل ہیں ان میں بہت سی نوجوان لڑکیاں ہر ہفتے سینکڑوں کی تعداد میں آتی ہیں زرعی فارموں میں کام کرنے والی اور شہروں میں کلرکی کا کام کرنے والی لڑکیوں کے لئے اپنی پسند کا مرد تلاش کرنے کا یہ بڑا ہی آسان طریقہ ہے۔

امریکہ کی میڈیکل ایسوسی ایشن نے اپنے جرنل میں ان حقائق کی تصدیق کی اور لکھا کہ پرانی وضع کی طوائف کی حیثیت اب ثانوی ہوتی جارہی ہے۔ طوائف کی نئی قسم انیس بیس سالہ نوجوان لڑکی ہے۔ درحقیقت جنسی بیماریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا اور پھیلانے والا ہمیں میں سے ایک ہے۔

بحراوقیانوس کے اس پار برطانوی میڈیکل ایسوسی ایشن نے بھی اپنے جرنل میں انگلستان سے متعلق اس قسم کے حقائق کا انکشاف کیا اور انگلستان میں جنسی بیماریوں سے متاثر ہونے والے لوگوں کو تعداد اتنی ہی بتائی جتنی مسٹر بکلے نے فلاڈیفیا کے بارے میں بتائی تھی۔ اس جرنل کی رپورٹ کے مطابق طوائف سے ایک مرد کو بیماری لگتی ہے تو شوقین پیشہ ور عورتوں سے چار کو۔ آسٹریلیا کے ڈاکٹروں نے اپنے ملک کے نوجوانوں میں بدکاری اس سے بھی کہیں زیادہ بتائی کینیڈا کے صاحب اقتدار حضرات نے کھلے بندوں اندازہ لگانے سے گریز کیا۔ لیکن نوجوانوں کے خلاف مقدموں سے متعلق عدالتی کاغذات سے اندازہ لگایا گیا کہ تیرہ سے انیس برس کی لڑکیاں ملک بھی میں باقاعدہ گناہ کی طرف مائل ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ یہ اخلاقی گراوٹ محض جنگ کی وجہ سے تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگ کے دوران میں کثیر آبادی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا اور عارضی صنعتی ترقی اور خوشحالی اخلاقی گراوٹ کا باعث بنتی ہیں لیکن سماج کے ایک نئے خطرناک عنصر نئی قسم کی بدکردار لڑکی سے نفرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ حقیقت تو اس نئے رجحان کی طرف جاتی ہے۔ جس کا اخلاق اور شرافت سے کوئی تعلق نہیں اس سلسلہ میں ہم دو مشہور کتابوں کا حوالہ دینا ضروری سمجھتے ہیں جو 1939 شائع ہوئی تھیں۔ پہلی کا نام تھا ''نوے گنا زیادہ مجرم'' جس کا مصنف ہک تین پاول تھا۔ دوسری کا نام ''رنگین نقوش'' جس کا مصنف کوراٹنے ریلے کو پر تھا۔ یہ دونوں کتابیں بداخلاقی پر تھیں اور ان میں بتایا گیا تھا کہ نئی پود کی نوجوان لڑکیوں کو بداخلاق سمجھنے کا خیال 1925 سے چلا آتا ہے۔ امریکی پارلیمان کے ایک ممبر کلاوپیر کی سرکردگی میں ایک ذیلی کمیٹی جنگ کے زمانے کی صحت وتعلیم کا جائزہ لینے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے 1943 کے آخر میں اپنی رپورٹ تیار کی جس میں بتایا گیا کہ حال ہی میں نوجوان میں جرائم کی تعداد میں جو اضافہ ہوا ہے اسے جنگ سے منسوب نہیں کیا جاسکتا یہ اس قدرتی عمل کا نقطہ عروج ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا جب کہ اچھے اور برے اشخاص کے درمیان سماجی حدود

تیزی سے مٹ گئیں۔

مذکورہ بالا حقائق سے دو نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جنسی امراض پر طبی حملہ ناکام رہا۔ اور ڈاکٹر پیران کا یہ دعویٰ کہ آتشک کو رہائشی شفاخانوں اور تعلیم کے ذریعے تیس سال کے عرصے میں ختم کیا جا سکتا ہے۔ ناقابل قبول ہے۔ بہت سے ترقی پسند مذہبی راہنماؤں نے بھی ڈاکٹر پیران کی طرح پیشگوئی کی تھی لیکن انہوں نے بھی منہ کی کھائی کیونکہ ہر اتوار کو گرجوں میں پند و نصائح کو جو چکر جاری ہے اس سے باہر نکل کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جنسی امراض کو بداخلاقی کے پورے مسئلے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح لوگوں کو نیک بننے کی تلقین کرنے سے جنسی بیماریوں ختم نہیں کی جا سکتیں اس طرح بڑے بڑے طبی منصوبے اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک لاکھوں انسانوں میں جنسی تعلقات کا تاوان ادا کرنے کی مقدرت نہ ہو۔

دوسرا نتیجہ ذرا کم واضح ہے ایسا لگتا ہے کہ جنسی بیماریوں کے خلاف جہاد کرنے والے ایک خاص قسم کی بیماری میں مبتلا ہیں وہ ایک ہی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں ان کا اندازہ یہاں تک خطا سے مبرا ہے کہ وہ بعض عورتوں اور لڑکیوں کو جنسی بیماریوں کی ذمہ دار سمجھتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں کہ ایک وکٹری گرل ایک رات میں کتنی مرتبہ اپنے دامن کو داغدار بنا سکتی ہے۔ لیکن جونہی مردوں کے چلن کی پڑتال کا وقت آتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں یہ اندھے مصلح حضرات بیماریوں میں مبتلا غیر ذمہ دار اور بدکردار لڑکی سے خفا ہو کر ان کے خلاف اقدام کے لئے میزوں پر گھونسے مار مار کر چلاتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ عورتوں کا سوال اٹھے تو فوراً اس کے خلاف مہمیں پیش کر دی جاتی ہیں لیکن مردوں کا سوال اٹھے تو یہ مہمیں اعداد و شمار سے آگے نہیں بڑھتیں۔ لڑکیوں کی نگرانی، تعاقب، گرفتاری سزا اور ان کی اصلاح لازمی ہے۔ لیکن مردوں کے لئے محض علاج معالجہ، تنبیہہ، مانع امراض چیزیں یا محض وعظ کافی ہے۔

سائنسی لٹریچر کو عموماً غیر جانبدار کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ غیر جانبداری بھی نام نہاد ہی ہے کیونکہ یہاں بھی حقیقت کو ایک آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر لوگ ہمیشہ یہی کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ عورتیں بیماری لگاتی ہیں اور مردوں کو بیماری لگتی ہے۔ اس کے الٹ کبھی نہیں سنا گیا۔ جہاں تک سماجی برائیوں کے حل کا تعلق ہے۔ اس کے لئے جو طریقہ پیش کیا جاتا ہے وہ بالکل غیر موثر اور سطحی ہے بدکاری کی ایک ہی مصیبت یعنی جنسی بیماریوں کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک کیسا مسئلہ بن چکا ہے جس کے سماجی نتائج نہایت ہی تباہ کن ہیں اور ہمارے مذہبی اور سائنسی راہنماؤں نے اسے حل کرنے کی کوشش میں اور بھی الجھایا ہے۔

اخلاقیات کے اکثر ماہرین کو بلا تامل سہل انگار کہا جا سکتا ہے سہل انگاری کیا ہے یہ کیا لاعلاج روحانی درد ہے جسے نامعقولیت اور تعصب کے جڑواں ذہنی کیڑے پیدا کرتے ہیں لغت میں عام طور سے سہل انگار کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے ندرت خیال چھو سکتی ہے نہ بلندی نصب العین لیکن مشہور ناول نگار میکسم گورکی سہل انگار حضرات کو انسانی مسرتوں کے جانی دشمن سمجھتا تھا۔ اور ان کا ذکر کرتے وقت اس کے قلم سے چنگاریاں جھڑنے لگتی تھیں۔

ایک مرتبہ اس نے کہا کہ جس چیز کو ہم ''قانون کی روح'' یا ''روایت کہتے ہیں اس سے سہل انگار کے ذہن میں ایک ایسے مشینی ڈھانچے کا تصور پیدا ہوتا ہے جو کسی کلاک سے مشابہ ہو جس کا بڑا سبب سہل انگار نکتہ چین کے خیالات کے چکر کو حرکت میں لانا ہے اس نے اپنے طنز کو ان الفاظ پر ختم کیا ہر سہل انگار کا

مقولہ ہے کہ چیزیں جیسی ہیں ویسی ہی رہیں گی۔ سہل انگار نکتہ چین ایک مردہ مچھلی ہے جس کا سر سب سے پہلے سڑتا ہے۔

کتنے سخت الفاظ ہیں بظاہر ان کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں لیکن مقصد پوری طرح واضح ہے جمہور کی اخلاقی مصیبتوں کو دور نہ کر سکنے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم ایسے مفکروں میں گھرے ہوئے ہیں جو بظاہر گناہ کی مذمت کرتے ہیں لیکن ان کی اپیلیں اتنی فضول اور اکتا دینے والی ہیں جیسے کہ کلاک کی دو آوازیں ٹک اور ٹک وہ ہمیں اس سے آگے نہیں لے جا سکتے یہی خالص سہل انگاری ہے اسی کو گندے ماضی سے چمٹ کر دل کو جھوٹی تسلیاں دینے کی کوشش کہتے ہیں قصہ کوتاہ سہل انگاری کبھی کی مر چکی ہے، سڑ چکی ہے۔

لیکن سڑاند کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے ہماری موجودہ نسل تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہم اپنے ماضی کی گندگیوں کو ختم کرنے کی وسیع پیمانے پر جدوجہد کر رہے ہیں ہم افلاس اور مکر کے ایک ایسے قید خانے کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں بنی نوع انسان کو صدیوں تک پابند سلاسل رکھا گیا ہے تمام انسان تیز رفتاری سے اپنے شاندار مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا عوامی دنیا کے سماج میں منظّم بدکاری بھی شامل ہے کیا ہم چاروں آزادیوں کا اطلاق نوجوان لڑکیوں کی تجارت پر بھی کریں گے۔ کیا ہم لاکھوں نوجوانوں کی اخلاقی بحالی کے لئے کوئی پروگرام تیار کر سکتے ہیں۔

بدکاری سے متعلق عام بازاری خیال یہ ہے کہ سماجی برائیاں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہی ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ اس خیال کا تھوتھا پن عہد غلامی کی برائیوں کے انجام ہی سے ثابت ہو جاتا ہے انسانوں کی خرید فروخت ہزاروں سال جاری رہی۔ اور مذہب پرست، سہل انگار لوگ نسلاً بعد نسلٍ غلاموں کی تجارت کو جائز قرار دیتے رہے اور اس نظام کے ابدی ہونے کا اعلان کرتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود مہذب قوموں نے سو سال کے اندر ہی غلامی کے نظام کو تہس نہس کر دیا اس کے بعد ہم نے ایسے طاعون ختم کئے جو سخت ہلاکت خیز تھے اور ان کے متعلق بھی بزرگان دین کا فتویٰ تھا کہ یہ ابدی ہیں اور اب اقوام متحدہ کے ماہرین فن تمام دنیا سے قحط کو باہر نکالنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ کروڑوں انسان صدیوں تک غلامی، بیماری اور کال کے ہاتھوں تباہ ہوتے رہے۔ لیکن کھاتے پیتے اور ہٹے کٹے علماء منہ بسور بسور کر کہتے رہے کہ شر ابدی ہے۔

میں یہاں ایک بار پھر گور کی کا حوالہ دیتا ہوں اس نے ایک مرتبہ کہا تھا ''کہ آؤ تھوڑے عرصے کے لئے ہی دیانتداری برتیں اور حقیقت کو پہچانیں۔''

جن دنوں امریکہ میں جنسی بیماریوں کے خلاف جہاد اپنے عروج پر تھا۔ فیڈرل سیکورٹی ایجنسی کے ایک عہدیدار فلپ ایس بروٹن نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا عنوان تھا ''عصمت فروشی اور جنگ'' اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم کیا گیا تھا یہ کتاب امور عامہ کی کمیٹی نے شائع کی تھی اور اس کی اشاعت سے پہلے متعلقہ ایجنسیوں نے اور محکموں نے اس کے متن کی بڑی احتیاط سے جانچ پڑتال کی تھی۔ لہٰذا یہ کتاب مستند تھی مسٹر بروئن ایک امریکی فوجی میں بدکاری کے مثالی طوفان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس قسم کا کاروبار کرنے کے لئے کسی تردد کی ضرورت نہیں یہ کام خود بخود شروع ہو جاتا ہے اور یوں چلتا ہے جیسے شہد کے پیچھے مکھیاں اور جہاز کے پیچھے گرداب۔ تاریخ شاہد ہے کہ فوج کو اس سے نباہ کرنا پڑا

ہے۔ ہر بندرگاہ اور صنعتی ترقی اور خوشحالی کا ہر دور اس کی آماجگاہ ہے اور زنا اور جنسی امراض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

آگے چل کر فاضل یہ دردناک آواز بلند کرتا ہے کہ جنسی بیماریاں ابدی ہیں اور لوگوں کو شر سے بچنے کے طریقے وضاحت سے سمجھاتا ہے گویا ہزاروں لفظوں میں اپنی تردید آپ کرتا ہے۔ میں مسٹر بروٹن کا بیان اس لئے درج کیا ہے کہ وہ نیم سرکاری ہے اور حرام کاری سے متعلق عام مسلمہ یاس انگیز اور سطحی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اس کا بیان سراسر غلط ہے۔

سب سے بڑی تاریخی فوج میں زنا کا نام تک نہیں تاریخ میں سب سے بڑا صنعتی ارتقا، بدکاری کے عروج کی بجائے اس کے زوال کے بعد رونما ہوا۔ گذشتہ بیس سالوں میں بیسویں صنعتی شہر اور بڑی بڑی بندرگاہیں غیر معمولی رفتار سے منصۂ شہود میں آئی ہیں۔ لیکن ان میں بدکرداری نے کبھی ادنیٰ سے مسئلہ کی حیثیت سے بھی سر نہیں اٹھایا امر واقعی یہ ہے کہ روئے زمین پر ایک ایسا ملک موجود ہے جس کا سماج اٹھارہ کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے لیکن وہاں سے عصمت فروشی جنسی بیماریوں کو عملاً ختم کر دیا گیا ہے وہ ملک سوویت یونین ہے۔

لارڈ اور لیڈی پاس فیلڈ بیٹرس اور سڈنی ویب اور قیور نیالڈس جیسے محقق اور ہزاروں ماہرین طب جنہوں نے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے سائنس کے رسالوں کو اپنی رپورٹیں بھیجیں اور اسی قسم کے بے شمار غیر جانبدار مبصرین متفق الرائے ہیں کہ سوویت یونین میں بیس سال کے قلیل عرصہ میں بداخلاقی کے نازک سے نازک مسائل جن میں جنس اور شراب سے متعلقہ مسائل بھی شامل ہیں۔ ایسی کامیابی سے حل کئے گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور یہ کامیابی اس حقیقت کے پیش نظر کتنی عظیم ہے کہ آج سے کوئی بیس برس پہلے جب کہ بداخلاقی کے خلاف روس میں مہم شروع کی گئی اور وہاں کی آبادی مجموعی حیثیت سے جنسی بے رہروی اور شراب نوشی کی لغت میں اس بری طرح گرفتار تھی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔

ہٹلر نے مشرقی محاذ جنگ کا آغاز کیا ہی تھا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بحری فوج کے کمان افسر مسٹر نارمن نے جوان دنوں ماسکو جانے والے ہیری مین مشن کے ممبر تھے اور روس میں امریکی سفارت خانے سے ہیلتھ آفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ روس کی سرخ فوج اور فضائیہ جنسی بیماریوں کی لعنت سے مبرا ہیں۔ اور یہ بات دنیا کی کسی فوج کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ بہت کم اخباروں نے اس بیان کو شائع کیا اور اتحادی قوموں کے ان رہنماؤں نے اس کا استقبال خاموشی سے کیا جو جنسی بیماروں کے خلاف ہمیں چلا رہے تھے اس واقعے کے کوئی تین سال بعد پروفیسر لیبی دین کو روس کی ریڈ کراس سوسائٹی کے نمائندے کی حیثیت سے امریکہ پہنچے تو ایسوسی ایٹیڈ پریس، امریکہ کے نمائندوں نے ان سے ملاقات کی یہ اخباری نمائندے پروفیسر صاحب کے اس جملے پر منہ میں قلم دبا کر رہ گئے کہ نوجوان روسیوں کی موجودہ نسل کو کبھی عصمت فروشی کے معنی تک جاننے کی ضرورت پیش نہیں آئی اس بیان کو ایک طرف بے شمار لوگوں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا اور دوسری طرف اسے شبہ کی نظر سے دیکھا گیا لوگوں نے مزید تحقیقات کی ہر چند کوشش کی۔ لیکن اس موضوع کو فوراً ترک کرا دیا گیا۔

آج سے پانچ سال پہلے سوویت یونین کے چند ماہرین فن کے ساتھ زنا اور شراب نوشی کے

موضوع پر تبادلہ خیالات کرنے کا مجھے بھی موقع ملا۔ مجھے ان کی باتوں کی سچائی کا یقین ہو گیا تو میں نے ان سے ایک خاص سوال کر دیا کہ ٹھیک ٹھیک بتایئے کہ سوویت حکومت نے عصمت فروشی، بدکاری، جنسی بیماریوں، نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی اور شراب نوشی کی عادت کی روک تھام کے لئے کیا کچھ کیا۔

لیکن جواب میں سوائے خاموشی کے کچھ نہ پایا۔ یہ روسی سب کے سب نوجوان تھے انہوں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے پیشہ ور عورت کی شکل نیویارک اور ٹورنٹو کے بازاروں میں دیکھی تھی البتہ انہوں نے برملا کہا کہ سوویت یونین کو ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کئے مدت گذری۔ کم از کم دس سال کا عرصہ ہو چکا ہوگا۔ ہم اس وقت ابھی بچے ہی تھے ہمیں اتنا تو یاد پڑتا ہے کہ ہمارے والدین ان اقدامات پر بحث کیا کرتے تھے جو بدکاری کے خلاف عمل میں لائے جاتے تھے۔ لیکن ہمیں ان کی تفصیلات یاد نہیں ہمارے لئے یہ کیا قصہ پارینہ ہے۔

ان دنوں کینیڈا اور روس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ میں نے بداخلاقی کے خلاف سوویت اجتہاد کی مکمل داستان ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انگریزی میں ان سے متعلق کوئی واضح اور مفصل رپورٹ شائع نہیں ہوئی لامحالہ میں نے ایسے پروئیویٹ ذرائع سے تفصیلات اکٹھی کیں جن کا سوویت حکومت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا یہ مسودات تکنیکی اور مستند تھے اور اس میں عصمت فروشی اور جنسی بیماریوں سے متعلق جو مواد تھا اسے پروفیسر وی ایم برونز نے ترتیب دیا تھا جو جنسی بیماریوں کے ماہر تھے اور محکمہ صحت کے افسر اعلیٰ کے مشیر بھی تھے اور انہیں یورپ بھر میں جنسی بیماریوں کے ایک چوٹی کے ماہر سائنس دان مانا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا رپورٹوں میں جو کہانی موجود ہے۔ یہ کہانی اسی پر مشتمل ہے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ سوویت یونین سے اکثر لوگوں کی ہمدردی ایک خاص حد سے آگے نہیں جاتی۔ ہم جن موضوعات پر قلم اٹھا رہے ہیں ان میں وہی مسائل اور عندیئے شامل ہیں جو سوویت حکومت پر اکثریت کے عدم اعتماد بلکہ نفرت کی بنیاد ہیں۔ مثلاً یہی چیز جسے پراپیگنڈہ کرنے والے حضرات ''سرخ اخلاقیات'' اشتراکی آزادی محبت، اسقاط حمل اور سہل طلاق کے ذریعے خاندان بلشویکانہ تباہی وغیرہ کہتے ہیں اس کتاب کا موضوع ہے۔ ہمیں بار بار بتایا جا رہا ہے کہ اہل روس ایک ایسی قوم ہیں جن کی اخلاقی اور روحانی اقدار کو سختی سے تباہ کر دیا گیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اب روس میں طوائف کا نام ونمود تک نہیں بعض حضرات فوراً بول اٹھیں گے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے سرکاری قانون کے صدقے سے ہے جس کے رو سے تمام عورتوں کو مشترکہ ملکیت قرار دے دیا گیا۔ لیکن ان تمام بچگانہ الزام تراشیوں کا جھٹلانے کے لیے موجودہ جنگ میں تمام روسی قوم کا مجموعی کردار اور روس کے بے شمار جوانوں، مردوں اور عورتوں کا متاثر کن بلند اخلاق ہی کافی ہے جنہوں نے حال ہی میں ہمارے ملک کا دورہ کیا ہے۔ روس کا مشہور جنگی ترانہ ''میری منتظر رہ'' ایک ایسے سپاہی شاعر کی تخلیق یقیناً نہیں ہو سکتی جس کی بیوی اس کے آبائی شہر کی مشترکہ ملکیت ہو۔ روس کے طول وعرض میں وسیع پیمانے پر فتح کی خوشیاں منائی گئیں اور ان موقعوں پر بہت سے روسی شہری مدہوش بھی دیکھے گئے لیکن روس کی پولیس کو کسی ایک شرابی پر پستول اٹھاتے نہیں دیکھا گیا۔

آج بین الاقوامی حالات کی رفتار کا تقاضا ہے کہ ہم روس کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ ایک پیشہ ور پراپیگنڈسٹ کی رسمی تعریف وتذلیل پر کفایت کرنے کے دن گذر گئے پھر بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے یہ خیال قابل قبول نہ ہو کہ ہم سوویت

یونین سے گراں قدر اخلاقی سبق سیکھتے ہیں۔ کیونکہ انسانی تعلقات کا یہ ایک ایسا نازک حصہ ہے جو ہمیشہ سے ہدف تنقید بنا رہا ہے۔ بین الاقوامی تجارت اور دنیاوی امن کی خاطر باہمی اشتراک عمل تو ممکن لیکن روسیوں سے سبق سیکھنے کی بات تو انتہا پسندی کی دلیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روس کے باشندوں نے نہ کبھی ماضی میں وعظ کیا ہے نہ آج کل کرتے ہیں۔ وہ اتنے مصروف ہیں کہ انہیں ہمارے لئے مشنری بننے کی فرصت ہی نہیں۔ لہٰذا جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ وعظ نہیں بلکہ روس کی اخلاقی پالیسی اور منصوبے کی خارجی حقیقی رپورٹ ہے۔ اگر اس کے باوجود آپ اسے وعظ تصور کریں تو میں ایک بات ضرور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ وعظ سنتے سنتے آپ کو نیند نہیں آئے گی۔

بدکاری کا پاسپورٹ سسٹم

روس کی موجودہ حکومت نے سوویت یونین کی عنان انتظام 1917 کے انقلاب کے دوران میں سنبھالی۔ کمیونسٹوں کے پلے ایک ایسی قوم پڑی جو نہ صرف معاشی اور جسمانی بلکہ اخلاقی اعتبار سے اتنی گر چکی تھی کہ یقین نہیں آتا۔ روس میں بداخلاقی کی بنیاد عصمت فروشی کا باضابطہ نظام تھا جس کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی زار کی ریاست کرتی تھی۔ یہ نظام ان دنوں داغ بدنامی کی طرح دنیا بھر میں مشہور تھا۔ ''اسے پیلا پٹہ'' کہتے تھے۔

زار شاہی روس میں تمام شہریوں کے پاس اپنے نام اور حلیے کی سند ہوتی تھی۔ جسے پاسپورٹ کہتے تھے۔ اس پاسپورٹ کے ذریعے زار کی پولیس روس کے باشندوں کی نہایت ہی سخت نگرانی رکھتی تھی۔ پاسپورٹ کے بغیر سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا اور مسافر کو ہر وقت گرفتاری کا ڈر لگا رہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا کارڈ نہایت ہی اہم دستاویز تھی۔ گویا یہ جینے کا اجازت نامہ تھا۔ لیکن بے شمار افراد کو اپنی مرضی سے اپنا پاسپورٹ پولیس کے پاس جمع کرانے کی اجازت تھی اور اکثر افراد کو ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ ایسی عورتیں ہوتی تھیں جو عمر بھر کے لئے عصمت فروشی کا پیشہ اختیار کرتی تھیں۔ زار کے عہد حکومت میں یہ کام مردوں کی صحت کے لئے لازمی سمجھا جاتا تھا۔ عورت کی سماجی حیثیت اور اس کی بدکرداری سرکاری قانون کے ماتحت تھی۔

ان قوانین کے مطابق جو عورت بازار میں بیٹھنا شروع کر دیتی تھی اسے حق شہریت سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے اور اسے پاسپورٹ کی جگہ رسوائے عالم پیلا پٹہ لینا پڑتا تھا یہ پٹہ پولیس کی جانب سے عام جاری کیا جاتا تھا۔ یہ پٹہ سرکاری اجازت نامہ تھا اور اسے رکھنے والی عورت کو پولیس کے قوانین کے مطابق کھلے بندوں عصمت فروشی کا حق مل جاتا تھا۔ اس سسٹم کا سب سے مذموم پہلو یہ تھا کہ جو لڑکی ایک مرتبہ یہ حیثیت قبول کر لیتی تھی، اسے اپنی تمام عمر بدکاری کے جہنم میں گذارنا پڑتی تھی۔ اس کے لئے کوئی راہ نجات نہ تھی۔ ہر عورت اپنا پاسپورٹ پیلے پٹے سے تبدیل کرا سکتی تھی۔ اس کے لئے کوئی راہ نجات نہ تھی۔ ہر عورت اپنا پاسپورٹ پیلے پٹے سے تبدیل کرا سکتی تھی۔ لیکن قانون اسے دوبارہ اپنا پاسپورٹ بدلنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ یہ پٹہ اس داغ کی طرح دائمی اور انمٹ تھا جو قرون وسطیٰ میں چوروں کے ہاتھوں پر جلا کر کھود دیا جاتا۔

روس کی مقامی حکومتوں کا دستور تھا کہ وہ لائسنس یافتہ عورتوں کی زندگی اور پیشے کی تفصیلات اور قواعد مرتب کرتی تھیں۔ ہم ان عورتوں کے کاروبار کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ صرف اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ جو عورت ایک مرتبہ اپنے لئے یہ پیشہ منتخب کر لیتی تھی۔ اسے ہمیشہ کے لئے کوئی باعزت روزگار تلاش کرنے کی ممانعت تھی کیونکہ پاسپورٹ کے بغیر ملازمت کا ملنا ناممکن تھا اور وہ اپنا پاسپورٹ پولیس کے پاس جمع کرا چکتی تھی۔

زار کے عہد میں بدکاری عورتوں اور لڑکیوں کی اصلاح کی ذرا بھی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس قانون کی رو سے کسی پیشہ ور عورت کو دوبارہ باعزت روزگار تلاش کرنے کی ممانعت تھی اور وہ زندگی بھر اپنے پیشے کی حدود میں رہنے پر مجبور تھی۔ بصورت دیگر عدالتیں انہیں مجرم گردان کر سخت قسم کی سزائیں دیتی تھیں۔

شرافت کے تقاضے کے پیش نظر ہم زار شاہی قوانین کی تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ تاہم یہ بات قابل توجہ ہے کہ پیشہ ور عصمت فروشی اور زنا کار عورتوں کا وجود سماج کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اکثر مقامات پر پیلے پٹے والی عورتوں کو مخصوص مکانات میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جنہیں سرکاری طور پر حرام کاری کے اڈے کہا جاتا تھا۔ جہاں ایسا ممکن نہ ہوتا وہاں خاص علاقے مخصوص کرائے جاتے تھے۔ بسا اوقات پیشہ ور عورت کے لیے لازمی ہوتا تھا کہ وہ دوسرے کرایہ داروں کی طرح اس مخصوص علاقے میں داخلے کے مکان اپنا نام درج کرائے لیکن اس صورت میں پولیس اس کے نام کے ساتھ اس کا پیشہ بھی ضرور درج کرتی تھی۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ اخلاقی پستی کا تصور بھی محال ہے۔ 1917 کے انقلاب سے پہلے روس بھر میں حرام کاری کا وجود مسلمہ تھا۔ دراصل پیشہ ور عورتوں کو اپنا اتا پتا بتانے پر اس لئے مجبور کیا جاتا تھا کہ جو عورت عارضی افلاس سے تنگ آ کر ایک مرتبہ بھی عصمت فروشی کی ذلت کے گڑھے میں گر جائے وہ دوبارہ پولیس اور اس کے رائج کردہ پیلے پٹے کے سسٹم کے شیطانی چکر سے نہ نکل سکے۔

روس میں حرام کاری کا انتظام خاص اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد بدکاری کی روک تھام تھا لیکن کوئی سمجھ دار آدمی اس سرکاری مکاری سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ دراصل بدکاری کے بندوبست کا خصوصی پہلو یہ تھا کہ پیشہ ور لڑکیوں اور عورتوں کے بہ لحاظ حسن و سن مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ کم سن اور حسین و جمیل لڑکیوں کو اعلیٰ درجے میں رکھا جاتا تھا اور وہ امیروں، وزیروں اور بڑے بڑے تاجروں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں۔ جو عورتیں خاص دل کشی کی مالک نہ ہوتی تھیں انہیں عمر بھر چکلوں میں رہ کر گھٹیا سے گھٹیا جرائم پیشہ لوگوں کے تیر ہوس کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ قانون کے مطابق پیلے پٹے والی عورت مسلسل پولیس کی نگرانی میں رہتی تھی۔ قانون میں پیشہ ور عورتوں کے لئے باقاعدہ ڈاکٹری معائنے اور چکلوں کی تلاشی کی شرط بھی تھی لیکن اونچے طبقے کے لئے مخصوص چکلے اس قباحت سے بری تھے اور پولیس اکثر بدنام قسم کے چکلوں پر ہی چھاپہ مارتی تھی۔

اس نظام کی برکت سے ایسے گندے اور ہولناک افعال سرزد ہونے لگے کہ آدمی کو یقین نہیں آتا۔ بعض اوقات چکلوں میں عورتوں کی قلت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات فوجی افسر شکایت کرتے کہ سپاہیوں میں آتشک کی وبا پھیل رہی ہے۔ لہٰذا قانون پر سختی سے عمل درآمد کرانے کے بہانے پولیس کو پے در پے چھاپے مارنے کے موقعے مل جاتے پولیس بالا روک ٹوک مزدور بستیوں میں جا گھستی اور تمام

بازاروں، گھروں اور تفریح گاہوں کی تلاشیاں شروع ہو جاتیں۔ جہاں اصل پیشہ ور عورتوں گرفتار کیا جاتا وہاں نہایت چالاکی سے بہت سے ایسی لڑکیوں کو بھی دھر لیا جاتا جن کی پاک دامنی اور نیک چلنی پر شبہ تک نہیں کیا جا سکتا۔ ان معصوم لڑکیوں کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا اور ان پر پیلے پٹے یعنی لائسنس کے بغیر پیشہ روی کا الزام لگایا جاتا۔ قانون کی اس خلاف ورزی کا جرمانہ پانچ ہزار روبل یعنی تقریباً تین ہزار سات سو پچاس روپے تھا۔ ظاہر ہے غریب ملزمہ سے اتنی بڑی رقم وصول نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لئے قانون میں اس کا بدل موجود تھا۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں بے قصور اور مجبور ملزمہ سے پاسپورٹ چھین لیا جاتا اور پیلا پٹہ دے دیا جاتا۔ پولیس اپنے چھاپوں کا منصوبہ بڑی ہوشیاری سے تیار کرتی تھی۔ پلان کے مطابق پولیس افسر اصل پیشہ ور عورتوں کے ہمراہ جہاں ان لڑکیوں کو پکڑ لاتے ہیں جنہیں بعد میں پیشے کی لعنت میں مبتلا کرنا مقصود ہوتا تھا وہاں بہت سی غریب اور شریف عورتوں کو بھی لے آتے جن میں اکثر حاملہ ہوتیں اور بچوں کو دودھ پلاتی مائیں بھی شامل ہوتیں جن کو مجرم گردانتا مقصود ہوتا تھا۔ جج صاحبان ان کے علاوہ سب کو باعزت طور پر رہا کر دیتے تھے۔ اس طرح پولیس چکلوں میں پیشہ ور عورتوں کی قلت کو دور کرنے کے لئے جو ذلیل اور انسانیت سوز طریقہ اختیار کرتی تھی وہ قانونی طور پر جائز ہوتا تھا۔

خیال رہے کہ زار شاہی کی عدالتوں کے روبرو تقریباً تمام عورتوں کی حیثیت نہایت ہی مظلومانہ اور پست تھی لیکن پیشہ ور عورتیں تو نہایت ہ مظلوم اور بے بس تھیں۔ ٹالسٹائی کے ناول ''قیامت'' میں ایک ایسی ہی لڑکی کی لرزہ خیز داستان بیان کی گئی ہے جسے حرام کاری کی زندگی پر مجبور ہونا پڑا۔ فاضل ناول نگار نے بتایا ہے کہ زار کے افسر عورتوں کے ساتھ اس قدر سنگدلانہ برتاؤ کرتے تھے کہ امیر طبقے کے لوگ بھی ان کے سامنے بے بس تھے۔ پیلے پٹے کے معنی دراصل مکمل تباہی کے پاسپورٹ کے تھے۔ قانون کی رو سے عورتیں صرف دو صورتوں میں پولیس کی نگرانی سے چھوٹ سکتی تھیں۔ پہلی یہ کہ عورت کی بیماری اتنی خطرناک ہو جائے کہ وہ مردوں کے قابل نہ رہے اور دوسری موت۔

ان حالات میں جنسی بیماریاں خوب پھلتی پھولتی تھیں۔ کبھی کبھار ایسے بااثر روسی لوگ جو ٹالسٹائی کی کتابوں جیسی تحریروں سے متاثر ہوتے یا بعض مشہور ڈاکٹر جو اونچے طبقے کے خاندانوں میں آتشک کے پھیلنے سے گھبراتے تھے وہ جنسی بیماری کی روک تھام سے متعلقہ دفعات قانون پر سختی سے عمل درآمد کراتے۔ لہٰذا احکامات جاری ہوتے اور جھوٹی مہمیں چلائی جاتیں۔ پولیس جن ڈاکٹروں کو معائنے کے مامور کرتی تھی انہیں معائنوں کے حساب سے فیس دی جاتی تھی۔ بسا اوقات کمپونڈروں کو معائنہ کے کام پر لگا دیا جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ پولیس چند افسروں کو جمع کر لیتی اور ان کے سامنے فی گھنٹہ چار سو کے حساب سے معائنے کے لئے عورتیں پیش کی جاتیں۔ ہر ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ مریض بھگتانے کی کوشش کرتا اور معائنے کے وقت مریضوں کے لباس اتارنا ضروری نہ خیال کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں جو تشخیص کی جاتی ہو گی وہ نہایت ہی غیر تسلی بخش اور غلط ہوتی ہو گی۔ چونکہ مرض دریافت ہونے کی صورت میں علاج کرانا لازمی تھا اور علاج کے لئے بے شمار روپے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا بدنصیب عورتیں سستا طریقہ اختیار کرتی تھیں اور پولیس اور ڈاکٹروں کو نقدی کی صورت میں رشوت دے کر گلوخلاصی کرا لیتی تھیں۔

لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ روس کے ماہر ڈاکٹر پیلے پٹے کے مذموم سسٹم سے نجات کا راستہ تلاش کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام حل جنہیں زمانہ جدید کے ماہرین

دریافت کررہے ہیں۔انقلاب سے پہلے روس میں دریافت کئے گئے آزمائے گئے۔اور''ریاکارانہ گریز'' کہہ کرترک کردیئے گئے۔پورے تیس سال کا عرصہ گزرا کہ ڈاکٹر ابراہام فلیکسلز نے ایک مشہور کتاب لکھی تھی۔جس کا نام یورپ میں''عصمت فروشی'' رکھا گیا تھا۔اس میں انہوں نے آخری اور فیصلہ کن دلیلوں کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ عصمت فروشی پر کنٹرول سرے سے نامعقولیت اور حماقت ہے۔

جنسی امراض کے پھیلاؤ کو کسی خاص عرصے کے لئے نہ تو چکلوں کی نگرانی نہ دوسرے طریقے یعنی طوائفوں پر پولیس کا تشدد ہی کم کرسکتا ہے اور زنا کار عورتوں اور مردوں کا طبی معائنہ اس وقت تک قطعاً ناممکن ہے جب تک ہم ایک ایک ڈاکٹر کو گھیر کر ایک وسیع فوج میں منظم نہ کرلیں جن کا کام صرف جنسی امراض سے متاثر لوگوں کا معائنہ کرنا ہو خون کے معائنوں اور دواؤں کے ذریعے آتشک اور سوزاک پر قابو پانے کے لئے اس برعظیم (یورپ) میں اتنے شفاخانے کھولنے کی ضرورت ہے جتنے آج گیس سٹیشن قائم ہیں۔

زار شاہی روس کے حکمران اس سماجی برائی سے متعلق مندرجہ بالا تلخ حقیقت سے واقف تھے لیکن انہوں نے اس کے خلاف کچھ نہ کیا کیونکہ وہ معذور تھے۔انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بدکاری پر سرکاری کنٹرول کا نتیجہ لامحالہ یہ نکلے گا کہ قانون پر عمل درآمد کرانے والا محکمہ خود خراب اور رشوت خور بن جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اس خرابی کو تسلیم کیا اور اسے قانونی حیثیت دے دی۔ ہر طوائف کو پیلے پٹے کی بل پر کاروبار کرنے کا حق حاصل کرنے کے لئے فیس دینا پڑتی تھی اور اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ مجسٹریٹ یا دوسرے سرکاری افسر کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

ایسی صورت حال کو آج ہم ہرگز گوارا نہیں کرسکتے۔1917 کے پہلے کے روس میں جو بداخلاقی کا مسئلہ پایا جاتا تھا۔اس میں اور ہمارے ہاں کے آج کل کے مسئلے میں ایک اعتبار سے حیران کن مشابہت ہے۔ان دنوں روس میں زنا کاری دن بدن بڑھ رہی تھی۔زار کی وزارت انصاف کے اعداد وشمار کے مطابق بدکاری اور جرائم میں پہلی جنگ عظیم کے پہلے کے بیس سالوں میں مسلسل زیادتی ہوئی۔قتل وتشدد آمیز جرائم میں پچاس فیصد اضافہ ہوا۔حرام کاری پہلے کی نسبت تین گنا بڑھ گئی۔ پیلے پٹے کے سسٹم کے رائج ہونے سے بھی اس میں کمی واقع نہ ہوئی بلکہ حرام کاری نے اور بھی زور پکڑا۔1913 میں سینٹ پیٹرزبرگ (لینن گراڈ) کے شہر میں ساٹھ ہزار رجسٹرڈ پیشہ ور عورتیں تھیں۔اس کے ساتھ ہی شراب کی کھپت میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوا۔کیونکہ شراب اور زنا دونوں لازم وملزوم ہیں۔خاص طور پر نوجوانوں میں شراب نوشی کی عادت زور پکڑ گئی۔اندازہ لگایا گیا کہ دس سال کے عرصہ میں نوجوانوں کی اخلاقی حالت پہلے کی بہ نسبت دوگنی پست ہوگئی۔اگرچہ زار کی عدالتیں ایسے نوجوانوں کے خلاف مقدمات کی سماعت بھی کرتی تھیں جن پر شدید ترین جرائم کے ارتکاب کا الزام ہو۔لیکن وہ نوجوانوں میں بدکاری سے متعلق اعداد وشمار کو یکسر نظرانداز کرجاتی تھیں۔روس میں انقلاب عظیم کی آمد کے وقت دس میں سے آٹھ طوائفیں ایسی تھیں جن کی عمر اکیس سال سے کم تھی۔طوائفوں کی نصف تعداد نے یہ پیشہ اس وقت سے اختیار کیا تھا جب کہ وہ اٹھارہ سال کے سن کو بھی نہ پہنچی تھیں۔دس میں سے چار طوائفوں نے حرام کاری کی زندگی کا آغاز سولہ سال کی عمر سے کیا تھا اور بہت سی چودہ سال کے سن کو پہنچنے سے پہلے ہی زینت بازار بن گئی تھیں۔

ہم ان حقائق کو یہ کہہ کر نظرانداز نہیں کرسکتے کہ یہ خرابیاں زار روس کے عہد ہی کا خاصہ تھیں۔ان کا

جواب ہمارے ہاں موجود ہے۔ ہمارے ہاں کی وکٹری گرلز بھی ہائی سکول کی طالبات کی عمر کی لڑکیاں تھیں۔ سماجی تاریخ شاہد ہے کہ بداخلاقی زور پکڑتی ہے تو سیہ کاروں کی اوسط عمر اسی تناسب سے کم ہو جاتی ہے۔ یعنی بدکاری کا آغاز نسبتاً کم سنی سے ہونے لگتا ہے۔

اس مسئلے سے متعلق ہم نے حال ہی میں غفلت ترک کی ہے۔ ڈاکٹروں نے اپنی مساعی دگنا کر دی ہیں۔ پادری نصیحت کرنے اور ڈرانے لگے ہیں اور سیاست دان حضرات ماہرین کی کمیٹیاں قائم کرنے لگے ہیں۔ اس سے 1910 کے زار شاہی روس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب کہ ایسے لوگوں نے زار کی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا تھا کہ بدکاری کی روک تھام کے لئے کچھ کیا جائے جو سلطنت زار کے اندر گناہ اور جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ روس میں دوسرے ملکوں کے سیاح جاتے تھے تو وہ بلا جھجک کہہ دیتے تھے کہ مہذب دنیا پیلے پٹے کے سسٹم کو نہایت ہی نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس پر امیروں، وزیروں اور ڈاکٹروں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایماندار لوگ مارے ندامت کے عجیب الجھن میں پھنس جاتے تھے۔ انقلاب روس سے سات سال پہلے اخلاق سدھار تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ زار نے بدکاری کے خلاف منظم جہاد شروع کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے ایک کانگرس بلائی اس کانگرس کے سامنے سب سے بڑا بحث طلب سوال تھا حرام کاری سے متعلقہ قوانین کی تنسیخ یعنی عصمت فروشی پر سے سرکاری کنٹرول اٹھانے کی تجویز۔ روس کے ٹریڈ یونین رہنماؤں نے اس کانگرس کو کافی اہمیت دی اور انہوں نے اس میں اپنے دن مندوب بھیجے۔ پولیس نے ہر چند دباؤ ڈالا کہ ان نمائندوں کو نہ سنا جائے لیکن اس کے باوجود انہیں اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ جب انہوں نے اس کہاوت کے مطابق کہ ''سو سنار کی ایک لوہار کی'' اعلان کیا کہ روس میں بڑھتی ہوئی بدکاری کا موجب زار شاہی نظام ہے تو مجمع حیرت میں پڑ گیا۔ انہوں نے معاشی اور سیاسی زبوں حالی کو بدکاری کے اضافے کا سبب ٹھہرایا اور دعویٰ کیا کہ موجودہ مطلق العنان حکومت عصمت فروشی اور جنسی بیماریوں کو دور کرنے کی جو بھی کوشش کرے گی وہ انجام کار ناکام ثابت ہوگی۔

اس پیش گوئی کو اس لئے زیر بحث نہ لایا گیا کہ مبادا وہ کانگریس ہمیشہ کے لئے سائبیریا کی جیلوں میں منتقل کر دی جائے۔ لہٰذا پولیس شاہی نے فتح پائی۔ اس کے خیال میں پیلے پٹے کا نظام بہتر تھا اور دوسرے ملکوں میں حرام کاری کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے جو صورت حال پائی جاتی تھی۔ یہ نظام اس پر قابل ترجیح تھا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ نچلے طبقے کی چند ہزار عورتوں کا عمر بھر کے لئے عصمت فرشی اختیار کر لینا اس سے بدرجہا اچھا ہے کہ شریف خاندانوں کی بیٹیاں بھی سیہ کاری کی لپیٹ میں آئیں۔ ان کی لمبی چوڑی تقریروں اور ریاکارانہ دلیلوں کے پیچھے جو تلخ حقیقت پوشیدہ تھی اسے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے کہ سلطنت روس میں بدکاری پر باقاعدہ سرکاری کنٹرول حکومت کے لئے نہایت ہی منفعت بخش تھا دراصل بدکاری پر کنٹرول کرنے کے بہانے روس کی عورتوں سے قانوناً کثیر رقم وصول کی جاتی تھی جو ساری کی ساری زار کے بددیانت اور رشوت خور افسروں کی جیبوں میں جاتی تھی۔ چونکہ زار شاہی صرف پولیس کی آمریت کی بدولت قائم تھی۔ اس لئے اعلیٰ حکمرانوں نے فیصلہ کر دیا کہ محکمہ پولیس کو جو آمدنی نوجوان لڑکیوں کی عصمت کی تجارت سے ہوتی ہے اس میں دخل نہ دیا جائے۔ لہٰذا جو کانگریس بدکاری سے متعلق قوانین کی تنسیخ کے لئے بلائی گئی تھی وہ اس عیارانہ نتیجے پر پہنچ کر ختم ہوگئی کہ ''نچلے طبقوں'' کی عورتیں خطرناک حد تک بدکار ہیں۔ کیونکہ ان کی گذران ہی عصمت فروشی پر ہے چرچ نے اس فیصلے کو

اپنی ازلی انداز میں سراہا اور اعلان کیا کہ انسان ازلی گناہ گار ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اس اجتماع نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا کہ بداخلاقی اور نبی نوع انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور عورتیں ہی اس کی ذمہ دار ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں اس دلچسپ بحث کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے جو امریکہ میں بھی جاری تھی اور جس کا موضوع یہ خیال تھا کہ جنسی بیماری کو سماجی مسئلہ تسلیم کر لیا جائے تو اسے بہ اعتبار نسل دو حصوں میں یعنی گورے اور کالے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کارنل یونیورسٹی میڈیکل کالج کے محکمہ صحت عامہ امتناعی ادویات کے ایک مشہور ممبر ڈاکٹر ڈبلیو۔ جی سملی نے امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے رسالے بابت جون 1934 میں ایک مشہور معروف بیان شائع کیا۔ انہوں نے امریکی فوج کے ان سپاہیوں کا معائنہ کیا تھا جو آتشک کے مریض تھے۔ ان کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

''یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ امریکہ میں آتشک پر قابو پانے کے لئے جو پراپیگنڈہ ہوا ہے اس کا اکثر حصہ گمراہ کن ہے۔ عام طور سے بتایا جاتا ہے۔ کہ دس ہزار افراد میں سے ایک کو آتشک کی بیماری ہے۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ بحیثیت مجموعی گوری نسل کے لوگوں میں آتشک کا عارضہ بہت کم پایا جاتا ہے اور وہ بھی زیادہ گوری نسل کے سب سے نچلوں طبقوں کے افراد تک محدود ہے۔ آتشک کی بیماری عموماً اس قسم کے گورے لوگوں میں پائی جاتی ہے جو جاہل، بداحتیاط، جرائم پیشہ اور غیر مہذب ہیں آتشک اور دراصل ایک سماجی مرض ہے''۔

اس کے بعد ڈاکٹر سملی نے حبشیوں میں آتشک کی شرح دریافت کرنے پر زور قلم صرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''چونکہ آتشک کی بیماری گوروں کی بہ نسبت حبشیوں میں دس گنا زیادہ پائی جاتی ہے اس لئے حکام کا چاہیئے کہ جہاں اس بیماری کا تناسب حد سے زیادہ ہے وہیں اپنے منصوبوں کو دس گناہ زیادہ شدومد سے عمل میں لائیں۔ اور قوم کے سیاہ فام لوگوں میں بیماری کو روکنے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سفید فام لوگوں میں بھی بیماری گھٹ جائے گی۔

یہ دلیل حبشیوں پر ایک کھلے حملے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اکثر جاہل، بداحتیاط، جرائم پیشہ اور غیر مہذب گورے لوگوں کے تعلقات حبشی قوم سے بھی ہیں۔ لیکن ہم ایک منٹ کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ ڈاکٹر سملی کی مراد کچھ اور تھی وہ ڈاکٹروں کی توجہ ایک ناقابل انکار حقیقت کی طرف دلا رہے تھے مگر وہ آگے چل کر کہتے ہیں۔

''یہ رجحان اب تک عام پایا جاتا ہے کہ صحت عامہ سے متعلق سرکاری حلقے اس امر کو سرسری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں یا یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ آتشک کی بیماری حبشیوں میں عام ہے۔ اس حقیقت کو جتنی جلدی مان لیا جائے اور موجودہ صورت حالات کی اصلاح کر لی جائے تو یہ نہ صرف حبشی نسل کے لئے اتنا ہی بہتر ہے بلکہ بہ حیثیت مجموعی قومی صحت کے لئے مفید ہوگا''۔

ڈاکٹر سملی کی نیت بری نہ بھی سہی لیکن وہ خود اور دوسرے بہت لوگ جو ان کی حمایت کرتے ہیں۔ ان افسروں سے زیادہ مجرم ہیں جنہیں وہ ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اس دلیل میں ان حقائق پر جس طرح پر دہ ڈالا گیا ہے وہ ایک سائنس دان کے شایان شان نہیں۔ اس میں حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔

جنسی بیماری گورے لوگوں کی نسبت حبشیوں میں کیوں زیادہ ہے؟ ڈاکٹر سملی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک نسلی خصوصیت ہے۔ کیا یہ سچ ہے! اور پھر گوری نسل کے اکثر غیر مہذب لوگ جنسی امراض

میں کیوں مبتلا ہیں؟

جسے خدمت خلق کا کچھ تجربہ ہے اس کے نزدیک اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے حبشی قوم میں جنسی بیماریوں پر پردہ ڈالنے کی بھی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حق بات کہنے سے وہ ہولناک صورت حال منظر عام پر آتی ہے جس میں حبشی لوگ زندگی گزار رہے ہیں امریکہ کے حبشیوں کی بہت بڑی اکثریت اس قسم کی بے رحمانہ سیاسی اور سماجی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہے جو کبھی زار شاہی روس میں پائی جاتی تھی۔ حبشیوں کے آتشک میں مبتلا ہونے کے سبب بھی وہی ہے جس سے غیر مذہب گورے لوگوں کی بیماری لگتی ہے۔ وہ سبب ہے غربت جسے نسل وسل سے کوئی واسطہ نہیں۔

ڈاکٹر سملی اس واضح اور ٹھوس حقیقت پر اعداد وشمار کا ایک نرم ونازک پردہ ڈال رہے ہیں۔ جس ایسے لوگ خاص طور سے پسند کرتے ہیں جو دانستہ یا نا دانستہ بدکاری کے بنیادی وجوہ کو چھپاتے ہیں ''آتشک دراصل ایک سماجی بیماری ہے''۔ آخر اس فقرے کا کیا مطلب ہے؟ جو مطلب بھی آپ چاہیں نکال لیں۔ معاشی بحران کے دوران میں اس قسم کے فقرے ان نام نہاد سائنس دانوں نے استعمال کئے تھے جنہوں نے امداد یاب اور بے روزگار لوگوں کے حالات کی تفتیش کرتے وقت اپنی غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ سماجی سائنس کے ان متوالوں نے اپنی مصفٰے ناکیں آسان کی طرف اٹھا کر فیصلہ کیا کہ ''بے روزگاری دراصل ایک سماجی مظہر ہے''۔ انہوں نے لاکھوں ''ناقابل ملازمت'' لوگوں کے بارے میں ہزاروں قسم کے نظریئے تراشے۔ وہ ان رجعت پسندوں اشاروں پر ناچ کر ذلیل ہوئے جنہوں نے سائنس کو مادیت میں منتقل کر دیا۔ یعنی رجعت پسندوں نے یہ مقولہ گھڑ لیا کہ ''قابل آدمی بے کار ہو ہی نہیں سکتا صرف ناکارہ، نکمے لوگ ہی امداد طلب کرتے ہیں''۔

آتشک یقیناً سماجی بیماری ہے اور اسی طرح عصمت فروشی بھی سماجی علت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ بداخلاقی اور اس سے وابستہ باقی تمام مسائل ہمارے سماج کی بنیادی خرابیوں کی پیداوار ہیں۔ ڈاکٹر سملی حبشی نژاد امریکیوں کو جرائم پیشہ اور غیر مہذب گوروں کے ساتھ ملا کر سائنسی حقیقت کے دائرے سے باہر نکل گئے ہیں اور خواہ ان کی نیت ہو یا نہ ہو ایسا کرنے سے وہ نسلی تنافر برتنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں ایک نہایت ہی خطرناک ہتھیار دے رہے ہیں۔ آتشک کا اس قسم کا تجزیہ اور بھی شیطانی فعل ہے کیونکہ یہ بیماری جنسی ہے۔ اور یہ سفید جھوٹ ہے کہ حبشی لوگ بہ اعتبار نسل سفید فام لوگوں کی نسبت گھٹیا اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں۔ حبشی قوم کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈے کی ایک بڑی بنیاد ہے اور یہی وہ زہر ہے جس سے متاثر ہو کر جنوبی ریاستوں کے فاشسٹ انتقام کے جذبے سے اندھے ہو کر قتل وغارت کا بازار گرم کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جنوبی ریاستوں کے حبشیوں اور گوروں میں جو اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہیں وہ حبشی نسل میں جنم نہیں لیتیں جو نہ صرف حبشیوں بلکہ اسی طرح سفید فام لوگوں میں بھی بداخلاقی کو جنم دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر سملی ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ حبشیوں کا علاج ہو جائے تو آتشک ختم ہو جائے اس کا تو صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ کالے لوگ ہی گوروں میں بیماری پھیلاتے ہیں۔ ایسے خیالات براہ راست گوئبلز اینڈ کمپنی کی بکواسیات سے چرائے گئے ہیں

اب ہم یہ بتائیں گے کہ دوسرے ملکوں میں ''سماجی بیماری'' کی نوعیت کیا ہے؟ سب سے پہلے کینیڈا کو لیجئے۔ وہاں حبشی آبادی بہت ہی تھوڑی ہے جو تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اور وہاں امریکہ کی بہ نسبت معاشی ناانصافی بہت کم ہے۔ وہاں آج تک کسی نے آتشک کے بیماروں کے متعلق گورے اور کالے

لوگوں کے لئے الگ الگ اعدد وشمار پیش نہیں کئے۔

میں نے کینیڈا کے ڈاکٹروں اور سوشل ورکروں سے تحقیقات کی ہے۔ کینیڈا کے حبشی بھی اوسطاً غریب ہیں لیکن وہ اتنے افلاس زدہ نہیں ہیں جتنے امریکہ کے لاکھوں کالے خاندان اور جہاں تک جنسی بیماری کا تعلق ہے گورے اور کالے کینیڈاوی میں تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔

تاہم امریکہ کے اصلی باشندے انڈین عموماً آتشک میں مبتلا ہیں جو ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سخت لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ متاثر کن وہ اعداد وشمار ہیں جو کینیڈا میں تپ دق سے متعلق ہیں۔ جہاں تک اس مرض کا تعلق ہے کینیڈاوالوں نے کبھی بھی گوروں اور انڈینوں میں خط امتیاز کھینچ لیا ہے کیونکہ بحیثیت مجموعی ملک کی تمام آبادی کے مقابلے میں انڈینوں میں دق کا مرج بہت زیادہ ہے لیکن کینیڈا کے ڈاکٹر حقیقت کی پووہ پوشی کے مجرم نہیں وہ اس نظریے کے ہرگز حامی نہیں کہ انڈین بہ لحاظ نسل سفید طاعون یعنی دق سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ تپ دق ان معنوں میں سماجی بیماری ہے کہ یہ بیماری ان لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑتی جنہیں سماج ہمیشہ کے لئے افلاس کے جہنم میں دھکیل دیتا ہے اور گھٹیا غذا، گندی رہائش، جہالت اور طبی امداد سے محرومی ان کا مقدر ہو جاتا ہے۔ انڈینوں میں تپ دق سے مرنے والوں کی تعداد مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ ڈاکٹر ای۔ ایل۔ راس اور اے ایل پین نے حال ہی میں تخمینہ لگایا ہے کہ جو سفید فام لوگ مخصوص انڈین علاقے کے ساتھ آباد ہیں ان کے مقابلہ میں انڈینوں میں تپ دق کا مقابلہ کرنے کی قوت بہت کم ہے۔ تاہم یہ دلچسپ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ علاج کے بعد ان کی ایک بڑی تعداد نے خاطر خواہ شفا پائی۔ اگر انہیں گورے لوگوں کی طرح سہولتیں اور مواقع میسر کئے جائیں تو مانع اور دافع مرض اقدامات سے وہ بھی اتنے ہی متاثر ہوں گے جتنا کہ گورے لوگ۔ ان محققین نے اس جاں گداز افلاس، غلاظت اور جہالت کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ جس میں بے رحم حکومت وقت نے کینیڈا کے اصلی باشندوں کو دھکیل رکھا ہے۔

آتشک کا مرض امریکہ کے کالے باشندوں میں دس گنا زیادہ ہے۔ تپ دق کینیڈا کے گورے باشندوں کے مقابلہ میں انڈینوں میں دس سے لے کر بیس گنا تک زیادہ ہے۔ یقیناً دونوں امراض سماجی بیماریاں ہیں اور اس کے اصل معنی بالکل واضح ہیں۔

اور وہ معنی یہ ہیں کہ امریکہ کے حبشی اور کینیڈا کے انڈین اپنے اپنے ملک میں سماجی زبوں حالی کی ایک ہی سطح پر ہیں وہ سب سے نچلے طبقے ہیں۔ وہ معاشی گڑھے کی تہ پر ہی رینگتے رہنے پر مجبور ہیں۔ کوئی جوشیلا اور دیانت دار منصوبہ ساز جنسی امراض کے رہائشی شفاخانے یا تپ دق کے خیراتی ہسپتال قائم کرنے کے خواہ کتنے بھی منصوبے بنائے وہ اس سماجی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایک پشت یعنی تیس سال سے زیادہ عرصہ گذرا کہ روس کے ٹریڈ یونین رہنماؤں نے اس کانگریس کے سامنے جو عصمت فروشی کے بارے میں غور کرنے بیٹھی تھی یہی حقیقت رکھنے کی کوشش کی تھی جس کا اطلاق ان دنوں ان کی قوم پر ہوتا تھا لیکن زار کی سلطنت میں حبشیوں جیسی قربانی کی بکریاں نہ تھیں۔ مفکرین نے سماجی بیماری کے اقتصادی وجوہ پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے باز ولہر الہرا کر نچلے طبقے کی عورتوں کو بدکاری پر اور مردوں کو ابدی ہوس پر برا بھلا کہا اور بس۔

اور گورکی کے الفاظ میں زار شاہی اور اس کے ماہرین اخلاقیات ایک مردہ مچھلی کے مشابہ تھے۔ جس کا سر سب پہلے سڑتا ہے۔

آزاد محبت

نومبر 1917 کے انقلاب نے زار شاہی معاشرے کی جھوٹی چمک کو خاک میں ملا دیا۔ نیم جاگیرداری کا نظام پہلے سے ہی متزلزل تھا اور انقلاب کے ایک ہی ریلے سے تہس نہس ہو گیا۔ جو رسمیں اور حقوق صدیوں سے مقدس اور مسلم مانے جاتے تھے وہ فوراً ختم ہو گئے۔ روس کا معاشی، سیاسی اور سماجی بحران اور بھی شدید ہو گیا اور سوویت حکومت کافی مدت تک بدکاری اور بداخلاقی کے خلاف کوئی موثر اقدام نہ کر سکی۔

لیکن انقلاب کے پہلے دن ہی سے کمیونسٹ رہنماؤں کو احساس تھا کہ جو معاشرہ حقیقی معنوں میں آزاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایسے اخلاقی نظام کو برداشت نہیں کر سکتا جس کی بنیاد لاتعداد عورتوں کی غلامی پر ہو جہاں انقلابی حکومتوں کے ہاتھ میں طاقت آتی۔ وہاں پولیس کا انتظام بھی عوام کے ہاتھ میں آجاتا اور سب سے پہلے جو اقدام کیا جاتا وہ پیلے پٹے کے سسٹم کا خاتمہ ہوتا 1917 کے بعد اشتراکی حکومت نے پیشہ ور عورتوں سے ہر قسم کے ٹیکس کی وصولی بند کر دی۔ تاہم اس تبدیلی کا آنا لازمی امر تھا۔ کیونکہ انقلاب تھا ہی منظّم مزدور طبقے کا اور لایا ہی محنت کش طبقے کے لئے تھا۔ مزدور طبقے کی حمایت نہایت ہی مفلس کاشت کاروں نے کی تھی۔ چونکہ روس کی طوائفوں کی بھاری اکثریت شہر اور دیہات کے مفلس اور نادار طبقوں سے جبراً بھرتی کی گئی تھی۔ لہٰذا نئی حکومت ان بدقسمت اور معصوم عورتوں کا وحشانہ استحصال کب دیکھ سکتی تھی۔

یوں پیلا پٹہ غائب ہوا اور تمام عورتوں کے شہری حقوق بحال کر دیئے گئے لیکن اسی سخاوت پر قناعت نہیں کی گئی۔ انقلابیوں میں بھی بعض سیاسی رہنما خیال پرست تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بدکار عورت کو مہذب عورت کے پہلو بہ پہلو استعمال رائے کا حق دے دینے سے اس کا انسانی وقار بحال ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے بہت جلد منہ کی کھائی۔ قدیم زار شاہی حکومت کے زوال کے بعد ہر قسم کی بدکاری جس میں فیشنی عصمت فروشی بھی شامل ہے۔ حقیقتاً بہت زیادہ بڑھ گئی۔

بہت جلد ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ انقلاب سے جو نئی آزادیاں ملی ہیں انہیں عجیب و غریب قسم کے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ ایک اشتراکی نعرہ کہ تمہیں اپنی زنجیروں کے سوا کھونا ہی کیا ہے۔ کارل مارکس کا یہ انقلابی نعرہ اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے متعلق تھا۔ بہت سے روسیوں خاص طور سے نوجوانوں اور دانش وروں نے اس نعرے کو یہ معنی پہنا کر عام کر دیئے کہ ''تمہیں اپنی رکارٹوں کے سوا کھونا ہی کیا ہے''۔ ان لوگوں نے سوچا کہ زار شاہی کے ساتھ ہی اخلاق کے سرمایہ دارانہ معیار کو بھی ختم کر دینا چاہئے۔

جس طرح ان لوگوں کو توقع تھی کہ لینن ایک ہی جھٹکے سے سوشلسٹ سماج پیدا کر دے گا، جس میں ہر چیز ان کی دسترس میں ہو گی اسی طرح ان باتونیوں سے روس کی لڑکیوں اور عورتوں کو یقین دلایا کہ محبت اب پیچیدہ شے نہیں رہی۔ بس جیسے کھانا کھا لیا اور پانی پی لیا۔ ویسے ہی محبت کر لی۔

آزاد محبت کا نظریہ بہت پرانا ہے۔ آج ہمارے ہاں اکثر نوجوان اس کے حامی ہیں لیکن اسے انقلابی لفاظی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا تو بعض روسی مردوں میں یہ خاصا ہر دلعزیز ہو گیا۔ بعض حضرات یہاں تک بڑھے کہ ایک نیا نظریہ لے کر میدان میں آئے اور کہنے لگے کہ زنا کاری کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جنسی تعلقات پر سے ہر قسم کی پابندی ختم کر دی جائے۔

بداخلاقی سے متعلق یہ نیا نظریہ آگے چل کر نہایت ہی نفرت انگیز اور واضح الفاظ میں پیش کیا جانے لگا۔ بعض حضرات کھلم کھلا دلیلیں دینے لگے کہ جب آپ کو بھوک لگتی ہے آپ کھانا کھا لیتے ہیں اور جب پیاس لگتی ہے پانی پی لیتے ہیں اسی طرح جب آپ پر شہوت غالب آئے تو جو عورت بھی آپ کی دسترس میں ہو اس سے محبت کیجئے ایسا کرنا کوئی بداخلاقی نہیں۔

ان لوگوں کے مغز میں یہ بات نہ آئی کہ اخلاق کا یہ معیار قائم ہو گیا تو اخلاق کا جنازہ ہی نکل جائے گا۔ روس کے دانشوروں کی اکثریت نے تو اخلاقی فلسفے کو سرے سے بورژوائی فلسفہ ہی قرار دے دیا اور کہنے لگے کہ یہ زارشاہی دور کی چیز ہے۔ اسے نئے سماج میں جگہ نہ دینا ہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو زارشاہی سماج سے دلچسپی تھی نہ سوویت سماج سے، وہ تو مزدور اور کسان طبقے کی عورتوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔

ان کا قول ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ آزاد محبت کے نظریے کو فوراً تسلیم کر لیا جائے۔ آزاد محبت کے نظریئے کو جذباتی شاعروں سے لے کر اخلاقی خوردبین کے نیچے رکھیئے تو آپ پر اس کی حقیقت فوراً عیاں ہو جائے گی کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ''آزادی'' کے نام سے تمام عورتیں زناکاری شروع کر دیں۔

اشتراکی رہنماؤں کے نظریات اور پروگراموں میں آزاد محبت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اس کے برعکس اشتراکی حکومت کے رہنما جانتے تھے کہ انفرادی آزادی کے پردے میں جس قسم کی آزادی محبت کی وکالت کی جاتی ہے وہ سوشلسٹ سماج کے راستے میں روڑے اٹکائے گی۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ دنیا کی جو طاقتیں اشتراکی حکومتیں کا تختہ الٹنے کی تیاریاں کی رہی ہیں۔ وہ آزاد محبت کے نظریئے کو خوب استعمال کریں گی جسے وہ عورتوں کی ''مشترکہ ملکیت'' کا نام دیتی تھیں۔ سوویت حکومت کے خلاف جو پراپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ اس میں اس بات پر خاص طور سے زور جاتا تھا کہ بالشویک اخلاقیات کی بنیاد اسی پالیسی پر ہے کہ تمام عورتیں ہر مرد کی دسترس میں ہونی چاہئیں۔ یعنی عورتوں کو مشترکہ ملکیت قرار دے دیا جائے۔ شادی کا نظام ختم کر دیا جائے۔ تمام بچوں کی ریاستی اداروں پرورش کی جائے اور بچہ باپ کی تمیز سے آزاد ہو وغیرہ وغیرہ۔

میکسم گورکی عمر بھر زارشاہی روس کے پرفریب اور ظالم نظام کے خلاف جدوجہد کرتا رہا۔ لیکن اس نے چند سال اشتراکی نظام کی مخالفت بھی کی۔ نئے نظام پر اس کا ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کی نجات کے دوران میں ناقابل تغیر انفرادی حقوق بھی پامال نہ ہو جائیں۔ گورکی ان مشہور تاریخی ہستیوں میں سے تھا۔ جنہوں نے شخصی آزادی کے لئے سخت جہاد کیا تھا۔ لیکن اس نے آج کل کے خطیبوں کی طرح چند چوٹی کے افراد کی شخصی آزادی کی خاطر تلوار نہیں اٹھائی۔ کیونکہ آزادی سے اس کا مطلب سب کی آزادی، لاکھوں انسانوں کی آزادی۔ عوام کی آزادی تھا۔

گورکی نہایت ہی مخلص مجاہد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خامی کہاں ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ نئے اخلاقی رجحان کے ذمہ دار اشتراکی رہنما ہیں بلکہ جو شخص اس رجحان کو ہوا دیتے تھے اس نے انہیں ہی ملزم ٹھہرایا اور سخت الفاظ میں اس رجحان کی مخالفت کی۔ اس نے 1920 میں جو کچھ کہا وہ آج ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ اس نے اپنے ایک مشہور ناول میں لکھا۔

''میں محبت کی بحث چھیڑنا نہیں چاہتا۔ تاہم اتنا ضرور کہہ دیتا ہوں کہ میرے خیال میں نوجوانوں

کی موجودہ پود نے جنسی تعلقات کی حد سے زیادہ سادہ بنالیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا انہیں جلد یا بدیر لیکن ضرور ملے گی''۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے لینن نے آزاد محبت کے پرچارکوں پر سرکاری طور سے حملہ کیا۔ وہ عرصہ سے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کلارا زیتکین نامی ایک انقلابی عورت نے لینن سے اس مسئلے پر ملاقات کی تو اس نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا۔ کلارا نے نئے انقلابی خیال کی طرف لینن کی توجہ مبذول کرائی کہ جنسی خواہش بھی پیاس کی طرح ایک فطری، جسمانی حاجت ہے اور جب کبھی خواہش پیدا ہو پیاسے کی طرح پیاس بجھا لینی چاہئے۔ اس نے نئے نظام کے رہنما سے سوال کیا کہ اس کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

لینن نے کہا۔ ''ہاں''۔ پیاس بجھانا ضروری ہے۔

اس کے بعد اس نے اخلاقی ظاہر داری اور تکلفات سے نفرت کا اظہار کیا اور نئے رجحان کی سخت مخالفت کی۔ اس نے کہا۔

''عام حالات میں ایک صاحب ہوش آدمی کو پیاس لگے تو وہ نالی میں لیٹ کر گندے کیچڑ میں سے پانی پی لے گا یا ایک ایسے گلاس میں پانی پی لے گا جس کے کنارے بے شمار ہونٹوں کی نمی سے چکنے ہو رہے ہوں۔ لیکن اس امر کو سماجی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پانی پینا ایک ذاتی فعل ہے۔ لیکن محبت دو زندگیوں کے باہمی تعلقات کا نام ہے اور اس سے تیسرے نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ لہٰذا سماجی اہمیت اور قومی فرض کے پیش نظر ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے مجھے پانی کے گلاس والے نظریئے سے کوئی دلچسپی نہیں حالانکہ اس پر ''تسکین محبت'' کا حسین لیبل لگا ہوا ہے۔ بہر حال اس قسم کی محبت نہ کوئی نئی چیز ہے نہ اشتراکی تمہیں یاد ہوگا کہ گذشتہ صدی کے وسط میں رومانی ادب میں اس نظریئے کا پرچار ''دل کی نجات'' کے نام سے کیا جاتا تھا۔ لیکن عملاً یہ نظریہ نفس کی آزادی بن گیا۔ ان دنوں آج کے مقابلے میں نہایت ہی سلجھے ہوئے طریقے سے پرچار کیا جاتا تھا۔ جہاں تک عمل کا سوال ہے میں کوئی فیصلہ نہیں دیتا۔''

جب لینن سے سوال کیا گیا کہ وہ کس حد تک جنسی آزادی کے مخالف ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

میری تنقید کا مقصد یوگ کا پرچار نہیں۔ اشتراکیت یوگ نہیں بلکہ زندگی کی مسرت اور قوت کا نام ہے اور مطمئن محبت کی زندگی اس کا موجب ہوگی۔ آج کل ہر کہیں جنسی معاملات پر حد سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ میری رائے میں اس سے زندگی کو مسرت اور قوت حاصل نہیں ہوتی بلکہ چھنتی ہے۔ ایک عظیم انقلاب کے زمانے میں اس قسم کے رجحان کا پایا جانا بری بات ہے، بہت بری بات ہے۔ نوجوانوں کو خاص طور سے زندگی کی مسرت اور قوت کی ضرورت ہے۔ جنسی مسائل کے متعلق دائمی نظریوں، مباحثوں اور نام نہاد ''جی بھی کے جینے'' کے نظریئے کے مقابلے میں صحت بخش کھیل، مختلف قسم کی ذہنی دلچسپیاں تعلیم، مطالعہ تحقیق وغیرہ نوجوانوں کے حق میں زیادہ مفید ہیں۔ جسم تندرست ہے تو ذہن بھی تندرست ہے''۔

جنسی تعلقات کے بارے میں اشتراکی رہنماؤں کا سرکاری عندیہ کیا تھا۔ لینن کا مذکورہ جامع بیان اس کا آئینہ ہے۔ لہٰذا ان طویل بحثوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں جن کو لینن کے مختصر بیان نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ البتہ ہمیں ایک چیز ضرور ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اشتراکی پروگرام روس کے معاشرے کی اقتصادی اور سیاسی منصوبہ بندی تک محدود نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دوررس تھا۔

سوویت حکومتیں نہ صرف روزمرہ کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کا عزم کئے ہوئے تھیں بلکہ وہ

خودانسان کی فطرت کو بدل دینا چاہتی تھیں۔اس مقصد کو ماسکوسپورٹس کلب نے اپنے موٹو میں نہایت ہی ڈرامائی انداز میں پیش کر دیا تھا۔

''ہم اقتصادی بنیادوں پر محض انسانی معاشرے کی نئی سرے تشکیل نہیں کر رہے بلکہ ہم سائنسی اصولوں کے مطابق بنی نوع انسان کی اصلاح کر رہے ہیں۔''

ہم اس موٹو کے پہلے حصے کو ہرگز رد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آج ہم بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی اقتصادیات کو بدلنے کی ضرورت ہے لیکن ''سائنسی اصولوں کے مطابق بنی نوع انسان کی اصلاح'' ایک بالکل ہی مختلف مسئلہ ہے یہ چند الفاظ ان تمام فلسفیانہ اور اخلاقی خیالات کے آئینہ دار ہیں جن پر صدیوں سے بحث چلی آتی ہے۔

سب سے پہلے....اس موٹو میں یہ بتایا گیا ہے کہ نسل انسانی کی اصلاح کی ضرورت ہے۔اس کے بعد اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت بدلی جاسکتی ہے۔آخر میں یہ عجیب وغریب خیال کہ سائنسی اصولوں کی مدد سے انسانی فطرت کو بدلا جا سکتا ہے یعنی انسانی فطرت کی اصلاح ایسے طریقوں سے کی جائے جنہیں پہلے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور درست ثابت ہوں تو بلا خوف ناکامی ان پر عمل کیا جائے۔

ہمیں محض فلسفے سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ہمارا تعلق حقائق سے ہے اور یہ امر واقعی ہے کہ انسانی تاریخ میں انسانی اخلاق کے بارے میں جو سب سے پہلا تجربہ کیا گیا اس کی بنیاد انہیں تین اصولوں پر یقین محکم تھا جن کا ذکر ابھی ابھی اوپر کیا گیا ہے۔

ہمیں ان اصولوں کو فی الحال اسی حد تک تسلیم کرنا پڑے گا جہاں تک ہمارے ذاتی اعتقادات اجازت دیں۔لیکن اگر ہم یہ جاننے کے لئے بے تاب ہیں کہ اشتراکی حکومتیں سماج سے جنسی بیماریوں، بدکاری، زنا اور شراب نوشی جیسی بدعتوں کو کس طرح ختم کرنے میں کامیاب ہوئیں تو ہمیں ذرا غیر جانبداری سے کام لینا پڑے گا۔

چلئے! ہم دیانت داری سے غیر جانبدار ہیں لیکن اس خیال کو کیسے تسلیم کر لیں کہ سائنسی اصولوں کی مدد سے انسانی نسل کی اصلاح ہوسکتی ہے؟

ہم نے وہ بڑی بڑی طبی مہمیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں جو ہمارے ملک میں بڑی شدومد سے چلائی گئیں اور اگرچہ وہ جنسی بیماریوں پر قابو پانے تک محدود تھیں لیکن فائدہ پھر بھی کچھ نہ ہوا۔اس کے بعد کسی ذمہ دار سائنس دان نے دوبارہ یہ جرأت نہیں کہ کہ وہ بداخلاقی کا واحد علاج محض تحقیقات بتائے۔ پھر اشتراکیوں کی یہ خوش فہمی کہاں تک درست ہے کہ انجام کار بدی پر نیکی فتح پائے گی؟

اشتراکی سائنس دانوں نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ بداخلاقی دراصل ہے کیا چیز اور اس پراسرار پردے کو چاک جو گناہ کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

سرمایہ داری نے محبت کو قابل احترام بنایا

شہوت ایک انسانی جبلت ہے۔یہ بھوک اور پیاس سے اس لحاظ سے مشابہ ہے کہ یہ بھی اپنی تسکین چاہتی ہے لیکن علم حیات، فلسفے اور تاریخ کے روسی ماہرین نے اس گھٹیا مادی نظریئے کا تجزیہ کیا جسے لینن نے ''پانی کے گلاس'' والی تشبیہہ سے یاد کیا تھا۔تو وہ متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ شہوت اور پیاس میں

ایک بنیادی فرق ہے۔ بچے میں جنسی خواہش پیدائش سے موجود نہیں ہوتی بلکہ رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہے اور جوانی کے دنوں یعنی بارہ چودہ سال تک پوری ترقی کر جاتی ہے۔ جنس خواہش کے جوان ہوتے ہی لڑکے اور لڑکی کے جسم اور ذہن میں نمایاں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ انسانی دماغ کی رنگ آفرینیوں، خیالات تصورات اور سپنوں کے ذریعے جنسی تسکین کی لذت، مسرت اور آرزو بہت بڑھ جاتی ہے لیکن جس کو زندہ رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ بھوک اور پیاس کی پیہم اور متواتر تسکین ہوتی رہے۔ جنسی خواہش کی تکمیل کے جذبے کا یہ عالم نہیں۔ اس خواہش کی کبھار تسکین ہوتی رہے تو کافی ہے۔ لیکن نفسانی خواہش کا حیاتی مقصد بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ بوقت ضرورت اس خواہش کی تکمیل سے ہم والدین بنتے ہیں۔ انسان پیدا ہوتے ہیں اور انسانی نسل قائم رہتی ہے۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔ اس طرح یہ حقیقت بھی سب پر آشکارا ہے کہ جنسی خواہش کی تکمیل سے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے اور انسان کا ذہن اس راحت کو اس قدر پر کیف اور گونا گوں بنا دیتا ہے کہ اسے بھوک اور پیاس سے تشبیہہ دینا ممکن اور غلط ہے۔

اشترا کی سائنس دان اس نکتے پر پہنچ کر اپنے پیش رو اخلاقی نظریہ بازوں سے الگ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جنسی مسئلے کو ابدی مسئلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دعویٰ کیا کہ جدید سماج کے افراد جنسی تعلقات کے اعتبار سے پرانے زمانے کے مردوں اور عورتوں سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنے آج ہم اپنے عصر جانوروں سے۔

انہوں نے اس چیز کا ایک اچھوتا تصور پیش کیا جسے ہم ''محبت'' کہتے ہیں۔ انہوں نے محبت کی اس ادنےٰ تعریف کو کافی نہیں جانا کہ محبت محض ایک مسرت بخش خواہش کا نام ہے۔ ان کے خیال میں یہ تعریف تو محبت کی توہین کی مترادف تھی کیونکہ محبت.... اس سے کہیں افضل شے ہے۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں اشترا کی سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے کہ محبت کا جدید تصور انسانی سماج کی عظمت، ترقی پسندی اور انقلابی ارتقا کا مظہر ہے اور محبت کے مکمل شعور اور مسلسل عروج کی بنیاد پر ہی اصل معنوں میں ایک با اخلاق سماج قائم کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بات کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ سائنس دان اٹھیں اور محبت کے متعلق نظریہ سازی شروع کر دیں۔ یہ تو ایک تضاد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا ایک ماہر پروفیسر محبت کے متعلق وہ تخیل آرائیاں کر سکتا ہے کہ ہمارا ادراک وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ہم اشترا کی سائنس دانوں کے وسیع مطالعے اور تحقیق سے اہم نتیجے اخذ کریں تو ان کا خلاصہ کچھ اسی سے ملتا جلتا ہوگا۔

قدیم وحشی انسانوں میں جنسی تعلقات جانوروں کے سے تھے۔ قوت شہوی مرد کی امتیازی خصوصیت تھی اور عورت محض لذت کشی کا آلہ اور بچے جننے کی مشین تھی۔ قدیم مرد علم حیات کے حقائق سے بالکل بے بہرہ تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ عورت کیونکر حاملہ ہوتی ہے۔ اس لئے وہ والد ینیت کے حقیقت سے بھی آشنا نہ تھا۔ یعنی وہ یہ نہ جانتا تھا کہ دو افراد مرد و عورت کے ملاپ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے اور دونوں کا اس پر برابر کا حق ہے۔ لہٰذا زمانہ وحشت کے ایک خاص سماجی گروہ کی عورتیں اس گروہ کے تمام یا اکثر مردوں سے وقتاً فوقتاً ملتی تھیں۔ یہ رواج وحشی سماج کی امتیازی خصوصیت تھا۔ لہٰذا تاریخ سے پہلے کی دنیا سے متعلق سب افسانے حماقت پر مبنی ہیں۔ قدیم مرد رومانی تصورات سے بالکل عاری تھا۔ اس کی عورت محض بچے جننے اور پالنے کی مشین تھی اور گھٹیا درجے کی محنت کش۔

اس ابتدائی قدیم سماج سے رفتہ رفتہ اس سماج نے جنم لیا جسے ہم عہد بربریت کہتے ہیں۔ اب صرف ایک ہی عورت سے شادی کرنے کا رواج پیدا ہوا اس رواج کی بنیاد علم حیات کے ابتدائی حقائق کے ادراک پر تھی۔ یعنی مرد اب یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ ایک ہی عورت سے ملے تو بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لئے اب بچہ نہ صرف عورت کا بلکہ مرد کا بھی تھا۔ لیکن عورت کی سماجی حیثیت ویسی ہی رہی پہلے وہ بہت سے مردوں کی ملکیت تھی۔ اب وہ ایک مرد کا مال بن گئی۔ وہ جسمانی اعتبار سے مرد کی مطلق غلام رہی۔ حتیٰ کہ اکثر بربر قبیلوں میں سخت محنت کا کام زیادہ تر عورت کو ہی کرنا پڑتا تھا۔

بربریت کے سماج کی کوکھ سے قدیم تہذیب نے جنم لیا۔ نہ صرف اشتراکی کی محققین بلکہ دوسرے ملکوں کے ماہرین بھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کو بربریت سے آگے بڑھانے والی قوت محض ازدواجی رشتوں کا انقلاب نہ تھا بلکہ اس کے موجب اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ عوامل بھی تھے۔ یہاں ان سب پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قدیم مہذب سماج کے ارتقائی مظاہر بہت سادہ اور عام فہم تھے۔ یہ ابتدائی مہذب سماج پرانے قبائلی نظاموں کے مقابلے میں خوراک، رہائش، مکانات اور ملبوسات زیادہ پیدا کرتا تھا۔ اس کی اکثریت مفلس اور محنت کش تھی چند لوگوں کو نسبتاً زیادہ اور امن چین کی زندگی نصیب تھی۔ ایسے لوگوں کے پاس اتنا وقت ضرور نکل آیا تھا کہ وہ فطرت کی پراسرار قوتوں کے بارے میں سوچ سکیں اور مختلف تاویلیں گھڑ سکیں۔

قدرتاً جس چیز نے سب سے پہلے مرد کے دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ جنس تھی۔ انسانی تاریخ کے ماہرین نے ثابت کیا ہے کہ قدیم مرد، جنس اور مذہب میں بہت قریبی رشتہ سمجھتا تھا۔ محبت کی دیوی زہرہ، اناج کی دیوی سیریز وغیرہ کی آفرینش اور فرائض کا تعلق جنسیات سے تھا۔ قدیم مذہبی رسومات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی زرخیزی، سورج کی زندگی بخش روشنی اور دوسری مادی مظاہر فطرت کو پیچیدہ اور مسرت بخش نفسیاتی جذبات اور پراسرار مادریت سے براہ راست وابستہ سمجھتا جاتا تھا۔ آج ہم میں سے اکثر لوگ ان حقیقتوں سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ قدیم مذاہب اور آج کل کے مذہبوں میں بہت سی چیزیں مشابہ ہیں، لیکن قدیم مذاہب روحانی تصورات اور عبادت کے طریقوں کے لحاظ سے بہت سے مختلف تھے۔ قدیم اور جدید مذہب میں کتنی وسیع خلیج حائل ہے۔ یہ حقیقت عصمت فروشی کی اصلیت سے واضح ہے عصمت فروشی نے قدیم ترین زمانے کی عبادت گاہوں میں جنم لیا۔

زمانہ بربریت اور نیم مہذب دور کے مذہبی اصولوں کے مطابق تمام عورتوں کا فرض تھا کہ وہ زندگی میں کم از کم ایک بار یا متعدد مرتبہ اپنے آپ کو مہنتوں کے حوالے کریں اس سے انحراف کی سزا عمر بھر کا بانجھ پن سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ دیوتا ایسی نافرمان عورتوں کو سراپ دے دیتے تھے کہ وہ عمر بھر اولاد کو ترسا کریں۔ مثال کے طور پر بابل میں رہنے والی ہر غریب اور امیر عورت کو زندگی میں ایک مرتبہ محبت کی دیوی زہرہ کے مندر میں ضرور جانا پڑتا تھا۔ وہ عورت اس مندر کے باغ میں اس وقت تک انتظار کرتی جب تک کوئی اجنبی مگر ہم مذہب اس سے ہمکنار نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کے دل کو اس وقت تک قرار نصیب نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ اپنے مذہبی فریضے سے سبکدوش نہ ہو جاتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بھدی اور بدصورت عورتوں کو بسا اوقات کئی سال تک مسلسل منتظر رہنا پڑتا تھا۔ جب کہیں جا کر وہ بڑی مشکل سے کسی پجاری کو بھوگ کرنے اور نجات بخشنے پر رضامند کر پاتی تھیں۔ لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس رسم پر سے مذہبی تقدس کا جھول بہت جلد اتر گیا۔

آخر مندر کی حفاظت اور پجاریوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا تھا؟ ہر مرد کا مذہبی فرض تھا کہ وہ مندر جائے تو چاندی کا ایک سکہ ضرور بھینٹ چڑھائے یہ رواج بے شمار غلیظ اور غیر روحانی خیالات کا ذریعہ بنا۔ اولاً ایسے آدمیوں کی کمی نہ تھی جو چاندی کے سکے کے بل پر دیوؤں کی کوشنودی حاصل کر لیتے تھے۔ کیونکہ نجات کا یہ طریقہ نہایت ہی سہل تھا۔ دوسرے اکثر عورتوں کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں مندر جائیں اور ہر مرتبہ نئے سے نئے پجاری کو ممنوں کریں اور چاندی کا ٹکڑا بھی ساتھ لیتی آئیں۔

ظاہر ہے کہ بت پرست مہنتوں نے اس فاضل آمدنی سے بہت جلد اپنا حصہ مانگا۔ وہ کب دیکھ سکتے تھے کہ عورتیں ان کے مندر میں آئیں اور دیوتا کے درشن بھی کریں اور اشنان بھی، ہوتے ہوتے دیوتاؤن کی پوجا کا گھر عصمت فروشی کا اڈہ بن گیا۔ مرد تو سیدھے اپنی خواہش کے لئے جاتے۔ عورتیں اور مندر کے کرتا دھرتا روپیہ کماتے۔ عبادت گاہ چکلے میں بدل گئی۔

اس طرح بدکاری ایک سماجی کاروبار بن گیا اور کئی صدیوں تک اس کی حیثیت نیم مذہبی اور نیم تجارتی رہی۔ موجودہ ہندوستان میں یہ رواج بعینہ آج تک چلا آتا ہے رومانی افسانوں کی ناچنے والی لڑکیاں، دیوداسیاں، بدکردار قاصاؤں سے مشابہ ہیں جو اپنے گاہکوں سے مندروں میں ملتی ہیں اور ہر ایسے آدمی کی دسترس میں ہیں جو دکشا دے سکے۔

عام لوگ جانتے ہیں کہ عیسائیت نے اس گندے رواج کو مغربی دنیا میں ہر کہیں منسوخ کر دیا لیکن اس سے زنا کاری کا خاتمہ نہیں ہوا اگر کچھ ہوا تو صرف یہ کہ بدکار عورت کلیسا کی حدود سے نکل کر ایک تجارتی اور غیر مذہبی قسم کے مکان میں جا بیٹھی۔ کافی عرصہ پہلے یہ تجربہ یونان میں آزمایا جا چکا تھا۔ قدیم یونانیوں کی شاعرانہ اور عالمانہ قابلیتوں کا احترام واجب لیکن ہم اس دور کی زندگی کی اصلیت کا تجزیہ کرتے ہیں تو یونان کی کلاسیکی تہذیب کی بے پناہ تعریف و تحسین غیر متوازن سی نظر لگتی ہے سیس نامی عورت جسے دیکھتے ہی اس وقت کے بڑے فلسفی ڈیموتھینس پر الہام کی بارش ہونے لگتی تھی ایک کھلی فاحشہ تھی۔ اسی قسم کی عورت اسپاسیا تھی جس کا پجاری پیریکلس تھا۔ یہ عورتیں یونان کی چوٹی کی دلرباؤں میں سے تھیں۔ ان کے حسن اور قابلیت کی جس قدر بھی تعریف آج تک کی گئی ہے اس کے باوجود یہ گھناؤنی حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ سیس۔ اسپاسیا اور دوسری دلربانا زنیں روپے سے پیار کرتی تھیں۔ وہ اپنی ہم پیشہ عورتوں سے زیادہ باوقار اور علےٰ درجہ کی تھیں تو محض اس لئے کہ ان میں وہ خوبیاں موجود تھیں جن کے باوصف وہ زیادہ روپیہ طلب کر سکتی تھیں ان سے نچلے درجے میں ایسی عورتیں تھیں جو ان مردوں کا دل لبھاتی تھیں جو شائستہ بات چیت کی بجائے ناچ گانے کے زیادہ شوقین تھے۔ اس سے بھی نیچے ایک اور درجہ تھا اس درجے کی عورتیں سب سے زیادہ غریب مردوں کی خدمت کرتی تھیں۔ ان طوائفوں کے پہلے درجے کو ہیٹی ری، دوسرے درجے کو ایلیوتریدی اور تیسرے درجے کو وکٹی ریادس کہتے تھے۔

یہ تھا یونان کا گندہ نظام جسے ڈکٹیٹرین سسٹم کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ نظام غیر مذہبی اور تجارتی تھا لیکن ایک بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ عصمت فروشی کے اس نظام کو اخلاقی اعتبار سے ہرگز برا تصور نہ کیا جاتا تھا جس وقت رومی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ ان دنوں روم میں بھی زنا کاری کا ایسا نظام قائم تھا جو مکانات، باتھ یا حمام کے نام سے مشہور تھے۔ ان میں آج کل کے کوٹھوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ باتھ آراستہ پیراستہ ہوتے تھے۔ ان کا ماحول دلفریب اور فنکارانہ تھا اور ان میں حفظان صحت کی ہر سہولت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

عیسائیت نے زنا کار عورتوں کو کلیسا سے نکال کر ایک طرح برا ہی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے بدکاری کے اڈوں کا کلیسا سے الگ کر کے ایک اخلاقی فتح حاصل۔ لیکن زنا کار عورت کو کلیسا سے نکل کر ہمیشہ کے لئے فحش اور بداخلاقی کی زندگی اختیار کرنا پڑی اور وہ سماج میں بیماریوں کا سرچشمہ بن گئی۔ ہوا یہ کہ بدکاری کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں سینکڑوں سال تک اس کے سماجی وقار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں زنا اس قدر عام تھا کہ یقین نہیں آتا تھا۔ چارلس بہادر کی فوج مشرق کے کافر اور بداخلاق لوگوں کے خلاف بڑی سج دھج سے جہاد کرنے نکلی تھی لیکن اس مقدس فوج کے ادنےٰ ملازموں اور خیمہ برداروں میں چار ہزار سے زیادہ فاحشہ عورتیں شامل تھیں۔ کھیل کود کے میلوں، عیدوں اور دوسرے مقدس موقعوں پر عیش وعشرت کا جو بازر گرم ہوتا تھا اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس سے جو صورحال پیدا ہوئی وہ تاریخ طب کا ایک مستقل عنوان ہے۔ ہم یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

تاہم اتنا دینا ضروری اور مفید سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو ایک رواج کی حیثیت حاصل تھی اسے آخر ایک سماجی برائی کیونکر مانا جانے لگا۔ بارھویں صدی کے وسط میں جرمنی اور انگریزی فوجوں نے مل کر لزبن پر چڑھائی کی تو فوجی افسروں نے دیکھا کہ عورتوں کے غول جو فوج کے ہمراہ ہیں وہ سپاہیوں کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے فوج میں زنا کاری اور عصمت فروشی کے خلاف انہوں نے سخت قانون نافذ کرائے۔ مثلاً شاہ فریڈرک اول نے حکم دیا کہ آئندہ کوئی سپاہی اپنے کوارٹر میں عورت کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ جس کسی نے ایسا کرنے کی جرأت کی اس سے اسلحہ چھین لیا جائے گا اور اسے برادری سے خارج کر دیا جائے گا اور عورت کی ناک کاٹ لی جائے گی۔ لیکن عورت کو بدوضع بنا دینے کا یہ وحشیانہ اقدام بھی اسی طرح ناکام رہا جس طرح فوجی جرنیلوں کے بے عزت کرنے کی دھمکی اور پادریوں کے فتوے بے اثر ہوئے۔ لیکن فریڈرک کی مقرر کردہ سزاؤں کو وقتاً فوقتاً استعمال ضرور کیا جاتا رہا اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آئندہ پانچ سو سال یعنی سترھویں صدی عیسوی تک یورپ کے جلاد عورتوں کی ناکیں کاٹنے میں مصروف رہے۔

یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان عورتوں کو ناک کاٹنے کی سزا نہ دی جاتی تھی جو رئیسوں سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کم از کم امن کے زمانے میں تو ایسا ہرگز نہ ہوتا تھا۔ پادری ڈیوڈ جوئس نے 1180 میں ایک رپورٹ میں بتایا تھا کہ ملکہ فرانس اور اس کے دربار کی دوسری عورتوں کو بسا اوقات حسین وجمیل طوائفوں پر معزز بیویاں ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ بڑی الجھن میں پھنس جاتی تھیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر شاہ فرانس لوئیس سینز دہم نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے درباری طوائفوں کو لبادہ پہننے کی ممانعت کر دی گئی تاکہ انہیں آسانی سے پہچانا جا سکے۔

اس سے کوئی سو سال بعد تیرھویں صدی عیسوی میں جب کہ فوجی کیمپوں میں زنا کاری کسی طرح بھی کم نہ ہوئی تو یورپ کی فوجوں میں وہ نظام رائج ہو گیا جسے باضابطہ عصمت فروشی کہتے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک بعض جگہوں پر کئی مرتبہ اس نظام کی وکالت اور حمایت کی جاتی رہی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حکمرانوں نے اس سے بھی پہلے یہ طریقہ رائج کر دیا ہو۔ لیکن شاہ جرمنی فریڈرک ثانی نے 1380 میں اپنے مارشل کو حکم دیا کہ شاہی فوجوں میں دھندا کرنے والی عورت سے ایک مقررہ رقم وصول کی جایا کرے۔ اس کے بعد برطانیہ، فرانس، اٹلی اور ہالینڈ کے حکمرانوں نے مختلف افسروں کے ویسے ہی

اختیارات دے دیئے۔ آج ہم ایسے احکام کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تفاوت راہ ابھی سو سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گذرا ہوگا کہ ایلبا کے ڈیوک نے ہالینڈ پر چڑھائی کی تھی تو اس کے ہمراہ سینکڑوں عورتیں تھیں جو شہزادیوں کے لباس میں ملبوس تھیں اور ان کی رانوں تلے نہایت ہی نفیس گھوڑے تھے۔ بہت سی عورتیں پا پیادہ تھیں اور سب کی سب فوجی وردی پہنے تھیں۔ ان کے پاس اپنے پرچم تھے جو اسی فوج کے جھنڈے سے مشابہ تھے جس سے وہ وابستہ تھیں۔ ڈیوک نے حکم دے رکھا تھا کہ جو سپاہی مقررہ رقم ادا کر دے اسے ٹھکرایا نہ جائے۔

برطانیہ سمیت یورپ کے تمام ملکوں میں عصمت فروشی کی تاریخ ایک ساتھ چلتی ہے۔ برطانیہ کے حکمرانوں نے حملہ آور رومیوں کے رواج کے مطابق پہلے پہل زنا کاری کو باتھوں، حماموں تک محدود رکھا۔ ہنری اوّل کے زمانے تک خاص طور ہے وہ اڈے جو دریائے ٹیمز کے کنارے واقع تھے۔ عیش ونشاط کی دعوتوں اور جنسی رنگ رلیوں کے مرکز بن گئے تھے۔ ہنری دوم کو ان اڈوں پر کنٹرول کرنے کے لئے قانون بنانا پڑا۔ مثلاً مذہبی تہواروں کے موقعوں پر ان اڈوں کو بند کر دینے کا حکم تھا۔ ان اڈوں کے مالکوں کو کسی شادی شدہ عورت یا عیسائی بیرا گن یا نن سے پیشہ کرنے کی ممانعت تھی۔ کوئی عورت اپنے گاہک کے ساتھ ساری رات نہ گذارے وہ کسی معاوضے کی حق دار نہ ہوگی۔

قرون وسطیٰ میں شہروں کی آبادی کے ساتھ زنا کاری بھی بڑھتی گئی۔ فوجوں اور قافلوں کو عورتیں سپلائی کرنے والے دھڑا دھڑ روپیہ کماتے تھے۔ اس وقت جو صورت حال تھی اس کی گواہی بہت سی دستاویزوں سے ملتی ہے جو اب تک محفوظ ہیں۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ 1414 میں شہنشاہ سگمنڈ آٹھ سو سواروں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کے شہر برنی میں داخل ہوا تو برنی کی کونسل نے ازراہ مہمان نوازی کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ معزز مہمان اور ان کے ساتھیوں کو تین دن تک کھلی چھٹی ہے کہ وہ جس طوائف سے بھی چاہیں ملیں۔ یہ دعوت نہ صرف قبول کی گئی بلکہ بعد میں شہنشاہ نے تہ دل سے لکھ کر شکریہ ادا کیا۔

یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جو صورت حالات ہمیں نا قابل برداشت اور مذموم معلوم ہوتی ہے ان دنوں اسے بداخلاقی پر مبنی تصور نہ کیا جاتا تھا بلکہ یہ رواج اس زمانے کی اخلاقیات کا ایک جزو ہے۔ قرون وسطیٰ میں عصمت فروشی کو عام اخلاقی زندگی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ تاہم ایک عرصے سے حرام کاری کو سماج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

تاریخ شاہد ہے کہ عصمت فروشی سماج کے مدراج ترقی کا پیمانہ رہا ہے اس سلسلہ میں جدید جاپان کی صورت حال زیر غور ہے۔ موجودہ جنگ کے دوران میں ٹھنگنے مہذب جاپانی نہایت ہی وحشی ثابت ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ مہذب لوگ بدمعاشی کے ہزاروں اڈوں کے مالک تھے اور یہ اڈے مقدس آسمانی شہنشاہ جاپان ہیروہیتو کی حکومت کے زیر نگرانی تھے ان میں اکثر کو حکومت کو خود چلاتی تھی۔ صرف جاپان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اگر کوئی مرد ایسی عورت سے شادی کر لے جو سالہا سال تک سر بازار عامتہ الناس کی تسکین کرتی رہی ہو تو اس کے سماجی وقار اور قدر منزلت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہٹلر کے عہد حکومت میں جرمنی کی اخلاقی پستی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اہل جرمنی کی اخلاقی بے راہ روی اور فحاشی صدمہ انگیز تھی۔ بدمعاشی کے اڈوں کی باقاعدہ تنظیم اور بڑے بڑے اخباروں میں فحش جنسی اشتہارات کی اشاعت جرمنی کے عام اخلاقی گراوٹ کی آئینہ دار تھی۔ جاپان اور جرمنی کی اخلاقی پستی ہمارے لئے نا قابل برداشت ہے۔ اخلاقی اعتبار سے یہ ملک غلام داری کی طرف مائل ہیں بلکہ اس وقت سے بھی گئے گزرے

ہیں۔

جاپانی اخلاقیات کے بارے میں بے حد خرافات سننے میں آئی ہیں۔ جنگ بحرالکاہل کے دوران چند اتحادی افسروں نے نہایت سنجیدگی سے اطلاع دی تھی کہ جاپان کی جیشا گرلز، ناچنے والے دوشیزائیں، طوائفیں ہرگز نہیں بلکہ وہ شریف خاندانوں کی لڑکیاں ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں مختلف اداروں میں ملازمت کرنے والی لڑکیاں ہیں۔ عرصہ ہوا کہ جاپانی اخلاقیات کے بارے میں آر ہرتزے نے اپنی تصنیف ''یوشی دارا'' میں تفصیلی حقائق پیش کئے تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ جاپان میں عام چکلوں کو یوشی دارا کہتے ہیں۔ مختلف درجوں کے لحاظ سے ان کے مختلف نام ہیں۔ ان چکلوں کو عام طور پر حکومت چلاتی ہے یا پھر مندروں کے مہنت۔ یہ رسم صدیوں پرانی ہے اور اپنی موجودہ صورت میں قرون وسطیٰ کی رسم کی زندہ مثال ہے۔ اس رسم میں آج تک کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

حکومت جاپان ان اڈوں کے لئے کم سن لڑکیوں کو خریدتی ہے اور انہیں اپنے پیشے کی تعلیم دیتی ہے۔ دیوالیے اور فاقہ زدہ کسان عموماً اپنی لڑکیوں کو برضا و رغبت فروخت کر دیتے ہیں۔ لڑکیوں کو ان کے خدوخال اور عقل و فہم کے مطابق مختلف طبقوں کے مردوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ سب سے اعلیٰ حسین بچیوں کو خاص توجہ سے تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں لکھنا پڑھنا، شعر و شاعری، موسیقی و رقص اور آداب محفل خاص طور سے سکھائے جاتے ہیں۔ پڑھائی بیسوا کے کوٹھے میں ہوتی ہے اور عموماً سب سے بوڑھی طوائف استانی کے فرائض سرانجام دیتی ہے لیکن کم سن لڑکیوں کو چودہ سال کے سن سے پہلے عملاً پیشہ شروع کرنے کی قانوناً ممانعت ہے۔ ایک اور قانون کے مطابق طوائف کو صرف اس صورت میں چکلہ چھوڑنے کی اجازت ہے جب کوئی مرد اسے اپنی بیوی بنانے کے لئے خریدے۔ اس مقصد کے لئے ہر شخص کسی طوائف کو خرید سکتا ہے۔ جاپانی زبان میں کسی کا ہم معنی کوئی لفظ نہیں۔ اس کے برعکس پیشہ ور عورت کو ''وقتی بیوی'' یا ''ایک گھنٹے کی بیوی'' کہا جاتا ہے۔ پیشہ ور عورت کو ''دلدل کے کنول'' سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

ٹوکیو کے جدید شہر کا یوشی دار یا ہیرا منڈی درحقیقت ''دل کا نیستان'' ہے شاعر لوگ اسے ''وادی مسرت'' کہتے ہیں۔ شہر کے اس حصے میں ایک پل کے ذریعے داخل ہوتے ہیں جو خندق نما گڑھوں پر سے گزرتا ہے اس بازار کے دروازے پر یہ کتبہ آویزاں ہے۔

''اک خواب بہاراں کہ گلیاں چیری کے پھولوں سے لبریز ہیں''۔

یوشی دارا کے قوانین میں 1876 میں ترمیم کر دی گئی اور بڑے بڑے چکلے کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔ نئی چکلہ کوٹھیاں جو امیروں اور فوجی افسروں کے لئے مخصوص ہیں اچھے خاصے محل ہیں۔ انہیں کے نقشے پر جاپان کے دوسرے شہروں میں چکلہ کوٹھیاں تعمیر کی گئی ہیں لیکن ٹوکیوں کی چکلہ کوٹھی دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ہزاروں نوجوان لڑکیاں زرق برق لباس پہن کر خوبصورت پردوں کے پیچھے بیٹھتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک فرنگی کے دماغ میں وکٹوریائی عہد کا ایک مشہور گیت..... ''سنہری پنجرے کی چڑیا'' تیرنے لگتا ہے۔ اعلےٰ ترین چکلوں میں حسین ترین ''پنجرے'' ہیں۔ حال ہی میں یہ فیشن چل نکلا ہے کہ اعلےٰ درجے کی چکلہ کوٹھیوں کے مالک اور راہگیروں کے سامنے لڑکیوں کی بجائے ان کی تصویروں کی نمائش کرتے ہیں۔ یوشی دارا کے اندر ہر گاہک کو کئی طرح کی رسومات ادا کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے پیش نظر بعض سادہ لوح فرنگی یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ یہ محل محض سماجی یا تفریحی ادارے ہیں۔ بہرحال ایک گھنٹے کی

بیوی'' کو حاصل کرنے کیلئے ایک سجے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر نامہ و پیام شروع کیا جاتا ہے۔ جہاں اعلیٰ چکلوں کے مالک ضرورت مند گاہکوں کو اپنے ''ہیروں'' کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے پاس اپنے مخصوص نشان امارت ہیں جو باہر محراب پر لٹکتے رہتے ہیں۔ تاہم سستے چکلے اس قسم کے تکلفات سے بری ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں عصمت فروشی کا نظام اس قدر گھٹیا اور غلیظ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کی مثال نہیں۔ جیشا گرل عموماً اوسط درجے کی صاحب عقل اور تربیت یافتہ لڑکی سے بلند تر طوائف ہوتی ہے۔ قصہ کوتاہ جاپان کے نظام بدکاری میں یونانی نظام کے خدوخال بھی ملتے ہیں اور قرون وسطیٰ کے نظام کے بھی۔

قرون وسطیٰ کے اختتام پر یورپ میں عصمت فروشی کے خلاف بے پناہ تحریک پیدا ہوئی اور اس رواج کو بداخلاقی کی علامت تصور کیا جانے لگا۔ بے شمار سائنس دانوں نے اس تبدیلی کے محرکات اور وجوہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں اس ذہنی انقلاب کا موجب مردوں کے دماغ میں پراسرار خیالات کی پیدائش، تعلیم کی ترقی مذہب، جنسی بیماریوں کی روک تھام کی ضرورت وغیرہ ہے لیکن اشتراکی سائنس دانوں نے اس تبدیلی کی تفتیش کی تو انہوں نے جو سبب دریافت کیا وہ دوسرے سائنس دانوں کے خیال سے مختلف بھی ہے اور حیران کن بھی۔ ان کے خیال میں محبت کے متعلق جدید تصور پیدا ہوا تو بدکاری کے خلاف سماجی احتجاج کا آغاز ہوا یعنی اس انقلاب کا محرک محبت کا نیا نظریہ ہے۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ سائنس کو ایک ایسے جذبے سے کیا واسطہ جو وہبی یا جبلی ہے؟ کیا مرد اور عورت ازل سے ایک دوسرے پر عاشق نہیں ہوتے آئے۔

اشتراکی سائنس دان جواب دیتے ہیں کہ آج ہم جس چیز کو ''محبت'' کہتے ہیں وہ انسانی زندگی کا ایک بالکل نیا عنصر ہے۔ سب سے زیادہ حیران کن ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے جدید اقتصادی نظام یعنی سرمایہ داری نے جاگیرداری نظام معیشت پر فتح پر کر دائمی محبت کا تصور پیدا کیا اور محبت کو ذلت کے گڑھے سے نکال کر قابل احترام درجہ عطا کیا۔ اس نے محبت کو ایک ایسا اخلاقی رشتہ بنا دیا جو بدکاری کا مزاحم ہے۔

جن طریقوں سے اشتراکی حکومتوں نے بدکاری پر فتح پائی۔ ان کو سمجھنے کے لئے مذکورہ بالا غیر معمولی نتیجے کا ادراک ضروری ہے۔ اشتراکی سائنس دانوں کی معلومات اتنی مشکل نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکیں۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بربریت ہی کے عہد میں صرف ایک عورت سے شادی کرنے کی رسم پیدا ہو چکی تھی۔ قدیم تہذیب کا آغاز ہوا تو اس نظام شادی میں ایک خاص تبدیلی پیدا ہوئی۔ تاریخ انسانی کے اشتراکی ماہرین بھی اس بات پر دوسرے تاریخ دانوں سے متفق ہیں کہ دنیا میں جہاں کہیں یک زوجیت پیدا ہوئی، وہاں عصمت فروشی بھی پہلو جاری رہی۔ بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ یونانی اور رومی تہذیبوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی عورت پر کفایت کرنے کا محرک ایک خاص اقتصادی مقصد تھا۔ قانون نے یک زوجیت کو اسی لئے مسلمہ قرار دے دیا کہ شوہر کی جمع کی ہوئی تمام پونجی اس کی وفات کے بعد چند وارثوں میں آسانی سے تقسیم کی جا سکے اور خاص طور سے ان بچوں میں تقسیم کی جائے جو اس کی جائز بیوی کے پیٹ سے ہوں۔ اس اقدام کا اصل مقصد حرام کی اولاد کو حق وراثت سے محروم کرنا تھا۔ تاکہ دولت محض اعلےٰ طبقوں کے ہاتھوں میں جمع رہے۔ ہمارے خیال کے برعکس یک زوجیت ایک مرد کے ایک ہی عورت سے عشق کے جذبے پر مبنی نہ تھی۔ یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یونان وروم کے مہذب وموقر مرد اپنی معشوقاؤں سے شادی کرنے کی آرزو تک نہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس وہ

فیشن کے طور پر ایسی نا قابل شادی عورتوں سے محبت کرتے تھے جو ان کی ہم مذاق ہوتی تھیں۔

قدیم دنیا کے مردوں کے لئے شادی ایک قانون ضرورت تھی۔ اس کی بدولت وہ جائیداد اور دولت حاصل کرتے تھے، جسے وہ اپنی جائز بیویوں کی اولاد کے نام منتقل کرتے تھے لیکن غریب مرد کے نزدیک شادی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اسے ایک خادمہ اور بچے پالنے والی عورت مل جاتی تھی۔ البتہ تمام مرد اپنی خواہش کی تسکین غیر عورتوں سے کرنے کی خواہش کیا کرتے تھے یہ رواج عین اخلاق سمجھا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی شادی سے صرف عورتوں پر پابندی تھی۔ مرد کو قانونی اور اخلاقی طور پر اپنی منکوحہ عورت کے علاوہ مال خرچ کر کے ہر عورت سے مباشرت کرنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن عورت پر پابندی تھی۔ زنا کار عورت کے لئے سخت ترین سزا کا حکم تھا۔ منکوحہ عورت کا اپنے جائز شوہر کے علاوہ دوسرے مرد سے تعلق قائم کرنا بداخلاقی تھی، کیونکہ اس طرح خاوند کی جائداد حرام کی اولاد کے ہاتھوں میں چلے جانے کا خطرہ تھا اور حرام کی اولاد حق وراثت سے قانوناً محروم تھی۔ تاہم مرد کے لئے زنا کاری اخلاقاً جائز تھی۔ چارلس بہادر یا شہنشاہ سگمنڈ ہیرا منڈی میں ہفتوں گزار سکتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ یونان کے شاعر سیس جیسے لوگ شاہدان بازاری کی محبت کے نغمے کھلم کھلا گاتے تھے۔ ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ صدمہ انگیز بات یہ ہے کہ زمانہ قدیم اور قرون وسطیٰ میں عصمت فروشی کوئی گناہ نہ تھا۔ اس کے برعکس اسے سماج کے لئے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے عیسائیت نے بھی اسی قسم کے اخلاقی نظام کو اپنایا، جس کی بنیاد ملکیت کے قانونی رشتوں پر تھی۔ اس قسم کی قانونی وراثت کی سب سے ترقی یافتہ صورت بادشاہوں کا آسانی حق تھا۔ گویا رفتہ رفتہ زمین اور دولت کے حق وراثت میں اعلیٰ سیاسی اقتدار کا حق بھی شامل کر لیا گیا اور آخر کار جاگیرداری نظام کا تمام سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ سخت قسم کی وراثت پر کھڑا کیا گیا۔ بادشاہ تخت تاج کا مالک اور اس کا جائز فرزند شہزادہ ہوتا تھا۔ ڈیوک یا نواب اپنی جاگیر اپنے جائز فرزند کے نام منتقل کرتا تھا۔ جرنیل کی اولاد ہی جرنیل کہلا سکتی تھی اور پسماندہ زرعی غلام ہمیشہ کے لئے اپنے باپ کے جھونپڑے سے بندھا رہتا تھا۔ قرون وسطیٰ کے صنعتی دست کار بھی شادی اور وراثت کی پابندی حسداً کرتے تھے۔ ہم پیشہ ماہر دستکار اپنی اپنی تنظیمیں بناتے تھے، جنہیں گلڈز کہتے تھے اور وہ اپنا ہنر اپنی اولاد کے سوا دوسروں کو نہ سکھاتے تھے۔ نہ صرف اپنی برادری اور طبقے سے باہر شادی کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ محبت کی شادی بھی منع تھی۔ ہر لڑکی کی شادی کا بندوبست اس کے اپنے طبقے میں پیشہ ور دلالوں کو ذریعے کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات بادشاہ وقت بھی دلالی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ عورت کی ذاتی پسند کا خیال شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ اس کی رضا ایک رسمی سی بات تھی۔ اکثر اوقات لڑکی اپنے خاوند کی شکل پہلی مرتبہ نکاح کے دن ہی دیکھتی تھی۔

لہٰذا اس زمانے میں وہ اہم انسانی جذبہ جسے محبت کہتے ہیں قانونی اعتبار سے مسلمہ نہ تھا

نکاح کے وقت ہر لڑکی کو تاکید کی جاتی تھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے مرد واحد یعنی اپنے خاوند کی وفادار رہے۔ قانون اور مذہب اس کی وفاداری کے ضامن ٹھہرتے تھے۔ اگرچہ لوگ جانتے تھے کہ عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کی محبت میں گرفتار ہو سکتی ہے لیکن وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ ادھر اس کے ہرجائی خاوند کے آوارہ جذبات کی تسکین کے لئے عورتیں فوج در فوج موجود تھیں۔

اس کے باوجود قرون وسطیٰ میں عورت کی محبت، وفاداری اور شرافت کا گہرا احساس پیدا ہوا۔ شاعروں اور داستان سراؤں نے عورت کی پاک محبت کی نغمہ سرائی شروع کر دی اور عشق بازی یا شولری پیدا ہوئی۔ اس کے بارے میں وکٹوریائی ادب میں جو کچھ بتایا جاتا ہے اس سے وہ بالکل مختلف شے تھی۔ اس کا مطلب سنگ دل مردوں کے ظلم سے مقدس نسوانیت کا دلیرانہ تحفظ نہ تھا بلکہ وہ جبر کی شادی کے خلاف عورت کی حقیقی اور رومانی محبت کا اظہار تھی۔ صاف لفظوں میں مرد کا اس عورت سے محبت کرنا جو اسے دل سے چاہتی ہو، خواہ اس کی شادی ایک ایسے مرد سے کر دی گئی ہو جس سے وہ نفرت کرتی ہو۔ عشق بازی یا شولری ہے۔

محبت کے جدید نقطہ نظر کے پیشِ نظر ہمیں عشق بازی محض ہوس پرستی اور زنا کا بہانہ معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ پرلے درجے کی بداخلاقی تھی لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہم اسے اپنے سماجی معیار پر نہیں پرکھ سکتے۔ درحقیقت یہ ایک نئے اور طاقت ور اخلاق کی ابتدا تھی کیونکہ اس نے یہ سوال کیا کہ عورت کو اپنی جذباتی پسند کے آدمی سے محبت کرنے کا حق ہے نہ کہ ایک ایسے مرد سے جو اس پر ریاست یا کلیسا کی طرف سے مسلط کیا جائے۔

اس نئے رجحان نے ایک طرف عورت کے حق محبت کا پرچم بلند کیا اور دوسری طرف مردوں پر بھی خوشگوار اثر ڈالا۔ اس نے مردوں میں محبت کی روحانی قوت کا شعور پیدا کیا۔ اس نے اس قسم کی شادی کا عیارانہ پردہ چاک کر ڈالا جسے دوسرے طے کریں اور بدکاری کے تمام عیوب کو فاش کر دیا۔ شولوی ''بہادری'' تھی کیونکہ اس نے عورت کو محبت میں وہ بلند مقام عطا کیا جس کی وہ مستحق تھی۔ یہ عین اخلاق تھا۔ کیونکہ اس نے ثابت کر دیا کہ مرد بھی وفادار اور جانثار ہیں اور وہ عورت کی مخلص محبت کے قرون وسطیٰ کے زمانہ کی نئی اور عظیم دریافت یہ تھی کہ مرد و عورت ایک دوسرے کو چاہتے ہوں تو کسی دوسری جگہ قانونی شادی کے باوجود ایک دوسرے کے جذبات شوق کا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے ملنے کے لے بے تاب رہتے ہیں۔ مرد و عورت محبت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں تو وہ مرتے دم تک ایک دوسرے کے وفادار رہتے ہیں۔ ان کے لئے قانون و رواج کی زنجیروں کی ضرورت نہیں۔

شولری نے عورت کو قانونی اور جبری شادی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے ایک ایسے مرد سے نجات دلانے کی کوشش کی جسے اس نے خود اپنا ساتھی منتخب نہ کیا تھا۔ اس ریت نے اس کے ساتھ ہی مردوں کو غیر عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم کرنے کی لعنت سے چھڑایا اور یہ بات اس کی اخلاقی عظمت کی دلیل ہے۔

قرون وسطیٰ کی تمام شاعری محبت کے اس نئے نظریئے کی تعریف سے بھری پڑی ہے۔ ساتھ ہی اس زمانے کی تاریخ شاعروں و تشدد کے واقعات سے بھی بھرپور ہے۔ تاہم یہ نیا رجحان ایک نئے اخلاقی نظام کی حیثیت سے ابھر نہ سکا۔ صدیوں تک اس میں شہوت پرستی کی چاشنی رہی۔ لہٰذا کلیسائے وقت کو اس پر پورے غضب اور شور سے حملہ کرنے کا اخلاق موقع مل گیا تھا۔

لیکن اس رومانی محبت کی مخالفت کا اصل سبب کچھ اور تھا۔ اقتصادی محرکات سرمایہ داری اور اس کا جمہور دوست فلسفہ جاگیرداری نظام پر کاری ضرب لگا رہا تھا۔ جاگیرداری کی اخلاقی اور قانونی پشت پناہ، دوسروں کی طے کردہ شادی، وراثت کا سخت رواج اور بدکاری تھی۔ رومانی محبت نے جاگیردارانہ سماج کی جڑوں پر ایک مزید ضرب لگانے کی کوشش کی۔ لہٰذا جو شاعر رومانی محبت کے گیت گانے کی جرأت کرتے

تھے انہیں ہر وقت اپنی زبان کے کٹ جانے، شکنجے میں کس دیئے جانے یا سر بازار پھانسی کے تخت پر لٹکا دیئے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔

تاہم نئی اخلاقی محبت کو پوری طرح کچلا نہ جا سکا اور ایک وقت ایسا آیا کہ شیکسپیئر اس مسئلے کو لندن میں کھلے اسٹیج پر پیش کرنے لگا۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی ناقد ایسا نہیں کہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''رومیو اینڈ جیولٹ'' اپنے وقت کا ایک سیاسی ڈرامہ تھا اور اس کی اثر انگیزی بے پناہ تھی۔ اس کا موضوع اب متروک ہے۔ لیکن عہد حاضر کے شائقین کے لئے ایک ایسا عظیم المیہ ہے جس رومانی اور اخلاقی محبت کے سوال کو آزادانہ پیش کرتا ہے اور اپنے معشوق سے شادی کے حق انسانی کا پرچم بلند کرتا ہے۔ شیکسپیئر نے بے مثال فن کاری سے ثابت کیا کہ عاشق اپنے معشوق کی خاطر جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ شاعر اس سے پہلے بھی شاہدان بازاری یا دوسرے کی بیوی سے مرد کی آزاد محبت کے ترانے گا چکے تھے۔ لیکن ''رومیو اینڈ جیولیٹ'' میں نئی بات یہ تھی کہ اس نے حاضرین کو دو ایسے کشتگان محبت پر خون کے آنسو رلائے۔ جنہیں آپس میں شادی کرنے کے حق سے جبراً اور تادم مرگ محروم رکھا گیا۔

آج ہم اس حق کو بلا چوں و چرا تسلیم کرتے ہیں۔ اشتراکی تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ محبت کی شادی کا حق اپنے زمانے میں ایک انقلابی نظریہ تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قرون وسطیٰ میں شادی ایک سیاسی معاہدہ رہی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ جاگیردار اور نواب غلاموں اور شہزادوں کے مقابلہ میں اپنی طاقت مجتمع کر لیں۔ محل میں محبوس شہزادی سے لے کر کھیت سے پابستہ غلام لڑکی تک اس مقصد کا بے بس آلہ تھی۔

غرضیکہ قرون وسطیٰ کا اخلاقی نظام ایک طرف مردوں کے لئے کھلی زنا کاری کو ضروری قرار دیتا تھا اور دوسری طرف جبری شادی کی شکار معصوم عورت کو محبت جتانے کے خیال تک سے بھی منع کرتا تھا۔

اخلاقیات کے اشتراکی ماہرین نے ایک اور حیران کن نتیجہ نکالا۔ وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داری، جاگیرداری پر مکمل فتح حاصل کر چکی تو اس کے بعد کہیں محبت کی شادی کا امکان پیدا ہوا۔ جس چیز کو ہم آزاد تجارت کہتے ہیں اس نے اخلاقیات پر دیرپا اثر چھوڑا۔ جمہوریت کے نظریئے نے سب سے پہلی مرتبہ شخصی آزادی کے سوال کو ایک بنیادی اور اخلاقی اصول کی حیثیت سے پیش کیا اور کہا کہ تمام انسانوں کو ہر قسم کے عمل کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ ہر انسان اپنی پسند کا لباس پہنے، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرے اور اس پر ذات پات اور اونچ نیچ کی پابندی نہ ہو۔ اس کی سماجی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو وہ آزادی سے روپیہ کما سکے اور جہاں جی چاہے جا کر آباد ہو جائے۔ یہ خیالات اپنے زمانے میں انقلابی تھے۔ ان اصولوں کے زیر اثر عیسائیت میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ تاہم ایسے علمائے دین کی کمی نہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں آزادی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کسی انسان کو ایسا فعل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جس کے بارے میں اس کا ضمیر گواہی دے کہ وہ کام خدا کی نظروں میں برا ہے۔ لیکن قرون وسطیٰ میں ایسا خیال یقیناً کفر و الحاد تھا۔ جاگیرداری کلیسا اس قسم کے آزاد خیالات کے سراسر مخالف تھے کیونکہ ان دونوں کی بنیاد پیدائش سے موت تک ہمہ گیر خیر پر تھی۔ جونہی پرانے نظام کو زوال آیا قانون، مذہب اور اخلاق میں بنیادی تبدیلیاں آ گئیں۔

سب سے پہلے سرمایہ داری نے شادی کو ایک اخلاقی رشتہ بنایا اور اسی سلسلے میں ہر قسم کے جبر کا خاتمہ کیا۔ اس سے پہلے شادی ایک کھلا سودا تھی جس کو بزرگ طے کرتے تھے اور اجنبی روحوں کو زنجیروں میں جکڑ دیتے تھے۔ جمہوریت کے نظریئے کے ساتھ یہ سوال بھی اٹھا کہ سماج میں تمام کاروباری ٹھیکے یا

سمجھوتے طرفین کی رضامندی سے طے پاتے ہیں تو دو انسانوں کو اپنی رضامندی اور آزادی سے شادی کرنے کی اجازت کیوں نہ ملنا چاہیئے ۔ یہ سمجھوتہ تو سب سے زیادہ مقدس ہے۔ اس میں دو جسم اور دو جانیں عمر بھر کے لئے قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں۔ اس لئے لوگوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ محبت کی شادی کریں اور ہر وہ شادی خلاف اخلاق ہے جس کی بنیاد باہمی محبت پر نہ ہو۔

ہمیں یہ اقدام دلیرانہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمیں ایسے مرد یا عورت سے نفرت یا ہمدردی کرانا سکھایا گیا ہے جو کسی مصلحت کی بنا پر مخالف صنف سے محبت کے بغیر شادی کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آسانی سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جمہوری اخلاقیات کی بنیادی اہمیت کیا ہے اور یہ قدیم اخلاقیات سے کتنا متضاد ہے۔

اشتراکی محققین اس اخلاقی انقلاب کی توجیہہ یوں کرتے ہیں کہ سرمایہ داری جمہوریت نے جنسی تعلقات میں جو دوررس اصلاح کی اس سے شادی کے نظام میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی البتہ عورت کی سماجی حیثیت میں ضرور انقلاب آیا۔ عورت کے اس حق کو قانونی اور اخلاقی اعتبار سے جائز سمجھ لیا گیا کہ وہ محبت کرنے پر بھی عزت واحترام کے قابل ہے۔

ہمارے ہاں کے اخلاق پرستوں نے ہمیں آج تک اس تاریخی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا بلکہ اس میں بھی شبہ کی گنجائش ہے کہ ان میں سے اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت ہے بھی لیکن اشتراکی محققین نے اس تحقیق کو اتنا اہم جانا کہ انہوں نے اخلاقی نظام کا ڈھانچہ ہی اسی بنیاد پر کھڑا کیا۔ کیوں؟

اس لئے کہ اولاً اس تحقیق سے اس مسلمہ فریب کی قلعی کھل گئی کہ محبت شادی اور اخلاق آغاز تہذیب سے لے کر آج تک کم وبیش غیر متبدل رہے ہیں لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ نہ صرف اخلاق بدلے ہیں بلکہ ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا کہ سرمایہ داری اور جمہوریت کے عروج کے وقت جو اخلاقی اقدار پیدا ہوئیں وہ پرانے اخلاقی اقدار کی ضد ہیں۔

جاگیرداری کے زمانہ میں محبت یا پسند کی شادی کا خیال تک گناہ تھا۔ ہمارے نظریئے کے مطابق محبت کے سوا کسی اور وجہ سے شادی کا خیال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ جاگیرداری عہد میں بڑے بڑے راہنما بدکاری کے اڈوں کی کھلے بندوں سرپرستی اور تحسین وتوصیف کرتے تھے اور اس بات کو شیطانی فعل تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اس پر نہ سماج نکتہ چینی کرتا تھا نہ کلیسا۔ لیکن جمہوریت کے استحکام کے ساتھ ہی منظّم بدکاری سماجی اعتبار سے ناقابل برداشت ہوگئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس قدر تبدیلی محبت، جنس اخلاق اور گناہ کے نظریات اور ان سے متعلق انسانی عمل میں پیدا ہوتی ہے کسی اور شعبے میں نمودار نہیں ہوئی۔

تاریخی تحقیقات سے دوسرا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اخلاقیات کو کسی معیار سے بھی جانچیں ان میں بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ اس بات پر ایک مادہ پرست سائنس دان اور ایک پادری دونوں متفق ہیں۔ لیکن دونوں کے دلائل مختلف ہوں گے۔ اخلاقی ترقی کا سبب بیان کرتے وقت سائنس دان کی نظر میں انقلاب فرانس سے پہلے کے یورپ میں آتشک کی عام وبا سے پیدا شدہ صورت حال ہوگی تو پادری کے ذہن میں عورتوں کی وہ فوجیں ہوں گی جو قرون وسطےٰ میں زندگی بھر عصمت فروشی پر مجبور تھیں۔ بہرحال آج انسانیت ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ با اخلاق ہے۔

ہمارا تیسرا اور آخری نتیجہ عورتوں کی موجودہ حیثیت سے متعلق ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ سب سے

پہلے سرمایہ داری دور میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی مرد سے کسی عورت کو محبت کرنے پر بھی عورت کی ذات قابل احترام ہے اور اسے محبت کی شادی کا حق حاصل ہے لیکن اشتراکی ماہرین نے عوت کے اس حق کا تجزیہ کیا تو انہیں اس کی خامیاں بھی فوراً معلوم ہوگئیں۔ عورت کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا حق قانونی ڈگریوں کے ذریعے نہیں مل سکتا۔ قانونی اعتبار سے جب تک کوئی عورت آزادی سے اپنی رضا کا اظہار نہ کرے اسے شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور بس۔ آج کل تقریباً تمام مہذب ملکوں میں ایسے قانون موجود ہیں لیکن کوئی قانون اس امر کی ضمانت نہیں دیتا کہ عورت محض محبت کی بنا پر شادی کرنے کی مجاز ہے کیونکہ اس قسم کی آزادی کا تقاضا ہے کہ عورتیں سماجی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہوں اور مردوں کے برابر ہوں۔ کیا وہ ہیں؟

نومبر کے انقلاب کے بعد یہ حقیقت بہت آشکار ہوگئی کہ اشتراکی حکومت کے کاغذی اعلانوں میں تو عورتوں کو مساوات حاصل ہے لیکن وہ عملاً مردوں کے برابر نہیں۔ اس عدم مساوات کا ایک سبب تو ہمیں اپنے تجربے سے معلوم ہے آزادی محبت کے نئے رجحان کو 1920 کے لگ بھگ گورکی اور لینن نے بری طرح رد کیا تھا۔ اس برے رجحان کا مقصد یہ تھا کہ کہ ''پانی کے گلاسوں'' یعنی ''عورتوں کو پینے والوں'' یعنی مردوں کی طرح شہوت پرستی کی آزادی ہو جائے۔ ایسی آزادی دراصل ایک شیطانی فعل تھا۔ اگرچہ بعض روسی عورتوں نے جو جنسی اختلاط کی عملاً حامی تھیں۔ اپنے آپ کو نہایت ''انقلابی'' ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن ان پر زندگی کی ایک بنیادی اور عام حقیقت جلد ہی آشکارا ہوگئی۔

علم حیات کا یہ اصول تمام قوانین اور اخلاقیات پر بھاری ہے کہ عورت اور مرد جسمانی اعتبار سے برابر نہیں۔ اس لحاظ سے عورتوں کو مردوں پر فضلیت حاصل ہے مباشرت سے دونوں کا مقصد صرف وقتی تسکین ہوتا ہے۔ لیکن بچے کی پیدائش انسانی نسل کی بقا اور خاندان کا وجود ایسا افضل ترین فریضہ صرف عورتیں ہی ادا کر سکتی ہیں۔

اور معاشرہ اس فضیلت کو عملی زندگی میں کس طرح تسلیم کرتا ہے۔ مادریت پر سخت سزائیں عاید کر کے۔

عورت حاملہ ہو جائے تو اپنے کام کاج سے بھی جائے۔ بچے کی پیدائش کے وقت عورت کو جو جسمانی تکلیف ہوتی ہے اسے وہی جانتی ہے۔ معصوم بچوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے تو عورت۔ جس طرح آج ہمارے ملکوں میں دستور ہے اسی طرح بداخلاقی کے خاتمے سے پہلے روس میں بھی کوئی عورت ماں پن، یعنی اولاد کی پرورش کا بوجھ صرف اسی صورت میں ہلکا کر سکتی تھی، جب کہ وہ اپنے اوپر ایک مرد یعنی شوہر کا مکمل قبضہ تسلیم کرے۔ عورت شادی کر کے دوسرے کی دست نگر بن جاتی ہے، لیکن مرد اس پابندی سے آزاد ہے۔

لہٰذا ان حالات میں اصناف کی برابری کا دعویٰ خالی لفاظی ہے۔ تسلیم کہ جمہوریت اور سرمایہ داری نے عورت کو ایک ایسے مرد سے شادی کرنے کی مذموم پابندی سے نجات دلائی جس سے اسے کوئی محبت نہ ہو۔ یعنی عورت کو ایک ایسا خاوند قبول کرنے سے آزادی مل گئی جسے اس نے منتخب نہ کیا بلکہ جاگیردارانہ اصولوں کے مطابق دوسرے لوگوں نے چنا ہو لیکن عورتیں حق مادریت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں۔ تو ان میں سے اکثر کے راستے میں ہزاروں قسم کی سماجی اور معاشی رکاوٹیں تھیں۔ شادی کر کے اسے آزادی جیسی مقدس چیز کی قربانی کرنا پڑتی تھی۔ عورتوں کے تمام نجات دہندوں اور حامیوں کی سب کوششیں اس لئے

ناکام رہیں کہ ہمارے سماج میں عورت جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ان کی ہئیت اقتصادی ہے اور حیاتی حقائق کے فولاد سے گھڑی گئی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہٹلر کے عہد حکومت میں جرمنی کے اخلاق پرستوں نے جدید عورت کی پس ماندگی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ خود ہمارے ہاں کے رجعت پسند حضرات نازیوں کے اس نعرے میں بہت زیادہ کشش محسوس کرتے ہیں کہ ''عورتوں کو.....انہیں بچے عطا کر دو۔ کھانا پکانے کے آہنی چولہے دے دو اور کلیسا بخش دو''۔

ہٹلر کے اس گھسے پٹے جاگیردارانہ نصب العین کو قدیم مذہب کا درجہ عطا کرنے سے کافی عرصہ پہلے اشتراکی ماہرین سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد میں مکمل مساوات نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جدید دنیا میں بداخلاقی کا بنیادی سبب ہی عدم مساوات ہے۔

سوال نامہ

لیڈی اورلارڈ پاس فیلڈ نے اپنی مشہور کتاب ''سوویت اشتراکیت، ایک نئی تہذیب'' میں سوویت یونین کا مفصل حال بیان کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''لینن اور اس کے ساتھیوں نے روسی قوم کی اصلاح کا کام آدم کی بجائے حوا سے شروع کیا''۔ اس پر بھی اشتراکی رہنماؤں نے کبھی بڑ نہیں ماری کہ وہ صنف نازک کے نجات دلانے والے ہیں۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کو اسی قسم کے ادنےٰ حقوق تک محدود نہیں رکھا کہ عورتیں اونچی قمیض پہنیں چاہے نیچی۔ وہ لمبے بال رکھیں چاہیے یا چھوٹے یا وہ سرعام سگریٹ پی سکتی ہیں اور قانون کے آگے مردوں کے برابر ہیں انہوں نے جہاں عورتوں کے عام مردوں سے تعلقات کی مخالفت کی وہاں مردوں کے اس ''حق'' کی بھی مخالفت کی کہ وہ عام عورتوں سے جنسی تعلقات رکھ سکتے ہیں خاص بات یہ ہے کہ سوویت یونین میں عورتوں کی آزادی کا پروگرام صرف عورت کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنایا گیا بلکہ عام انسانیت کی بھلائی کے لئے تیار کیا گیا۔

اشتراکی سائنس اس نتیجے پر پہنچی انسانی کی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مرد اور عورت کے درمیان مساوات قائم نہیں ہو جاتی۔ انہوں نے بداخلاقی اور حرام کاری پر حملہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ انسانیت ناقابل تقسیم ہے اور کسی ایک طبقے کی اصلاح الگ سے ممکن نہیں۔

سوویت یونین سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آج سے پچیس سال پہلے لینن نے اعلان کیا تھا کہ عورتوں کا مسئلہ انہیں عدم مساوات کی ذلت سے چھڑانے تک محدود نہیں بلکہ ان اہم مسئلوں میں سے ایک ہے جن سے آج تک کی دنیا دوچار ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوویت یونین کے وسیع علاقے میں سب سے پہلے اسلامی ریاستوں میں اصلاح کا کام شروع کیا گیا اور دوسرے سیاسی فریضوں پر عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کو ترجیح دی گئی۔

اس سلسلہ میں جو عملی اقدام اٹھائے گئے وہ ایک مدت سے سوویت یونین کے قانون میں شامل ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے۔

1- عورتوں کو رائے دینے اور تمام سرکاری اداروں کے لئے منتخب ہونے کا حق دیا گیا۔ اکثر مہذب ملک اس حق کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن عملاً اسے نظرانداز کر جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں عورتیں رائے دے سکتی ہیں، لیکن تمام قانون مرد ہی بناتے ہیں اور وہی ان پر عمل درآمد کراتے ہیں۔

2- تمام قانونی فرائض اور شہری حقوق عورتوں اور مردوں میں برابر تقسیم کئے گئے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ عورت اور مرد کو عدالت کے سامنے برابر کی ذمہ داریاں اور حقوق دیئے گئے۔

3- ہر ایسے شخص کے لئے سخت سزائیں مقرر کی گئیں جو عورت کو کسی طرح اس کی مرضی کے خلاف شادی کرنے پر مجبور کرے۔ اس سزا سے والدین کو بھی بری نہ کیا گیا۔ اس قانون میں اس کے سوا کوئی خاص انقلابی بات نہ تھی کہ اس پر سختی سے عمل دارآمد کرایا گیا۔ ہمارے ہاں ہولناک قسم کے جسمانی تشدد کی صورت میں ہی ایسے قوانین کا سہارا لیا جاتا ہے۔

4- عورت کی مکمل معاشی آزادی کے تحفظ کے لئے بیسیوں کے لئے قوانین بنائے گئے اور احکام جاری کئے گئے۔

ہمارے ملکوں میں بیاہی ہوئی یا کنواری عورتوں کے حق ملازمت کے تحفظ کے لئے شاید ہی کوئی قانون بنایا گیا ہوگا۔ لیکن سوویت یونین میں عورتوں کو ملازمت کی ضمانت حاصل ہے جس کا تحفظ قانون کرتا ہے۔ بظاہر یہ امتیاز مصنوعی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم نے کم از کم جنگ کے دوران میں تو دیکھا ہے کہ عورتوں کے لئے ہر کہیں ملازمت موجود تھی لیکن یہ صورت حال مردوں کی انتہائی قلت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور سال ہی میں عورتوں کو گھر واپس بلانے کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ اس تحریک کا محرک یہ خدشہ ہے کہ جنگ کے بعد کے زمانے میں تمام مردوں کے لئے کام مہیا نہیں کیا جا سکے گا اور ہمارے ہاں یہ اصول مسلمہ ہے کہ کام کی قلت کے دنوں میں مردوں کو عورتوں پر ترجیح دی جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے ٹریڈ یونین اس جدوجہد میں تو کامیابی حاصل کر چکے ہیں کہ محنت کش عورتوں کو ایک جیسے کام کا مساوی معاوضہ ملنا چاہیئے لیکن صنعتی اداروں میں بچہ گھروں کے قیام کے مطالبے کے فوری ضرورت کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی تا کہ ان میں محنت کش مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ سکیں اور بے فکری سے اپنا کام کر سکیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ عورتیں کارخانوں سے دور ہی رہیں۔

سوویت یونین کی عورتوں کی موجودہ نسل ملازمت کے بارے میں بالکل مختلف نظریہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مردوں کے بالکل برابر سمجھتی ہیں۔ اشتراکی ملکوں میں مرد اور عورت کو ملازمت کا حق دینے کی محرک معاشی ضرورت سے زیادہ اخلاقی اہمیت تھی۔ اشتراکی سائنس دان اور سیاست دان جانتے تھے کہ عورت کی آزادی کی تمام باتیں اس وقت تک فضول اور بے کار ہیں جب تک ان پر معاشی پابندیاں عائد ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں یہ احساس بھی تھا کہ عورتوں کو معاشی مساوات کا درجہ ''قلم کے ایک جھٹکے'' یا ''قانون کے نفاذ'' سے حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ بدکاری کے تمام مسائل ابھی جوں کے توں باقی تھے۔

اشتراکی انقلاب کے چار سال بعد 1921 میں دیکھا گیا کہ قوم میں بدکاری پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ صورت حال اس عام بحران کا نتیجہ تھی جو غیر ملکی حملہ آور فوجوں کے خلاف طویل جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت باقاعدہ منصوبہ بندی پر عمل نہ ہوسکتا تھا۔ بے روزگاری بہت بڑھ گئی تھی۔ بے کاروں میں دو تہائی تعداد عورتوں کی تھی۔ ملک جنگ سے تباہ حال تھا اور خاص طور سے عورتوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

دو سال تک حرام کاری بتدریج بڑھتی گئی۔

اشتراکی سائنس دان 1923 میں اس قابل ہو گئے کہ بدکاری کے خلاف عام مہم کا آغاز کر سکیں۔ انہوں نے حرام کاری پر پہلا وار کیا تو ملک میں سنسنی پھیل گئی۔ اس قسم کی کوشش آج تک کہیں نہ کی گئی تھی۔

اس مہم کا آغاز ایک مطبوعہ سوال نامے سے کیا گیا۔ یہ سوال نامہ ہمارے ہاں کے گیلپ پول کی طرح نہ تھا۔ بلکہ اسے خفیہ طور سے کئی ہزار عورتوں اور لڑکیوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ سوالات دونوں صنفوں سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں ماہر نفسیات، ٹریڈ یونین رہنماؤں اور دوسرے ماہرین نے تیار کئے تھے۔

ان سوالات کو تمام تر دہرانا یہاں ممکن نہیں۔ ان سب کا واحد اور غیر معمولی مقصد یہ تھا کہ ان حالات کا پتہ لگایا جائے جن کے تحت عورت اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔

اپنے طرز کا یہ پہلا تجربہ تھا کہ مقصد کے پیش نظر کیا گیا کہ عورتیں زنا کار کیوں بن جاتی ہیں۔ مرد اس دلچسپ سوال کو سینکڑوں سال سے اٹھاتے آئے تھے۔ اس مسئلے سے متعلقہ ادب مشہور پیشہ ور عورتوں کو سنسنی ''خیز اعترافات'' سے بھرپور ہے اور زیادہ تر ایسے رنگین اور مفصل بیانات پر مشتمل ہے جو بالکل اعتماد کے قابل نہیں۔ علم طب اور نفسیات کے ماہرین نے گناہ کے نظریوں کے متعلق مسلسل قیاس آرائیاں کی تھیں۔ لیکن سوویت یونین میں اس اہم سوال کا جواب چند بد اخلاق نوجوانوں سے سوال و جواب کے ذریعے یا ان کے نفسیاتی تجزیئے سے حاصل نہیں کیا گیا بلکہ ایسی بے شمار عورتوں سے بلا واسطہ سوال کئے گئے جو ہر عمر، ذات اور سماجی حیثیت سے تعلق رکھتی تھیں۔ تمام جواب تحریری تھے اور پوری طرح خفیہ رکھے گئے تھے۔

اس عجیب و غریب سوال نامے سے قدیم مسلمہ اعتقادات کا بھرم کھل گیا چونکہ عورتوں کو پوری طرح یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی رائے بالکل پوشیدہ رکھی جائے گی اس سوال کا جواب جس آزادی سے دیا گیا اس پر خود اشترا کی رہنما حیران رہ گئے۔

اس رائے شماری سے جو چونکا دینے والا نتیجہ نکالا گیا وہ یہ تھا کہ پیشہ ور عورتوں اور عام عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ بیاہی ہوئی اور کنواری دونوں قسم کی عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے انکشاف کیا کہ وہ ایک نہ ایک وقت پر خاص حالات کے تحت زنا پر مجبور ہو چکی ہیں۔

بعض نے اطلاع دی کہ انہیں صرف ایک مرتبہ زنا کی تلخ تجربے سے گزرنا پڑا اور بعض نے بتایا کہ وہ کئی بار ایسا کر چکی ہیں۔ بعض نے تسلیم کیا کہ وہ زندگی میں کئی بار مختلف مدتوں کے لئے پیشے پر گذران کر چکی ہیں۔ تاہم وہ طوائف کا لیبل لگنے سے محفوظ رہی ہیں۔ بعض عورتیں اپنی دوسری ہمراز عورتیں کے تجربے کے پیش نظر یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ وہ اپنے آپ کو پیشہ ور کہیں یا نہ، جن عورتوں نے زنا کاری کا اعتراف کیا ان کی ایک بھاری اکثریت نے بیان کیا کہ ان کی جائز آمدنی بہت قلیل تھی اس لئے وہ بدکاری کے ذریعے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئیں تا کہ وہ خود اور ان کے بال بچے اچھی زندگی بسر کر سکیں۔

ہم آگے چل کر اس بے نظیر مشاہدات کو ذرا تفصیل سے بیان کریں گے چونکہ اشترا کی ماہرین کے اخذ کردہ نتیجے ان نتائج کی ضد تھے جو ہمارے ہاں کے سائنس دان یا ماہرین اخلاقیات نکالتے رہے ہیں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ دیر ٹھہر کر اس مشاہدے سے پہلے کی تحقیقات کا اجمالی تجزیہ کریں۔

طوائف کی اصلی تعریف کیا ہے؟

عام طور سے اس ترکیب کا اطلاق ایسی عورتوں پر کیا جاتا ہے جو روپے کے عوض اپنا جسم مختلف آدمیوں کے پاس بیچیں لیکن جس وقت سے جدید سماجی تحقیق پیدا ہوئی ہے۔ طوائف کی مذکورہ تعریف کو تسلی بخش نہیں مانا جاتا۔ تمام با اختیار حضرات متفق ہیں کہ جنسی بیماریوں کو جگہ جگہ پھیلانے والوں میں دو تہائی

تعداد ایسی لڑکیوں کی ہے جنہیں اصلی معنوں میں طوائف نہیں کہا جا سکتا۔ وکٹری گرلز تو شوقین پیشہ ور عورتوں کا ایک ہی طبقہ ہے۔ ہم اس مسئلے کی دوسری انتہا کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ماہرین نفسیات نے ایسے تمام جنسی تعلقات کو زناکاری کا نام دینے کی کوشش کی ہے جو دو ایسے افراد کے درمیان پائے جائیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو۔

لیکن یہاں بھی حقائق ہمیں عجیب الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ امریکی تحقیقات اور اشترا کی سوال نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی بڑی تعداد جس قلیل معاوضے پر اجنبی مردوں سے محبت کرنے پر رضا مند ہو جاتی ہے۔ اس کی قدر شام کی تفریح کے اخراجات سے کسی صورت بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ اخلاقی نقطہ نظر سے دو ایسی لڑکیوں میں کس طرح سے تمیز کی جا سکتی ہے، جن میں سے ایک اپنے کمرے کا کرایہ ادا کرنے کی ضرورت سے مجبور ہو کر چند ڈالروں پر محبت کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور دوسری محبت میں نقدی کے دخل کو بھیانک تصور کرنے کا بہانہ کرتی ہے۔ لیکن نہایت چالاکی سے ایک پر تکلف دعوت اور سینما کے تماشے کی صورت میں معاوضہ قبول کرتی ہے۔ ایسی دو لڑکیوں میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ غریب لڑکی ایماندار ہے، کیونکہ دونوں صورتوں میں محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں مذہبی نقطہ نظر یہ ہے کہ شادی کے بغیر ہر قسم کا جنسی تعلق بداخلاقی کی دلیل ہے خواہ اس کا محرک محبت ہو یا روپیہ یہاں تمہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ سوویت یونین میں بھی سالہا سال سے جنسی تعلقات کے بارے میں بعینہ یہی نقطہ نظر پایا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں کے پادری اور سوویت یونین کے کمیونسٹ رہنما اپنے اپنے اخلاقی نظریوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ نظریہ وہی سچا جو عمل میں درست ثابت ہو۔ جنگ کے دوران میں جن لوگوں کو روس جانے کا اتفاق ہوا انہیں یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ روس میں آج کل ایسی عورت ناپید ہے جو اپنے خاوند کے سوا کسی غیر آدمی سے کسی قسم کا قریبی تعلق قائم کرنے کا خیال تک گوارا کرے۔ انتہا یہ ہے کہ روس کی نوجوان نسل کئی سال سے باہم چہل بازی کو بھی برا خیال کرتی ہے اور ان کے فلم، اخبار اور اشتہار تک کسی قسم کے جنسی اشارے سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے جمہوریتوں اور اشترا کی جمہوریتوں میں جو فرق ہے وہ نہایت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔

آیئے ہم اس فرق اور تضاد کو مکمل کر دیں۔ اس سے انکار نہیں کہ اکثر لوگ شادی کو ایک مقدس سماجی رواج تصور کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ابدی ہے اور اس طریقے سے جنسی تعلقات جائز ہیں۔ خواہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے مسلسل محبت کرتے رہیں یا نہ۔ بلکہ اکثر مذہبوں میں تو محبت کے ختم ہو جانے پر بھی شادی برقرار رہتی ہے۔ ہر باشعور عورت نصف درجن کے قریب سہیلیوں کے نام گنا سکتی ہے جو محض اس لئے شادی میں بندھی رہتی ہیں اور اپنے خاوند کی اطاعت کرنے پر مجبور رہتی ہیں کہ ان کے لئے کوئی راہ نجات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اور اس کے بچے معاشی اعتبار سے شوہر کے غلام ہیں۔ کیا ایسی رشتہ داری کی کوئی اخلاقی بنیاد ہے۔ جدید ماہرین نفسیات کے قریب اس قسم کی شادی عورت کے لئے بدکاری کے مترادف ہے کیونکہ اس کا نتیجہ کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا۔ سوویت یونین کے باشندے ایسی شادی کو انتہائی بداخلاقی اور بدکاری کی دلیل تصور کرتے ہیں۔

ذاتی عقائد کا احترام مسلم، شادی کے مسئلے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی اعلیٰ اخلاقی معیار کا تقاضا ہے کہ ایسے تمام افراد کے درمیان جنسی تعلقات ناجائز ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو اور

رایسے تمام طریقے قابل نفرت ہیں جن میں کسی نہ کسی صورت میں نقدی کا استعمال کرنا پڑے۔ ہم اسی موقف بداخلاقی کے خلاف جدوجہد کا تجزیہ کریں گے۔

جب تک سرمایہ دارانہ جمہوریت نے جاگیرداری نظام کا خاتمہ نہیں کر دیا اس وقت تک حرام کاری کے خلاف جدوجہد نام کو بھی نہ تھی۔ دراصل عصمت فروشی کے خلاف منظّم جدوجہد کا محرک اخلاق نہ تھا بلکہ جنسی بیماریوں کو روکنے کی ضرورت بھی تھی۔ یورپ میں آتشک کا مرض سولہویں صدی میں رونما ہوا۔ غالباً یہ مہلک بیماری ہیٹی سے یورپ میں آئی۔ امیریگو ویسپگی کی سوانح عمری گذشتہ صدی کے دوران میں چھپی۔ اس میں اس مرض کا ذکر ہے جسے ہم ''فرانس کی پیداوار'' کہتے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ مرض وہ ملاح امریکہ سے یورپ لائے جو کولمبس کے ساتھ واپس لوٹے۔ وہاں سے یہ بیماری طوائفوں میں پھیلی پھر سپین بھر میں پھیل گئی اور چارلس ہفتم کی فوج کے سپینی سپاہی اس بیماری کو اٹلی لے گئے۔ دوسرے تاریخ دان بھی شہادت دیتے ہیں کہ چارلس کی فوجوں نے 1845 میں آٹھ دن تک نیپلز کی فتح کی خوشی منائی تو اس کے بعد یہ مرض عام ہو گیا۔ ایک غیر مصدقہ حکایت میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ جو طوائفیں آتشک میں مبتلا تھیں۔ انہیں دشمن کے ایسے سپاہیوں میں جسمانی تباہی پھیلانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو اس وقت تک اسی آفت سے ناواقف ہوتے تھے۔

بہر حال اٹھارہویں صدی کے اواخر تک تمام سرکاری اور مذہبی لوگ اس نئی مصیبت پر چوکنے ہو گئے تھے اور جنہیں یہ ہولناک مرض لاحق ہو جاتا تھا انہیں مجرم گردانا جاتا تھا۔ شہنشاہ میکسی ملین نے ایک حکم نافذ کیا جس میں آتشک کو ''بولسٹی بلیٹرن'' یعنی ایک ایسی مصیبت کہا گیا جسے پہلے کسی نے دیکھا نہ سنا''۔ فوجوں نے اس ہولناک پلیگ کو فرانس اور جرمنی میں پھیلا دیا آتشک زدہ لوگوں کے ساتھ نہایت ہی وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ عورتوں کو جسمانی ایذا دی جاتی تھی اور انہیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ ہر بیمار مرد اور عورت کو کوڑھیوں کو طرح دھتکارا جاتا تھا۔ انہیں گھروں سے نکال دیا جاتا تھا اور شہروں اور قصبوں سے دور باہر رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چند سال کے عرصے میں یہ مرض تمام یورپ اور جزائر برطانیہ میں پھیل گیا۔

آئندہ صدی کے دوران میں جنسی بیماریوں کی مصیبت پر فوجی افسر خاص طور سے چوکنے ہو گئے۔ مسلح فوجوں کے ساتھ جو عورتیں ہوتی تھیں ان پر نت نئی پابندیاں لگائی جاتیں۔ 1515 میں فرانسس اول نے حکم دیا کہ تمام بیمار عورتیں سپاہیوں کے ساتھ پیدل چلیں۔ ان کو زین اور گھوڑے دے کر ان کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ 1580 میں بلجیم کے متقی بادشاہ البرٹ کو اس مرض کے خلاف طبی تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔ اور متاثر عورتوں کا فوجوں میں داخل سختی سے بند کر دیا گیا۔ تاہم اس وقت تک اس مرض کی تشخیص بہت ہی بھدی اور ناقابل اعتبار تھی۔ غالباً سب سے زیادہ خطرناک عورتوں کی کبھی شناخت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ البرٹ کی طرح شاہی احکام کی خلاف ورزی پر آئے سال سخت سزا دی جانے لگی۔ قانون کی رو سے آتشک کے مریض مجرم تھے۔ اخلاقی لحاظ سے انہیں کھلا گناہ گار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ رویہ محض وسواس پر مبنی تھا کیونکہ مہذب اور عالی وقار خاندانوں کے بہت سے مرد اور عورتیں بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔ سزا صرف ان بدنصیبوں کی دی جاتی تھی جو روپے اور سماجی وقار سے اپنا تحفظ کرنے کے ناقابل تھے۔ پولیس سینکڑوں سال تک مرض اور مریضوں کی صفائی کے لئے وقتاً فوقتاً منظّم حملے کرتی رہی۔ جلادوں کو حکم دے دیا جاتا تھا کہ طوائف کی ناک کاٹ دی جائے اور بعض اوقات ناک کے ساتھ کان بھی کٹوا دیئے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شرابی سپاہیوں کی قطاریں کھڑیں کر دی جاتیں جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہوتے۔

طوائفوں کو ان کے درمیان دوڑنے کا حکم دیا جاتا اور سپاہی انہیں ڈنڈے مار مار کر ہلا کر دیتے تھے۔

بداخلاقی کے خلاف قدیم قوانین میں بادشاہ لوئیس کا آرڈی ننس مجریہ مارچ1769 سب سے زیادہ عدیم المثال ہے۔اس آرڈی ننس کے مطابق پیشہ ور عورتوں کو گرفتار کیا جاتا تھا اور انہیں تین مہینے تک صرف سوکھی روٹی اور پانی پر گذارہ کرنے کی سزا دی جاتی تھی اس کے بعد انہیں اس وقت تک قید میں رکھا جاتا جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کر لیتیں۔اس قید کی کوئی معیاد مقرر نہ تھی۔ یہ سزا مقابلتاً کم وحشیانہ تھی۔اس میں مزید رعایت یوں کی گئی کہ قید کے دوران میں زنا کار عورتوں کا بھی علاج کیا جاتا، جس کا تمام خرچ فوجی خزانے سے ادا کیا جاتا تھا۔ چونکہ ان دنوں ابھی آتشک کا کوئی موثر علاج دریافت نہیں ہوا تھا اس لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ بدنصیب عورتوں کو اس اقدام سے کیا فائدہ پہنچتا تھا۔اگر کوئی عورت کئی مرتبہ گرفتار کی جاتی تو اس کی قید میں پہلے کی نسبت زیادہ توسیع کر دی جاتی تھی لیکن لوئیس نے عورتوں کی جسمانی سزا اور انہیں سرعام رسوا کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔اس وقت کے کلیسیت زدہ حضرات خے خیال میں عورتوں کے ساتھ اس غیر معمولی ہمدردی کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ کے ہاں اکثر درباری عورتیں ہوتی تھیں جن کے دام میں خطاب یافتہ منصب دار پھنسے ہوئے ہوتے تھے۔

جنسی بیماریوں کی روک تھام کے لئے مزید جو کچھ کیا گیا، اس کی تفصیل انقلاب فرانس کے مشہور مہندس، کارنٹ کی رپورٹ میں موجود ہے۔کارنٹ نے1793 میں ڈوئی کے کیمپ میں تقریباً تین ہزار عورتیں دیکھیں۔اس نے آتشک کی بھیانک تباہی کا مشاہدہ کیا اور لکھا کہ اس مرض نے اس تعداد سے تقریباًدس گنا زیادہ مردوں کو مفلوج کر دیا، جتنے دشمن کی گولیوں سے ناکارہ ہوئے تھے۔طبی سفارشات پر عمل نہیں کیا جاتا تھا اور نپولین کے عہد حکومت میں عورتوں کو دوبارہ وحشیانہ سزائیں دی جانے لگیں تھیں۔ بوناپاٹ نے بدکار اور بیمار عورتوں کے خلاف بہت سے احکام جاری کئے۔ان احکام میں عام طور سے یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ بدکار عورتوں کے سروں کے بال کاٹ دیئے جائیں اور ان کا منہ کالا کر کے بازاروں میں پھرایا جائے تاکہ پبلک ان کا مذاق اڑائے اور لوگ عبرت پکڑیں۔تاہم اس اثنا میں علم طب میں تھوڑی بہت ترقی ضرور ہوئی اور بعض مقامات پر مقامی مجسٹریٹوں کو بیمار عورتوں کے لئے طبی مرکز کھولنا پڑے۔

1811 میں جرمن فوج کے راسٹوک ہیڈکوارٹر میں ایک طبی مشن مقرر کیا گیا۔ یہ سب سے پہلا کمیشن تھا جسے ایک مخصوص علاقے کی تمام عورتوں کا معائنہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔اس کمیشن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بیمار عورتوں کے والدین سے اخراجات وصول کرنے کا مجاز تھا یا وہ ان لوگوں سے بھی خرچ وصول کر سکتا تھا، جو پیشہ ور عورتوں کے لئے مکان کرائے پر لیتے تھے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد آتشک کی روک تھام کے لئے ریاست کی طرف سے باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں1835 میں جرمنی کی پولیس ایسے تمام اشخاص کی نگرانی کرتی تھی جن پر آتشک کے مریض ہونے کا شبہ ہو۔اس پر بھی کچھ نہ بنا تو کابینہ نے زیادہ موثر اقدام کیا۔اس نے حکم دیا کہ برلن کے تمام چکلے اٹھارہ مہینے کے اندر بند ہو جانے چاہئیں اور اکثر بند بھی ہو گئے۔لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ جو سپاہی برلن کے علاقہ میں مقیم تھے ان میں آتشک کا عارضہ تیزی سے پھیلنے لگا۔لہٰذا فوجی کمان افسر رینگل نے 1848 میں مجبوراً اپیل کی کہ چکلے دوبارہ کھول دیئے جائیں۔

اس کے بعد جرمنی اور براعظم یورپ کے دوسرے ملک کبھی اس انتہا کی طرف مائل ہو جاتے کبھی

اس انتہا کی طرف مائل۔ کبھی پیشہ ور عورتوں کو نکال باہر کیا جاتا اور چکلے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ کبھی پولیس کے مقرر کردہ ڈاکٹروں کی زیر نگرانی وہی اڈے پھر کھول دیئے جاتے۔

برطانیہ کا تجربہ خاص طور پر بصیرت افروز ہے۔ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جس میں باقی تمام ملکوں سے محسوس کیا گیا کہ آتشک کے خلاف زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس کا سبب برطانیہ کی روائتی قدامت پسندی نہیں ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ دولت مشترکہ کے طبی ماہرین یورپ کے تجربوں کا مشاہدہ کر چکے تھے اور انہیں ان تجربوں کی کامیابی پر بالکل یقین نہ تھا۔

تاہم جون 1866 میں بعض بحری اور فوجی سٹیشنوں پر چھوت کی بیماری کو زیادہ موثر طریقے سے روکنے کے لئے ایک قانون پاس کیا گیا، جسے عرف عام میں ''وبائی امراض'' کا قانون کہتے ہیں۔ اس قانون نے پولیس کے اختیار دے دیا کہ وہ مشکوک عورتوں کو ڈاکٹروں کے پاس جبری معائنے کے لئے لے جا سکتی ہے اور ضروری سمجھے تو انہیں علاج کے لئے ہسپتال میں داخل ہونے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس قانون کے پاس ہونے کے بعد سپاہیوں اور جہازیوں میں آتشک کی وبا گھٹ گئی۔ لیکن پارلیمان نے کسی واضح کے بغیر آٹھ سال کے بعد اس قانون کو منسوخ کر دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز سے عین پہلے مشہور انگریز ڈاکٹر سر ولیم آسلر نے چند مشہور طبی ماہرین کو ایک خط پر دستخط کرنے پر ابھارا اور اس خط کو وہ ''ٹائمز'' میں شائع کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس خط میں تنبیہ کی گئی تھی کہ آتشک کی بیماری پھیل رہی ہے۔ اس خط کو پڑھ کر برطانیہ کے لوگ سکتے میں آ گئے کیونکہ یہ پہلا خط تھا جو انگریزی بولنے والی دنیا میں اس بیماری کے متعلق شائع ہوا تھا اور جس میں نئی بیماری کو ٹھیک آتشک کا نام دیا گیا تھا۔ اس خط کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسکوتھ کی حکومت نے جنسی بیماریوں سے متعلق مشہور سڈن ہام رائل کمیشن مقرر کیا۔

اس کمیشن نے اپنی رپورٹ جنگ کے دوران میں پیش کی۔ اس نے آسلر کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ انگلستان کی کم از کم دس فیصد آبادی آتشک میں مبتلا ہے۔ اور اسے بھی زیادہ سوزاک کی مریض ہے۔ آتشک سے ہر سال تقریباً تریسٹھ ہزار انگریز ختم ہو رہے ہیں اور تپ دق اس سے بھی زیادہ اموات کا باعث ہے۔ آج بھی اس صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔

جنسی وبا سے متعلق نظریوں میں جس سست رفتاری سے ترقی ہوئی ہے اسے دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ابھی لوگ حال میں جنسی بیماریوں سے متعلق کچھ بھی جانتے تھے۔ جدید ماہرین خیال ہے کہ اس بیماری کے متعلق صحیح علم اس لئے دیر بعد ہوا کہ اس سلسلے میں ظاہری شرافت اور مذہب حائل رہا اور اس بیماری کو روکنے کے لئے سائنٹیفک اقدامات بہت دیر بعد کئے گئے۔ علاوہ ازیں وہ اوہام کو بھی اس کا موجب سمجھتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ علم طب کے سائنٹیفک بن جانے کے کافی عرصہ بعد تک جنسی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں سائنٹیفک علم پیدا نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسان کو مجامعت اور پیدائش کا صحیح علم ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔

یونانی تہذیب سے پہلے بچے کی پیدائش کو مافوق الطبیعاتی مظہر خیال کیا جاتا تھا لیکن یونانی فلسفیوں نے جن کی قوت مشاہدہ اور عقل کو رومانی تاریخ دانوں نے اسے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اس قیاس کو صرف اتنی ترقی دی کہ انہوں نے بچے کی پیدائش کا معجزہ خداؤں سے چھین کر ماں سے منسوب کر دیا۔

بقراط نے اپنی مشہور تصنیف ''انسان کی فطرت میں'' جو چار سال قبل از مسیح لکھی گئی، قیاس آرائی کی کہ بچے کی پیدائش زنانہ ومردانہ ''بیجوں'' پر منحصر ہے لیکن اس نے اس خیال کو ماہواری حیض کے ساتھ بری طرح گڈمڈ کر دیا۔ ارسطو نے اس خیال کو یہ ترقی دی کہ انسان کے جنسی افعال جانوروں کے افعال سے مشابہ ہیں۔ قرون وسطیٰ میں انسان کو دیگر مخلوقات سے محض روائتاً افضل شمار کیا جاتا تھا۔ اس خیال کی بنیاد کوئی سائنٹیفک علم نہ تھا۔

البتہ مغربی سائنس کے عروج سے بہت عرصہ پہلے اس سلسلے میں چینیوں نے بہت زیادہ ترقی کی تھی۔ انہوں نے اندازہ لگایا جاتا تھا کہ زنانہ اور مردانہ عناصر ہوتے ہیں جو الگ الگ حمل نہیں ٹھہرا سکتے۔ علاوہ ازیں چینی زبان میں ایسے لفظ موجود تھے جن کے معنی ''اووری'' یعنی انڈادانی اور ''منی'' کے ہوتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حیض کا حمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرون وسطیٰ کے زمانے میں انسان کو زندگی کے بنیادی حقائق کا قطعی علم نہ تھا۔ جنس کے متعلق سنجیدہ علم کی بجائے توہم اور جادوٹونے کا دور دورہ تھا۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ کسی کے ذہن میں کبھی خیال تک پیدا نہ ہوا تھا کہ بچے کی پیدائش کا علم قابل ادراک ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں لی یروین ہوک نے خوردبین ایجاد کی لیکن اس ایجاد کے سو سال بعد اس کے شاگرد ہام نے منی کے جراثیم دریافت کئے۔ انہی دنوں اس کے ساتھی گراف نے انڈادانی کے متعلق نئی معلومات مہیا کیں۔ اب حمل کی سچی کہانی تیار کرنے کا امکان پیدا ہو گیا لیکن سو سال یونہی گزر گئے اور اس کے بعد کہیں جا کر سپیلن زانی نے منی کے کیڑوں کو حرکت کرتے ہوئے دکھایا اور تقریباً ایک صدی اور گزر جانے کے بعد ہرٹ برگ اس قابل ہوا کہ منی کے کیڑے کو انڈادانی میں داخل ہوتے ہوئے دکھا سکے۔ لہٰذا تاریخ کے آغاز سے لے کر 1875 تک انسان کو حمل کی حقیقت کا کوئی علم نہ تھا۔

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہمیں 1875 کے بعد ہی علم ہوا کہ انسانی اور دوسری حیوانی زندگی کا آغاز کس طرح ہوتا ہے اور ہمیں اس حقیقت کی روشنی میں جنس سے متعلق انسانی علم کی پیچیدہ ترقی کا جائزہ لینا چاہیئے۔

اگر ہم جنسی بیماریوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہم جنسی عوامل کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارا تمام علم قیاسات، توہمات اور قصے کہانیوں کا مجموعہ تھا۔

حاصل کلام یہ کہ جنسی بیماریوں کے خلاف جدوجہد آج سے کوئی تین سو سال پیشتر شروع ہوئی اور یہ پہلے پہل بالکل غیر سائنسی تھی۔ جب ہم نے دیکھا کہ آتشک کا مرض اپنے دوسرے اور تیسرے درجے میں کس قدر خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کے علاج کے طریقے دریافت ہونے لگے جلد ہی طوائف سماجی بیماری کا سرچشمہ مانی جانے لگی لیکن بدمعاشی کے اڈے ہزاروں سال سے جائز سماجی اداروں کی حیثیت سے قائم تھے۔ اس لئے تجارتی عصمت فروشی کے خلاف رفتہ رفتہ ہی نفرت پیدا ہوئی۔ عصمت کی تجارت کی مخالفت ہوئی تو اس پر طبی حملہ کیا گیا اور اس کے بعد کلیسا اور قانون نے دھاوا بول دیا لیکن دو سال تک بدکاری کے خلاف جو جدوجہد جاری رہی وہ بالکل غیر منظم تھی اور غیر موثر ثابت ہوئی۔

بعد ازیں عصمت فروشی کو ''سرکاری طور پر تسلیم'' کرنے کا زمانہ آیا۔ خطرے کے مقامات کو دوسری آبادی سے الگ کیا گیا اور اس علاقے کو بظاہر طبی نگرانی میں رکھا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی تجارت کی وسیع ترقی نے جسے ہم بزنس کہتے ہیں بدکاری پر بھی گہرا اثر ڈالا اور نوجوان لڑکیوں کی تجارت شروع ہوئی

لڑکیوں کو باقاعدہ طور پر عصمت فروشی کے لئے بھرتی کیا جانے لگا اور تمام منافع چکلوں کے چودھریوں کی جیبوں میں جانے لگا۔ ایک وقت آیا کہ عصمت کی فروخت کو قانوناً منع کر دیا گیا۔ لیکن یہ دھندا چوری چھپے جاری رہا اور اس قدر نفع بخش ثابت ہوا کہ اسے ختم کرنا قانون کے بس کا روگ نہ رہا۔ نتیجۃً عصمت فروشی اور بدکاری کے خاتمے کی تحریک پیدا ہوئی۔ نئے قانون پاس کئے گئے۔ اکثر ملکوں میں حرام کاری کے خلاف جدوجہد کے لئے پولیس کے خاص محکمے کھولے گئے۔ ڈاکٹروں نے جنسی بیماریوں کے خلاف پرزور پراپیگنڈہ کیا اور کلیساؤں نے زبردست تبلیغ شروع کر دی۔ ان سب کوششوں کو مقصد بدی کو ختم کرنا تھا لیکن انسان کی جہالت نے اس نیک کام کو سرے نہ چڑھنے دیا۔ یہاں تک کہ 1938 تک سوزاک اور آتشک کا اخباروں اور رسالوں تک میں ذکر شرافت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد عصمت فروشی کی ممانعت کے تمام قانون اور بدکاری کے خاتمے کے پروگرام ڈھانچہ دھڑام سے نیچے آیا۔ تمام ملکوں میں بدکاری اور جنسی وبا زور پکڑ گئی۔ لہٰذا اس کے خلاف سائنٹیفک بنیادوں پر دوبارہ مہم چلانے کی کوشش کی گئی۔ سینکڑوں مریضوں کی داستانیں عبرت کے طور پر اخباروں اور رسالوں میں چھاپی گئیں اور بدکاری کے متعلق نام نہاد سائنسی مواد کا اتنا بڑا ڈھیر لگ گیا کہ انسانی اخلاق، محبت شادی اور خاندان کے تمام اہم سوال اس کے تلے دب گئے۔ نفسیاتی تجزیے سے کام لیا جانے لگا۔ اور گناہ سے متعلق جو نئے نظریئے پیدا ہوئے ان میں سے اکثر کو طبی حمایت بھی مل گئی۔ اس کے باوجود یہ ابدی سوال بدستور قائم رہا کہ عورتیں حرام کاری پر مجبور کیوں ہوتی ہیں۔

روس کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بدکاری کے عجیب وغریب وجوہ بیان کئے گئے ہیں، جن سے شاید آپ بھی آگاہ ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

1- طوائفیں فطرتاً بداخلاق ہوتی ہیں۔ اس لئے جب تک سائنٹیفک طریقے پر انسانی نسل کی پرورش شروع نہ ہو جائے یا مذہب کے ذریعے انسان کی اصلاح نہ کی جائے اس وقت تک بدکاری کے خلاف کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

2- چونکہ مرد جنسی زندگی میں ذائقے کی تبدیلی کو فطرتاً پسند کرتا ہے اس لئے زنا کا خاتمہ ناممکن ہے۔ بدکاری باقی رہے گی۔

3- صرف مرد ہی حرام کاری کے ذمہ دار ہیں اس لئے وہ برے فعلوں سے بچنے کا حلفاً وعدہ کریں اور ایسے افعال کی حمایت نہ کریں تو شاید یہ بدعت ختم ہو جائے۔

4- بہت سی بدکار عورتیں ایسی ہیں جو شروع میں شروع شریف لڑکیاں تھیں لیکن بری صحبت میں پڑ کر خراب ہو گئیں۔ لہٰذا علاج کلیسا اور گھر سے شروع ہونا چاہیئے۔

5- چونکہ دنیا میں عورت ہمیشہ رہے گی، اس لئے بدکاری بھی ہمیشہ رہے گی کیونکہ عورتیں زندگی کی نعمتوں کے حصول کے لئے آسان طریقہ اختیار کرتی ہی رہیں گی۔

6- تقریباً تمام پیشہ ور عورتیں فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکیوں سے بھرتی کی جاتی ہیں۔ اس لئے حرام کاری کو ختم کرنا ہے تو عورتوں کو صنعتوں میں کام کرنے سے روک دیا جائے۔

7- جو لڑکیاں بعد میں پیشہ اختیار کرتی ہیں، وہ شادی سے پہلے مائیں بننے کا تجربہ کر چکی ہوتی ہیں۔

8- بدکار عورت نفسیاتی علاج سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا بہت سی پیشہ ور عورتوں کو نفسیاتی تجزیے کے ذریعے ان کا کھویا ہوا وقار واپس مل سکتا ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اس سفید جھوٹ اور نیم حقیقت کا کیا کیا جائے۔ لہٰذا بدکاری اور عصمت فروشی کے خلاف جہاد کرتے کرتے قانون ساز اسمبلیاں مفلوج ہوگئیں تو حیرانی کی کوئی بات نہیں اور پھر کوئی مثال بتایئے کہ کوئی قانونی اقدام اس قسم کی مخالفت کے بغیر اٹھایا گیا ہو کہ یہ لامحالہ ناکام رہے گا۔

چند سال پیشتر پال ڈی کروئف نے مردوں کے ایک رسالے میں اپنا ایک سنسنی خیز مقالہ شائع کیا، جس میں اس نے بدکاری کے خلاف جدوجہد کرنے کا ایک نیا طریقہ پیش کیا۔ یہ مقالہ اچھا خاصا افسانہ تھا جس میں ایک ایسی دوا کی موجودگی کی اطلاع دی گئی تھی جسے عورتیں استعمال کریں تو نہ صرف یہ ہوگا کہ دوسروں کو ان سے بیماری نہیں لگے گی بلکہ بیماری کا زور ٹوٹ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دوا کے استعمال سے کوئی خوف باقی نہیں رہتا اور ان گنت بار زنا کیا جاسکتا ہے۔ بچے کی ضرورت ہی کیا ہے مقصد تو بیماری سے بچنا ہے۔

لیکن یہ امسٹر کروئف کے زرخیز تخیل کی پیداوار نکلی پھر بھی ایسی دوا کی ایجاد ناممکنات میں سے نہیں چونکہ اب تک کوئی ایسی دوا موجود نہیں ہے اس لئے طبی تحقیقات کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ مانع مرض اور دافع مرض دوائیں ایجاد کی جائیں۔ سائنس دانوں کی اچھی خاصی تعداد کا خیال ہے کہ یہ جڑواں بہنیں ایجاد ہوگئی تو حرام کاری سے پیدا شدہ مصیبت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ کیا اہم ان سے اتفاق کر سکتے ہیں۔

اس سوال کے جواب کے لئے کسی خاص سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ آج کل بیماری لگنے اور حمل ٹھہرنے کے دو ایسے قدرتی خوف ہیں جن کے پیش نظر بہت سے نوجوان اور دوشیزائیں جنسی تعلقات میں محتاط ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ بدکاری ایک حد تک قابو میں ہے۔ جونہی یہ خدشہ جاتا رہے گا ہر قسم کی بدکاری میں کمی کی بجائے اضافہ ہو جائے گا۔ عام لوگ جتنی مقدار میں جنسی بیماری سے بچاؤ اور ضبط تولید کے طریقوں کا علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے زیادہ گناہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ سوویت یونین کے سوا ہر ملک میں عصمت فروشی کا قوی امکان ہے کیونکہ سوویت یونین میں سائنس کا کام محض جنسی بیماری اور ناجائز پیدائش سے اعداد شمار جمع کرنے تک محدود نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہاں اس سے کہیں زیادہ اہم اخلاقی مسائل درپیش تھے۔ اشتراکی حکومتوں کو تو اس بات کی لگن تھی کہ انسانی نسل کی اصلاح کیسے ہو اس کی فطرت کو کیسے بدلا جائے۔

عصمت کی تجارت کا خاتمہ

روسی عورتوں نے سوال نامے کے جواب میں متفقہ طور پر بتایا کہ عورتیں معاشی دباؤ غریبی سے مجبور ہو کر عارضی یا مستقل طور پر بدکاری اختیار کرتی ہیں۔ لیکن اس سوال کا یہ جواب ادھورا ہے

روس کی غریب عورتوں کی اکثریت نے بدکاری کا غریبی کا حل سمجھ کر اختیار نہ کیا تھا۔ اس کی وجہ؟ کیا ان کی حالت اس بدنصیب اقلیت سے اچھی تھی جنہوں نے عصمت فروشی کو اپنی غریبی کا علاج سمجھا تھا؟ ہر گز نہیں؟ روسی عورتوں نے اس سوال کا بھی موثر جواب دیا۔

جو عورتیں عصمت فروشی کی لعنت میں گرفتار تھیں انہوں نے بتایا کہ وہ دوسرے لوگوں کے اکسانے پر عصمت کی تجارت کرنے لگیں۔ یہ اکسانے والے کون تھے؟ عموماً یہ ایسے مرد نہ تھے جو سب سے پہلے ان کے گاہک بنے، بلکہ یہ ایسی عورتیں اور مرد تھے جو عصمت کی تجارت سے نفع کماتے تھے اور یہ لوگ دلال یا

چکلوں کے چودھری اور مالک تھے۔

بعض قاری یہ خیال کریں گے کہ مذکورہ بالا ہر دو حقائق کا اطلاق صرف روسی عورتوں پر ہی ہوسکتا ہے۔انہین چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں فلیکسز اور کوپر کی کتابیں پڑھیں اور کتابوں سے معلوم ہوگا کہ ان دونو ں حقیقتوں کا اطلاق 1923 کے روس کی طرح آج روس کے علاوہ ہر ملک پر ہوتا ہے اور اس سے دنیا کا کوئی ملک مستثنےٰ نہیں عصمت فروشی کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ دنیا میں بے شمار مفلوک الحال اور بے یار مددگار لڑکیاں پائی جاتی ہیں اور دوسرا یہ کہ عصمت کی باقاعدہ اور منظّم تجارت سے بھاری منافع حاصل ہوتا ہے۔

بدنصیب لڑکیوں کو ان منافعوں سے کوئی خاص حصہ نہیں ملتا۔رومانی اور خیالی اندازوں کے برعکس پیشہ ور لڑکیوں کی ماہوار آمدنیاں نہایت قلیل ہیں۔ان کی زندگی نہایت ہی ہولناک اور ان کا ماحول نہایت ہی غلیظ اور پست ہے۔البتہ چند لڑکیاں ایسی بھی تھیں۔جنہوں نے عصمت فروشی کو مستقل پیشہ بنانے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ہزاروں لڑکیوں نے اعتراف کیا کہ وہ ناسمجھی میں بدکار بن گئیں اور ان پر حقیقت حال بعد میں کھلی۔اکثر نے یہ دھندا مجبوراً اختیار کیا۔وہ فاقوں مر رہی ہوتیں یا ان کا کام غیر دلچسپ اور اکتا دینے والا ہوتا یا وہ نہایت قلیل اجرت پر حد سے زیادہ مشکل اور ناقابل برداشت کام کر رہی ہوتیں یا فرصت کے وقت ان کے پاس دل بہلاوے اور تفریح کا کوئی سامان نہ ہوتا تو اس حالت میں کوئی دلال مرد یا عورت وار ہوتی۔وہ نہایت چالاکی سے سنہری جال بچھاتی اور لڑکی کے ساتھ تاریخ اور معاوضہ طے کر جاتی عام طور سے یہ معاوضہ قلیل ہوتا تھا۔

اشتراکی محققوں نے معلوم کیا کہ اکثریت کو کسی خاص معاوضے کا وعدہ نہ دیا جاتا تھا وہ اس قدر خستہ حال ہوتی تھیں کہ ان کے لئے معمولی معاوضہ بھی گناہ کی زبردست ترغیب ثابت ہوتا۔کوپر نے اپنی کتاب میں بتایا کہ امریکہ میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ لڑائی سے چند سال پہلے فی ہفتہ اکیس بکس (bocks) خالص منافع کے وعدہ پر لڑکیوں کو عصمت فروشی کے لئے بھرتی کیا جاتا تھا اور یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ گناہ کی جڑ نہایت افلاس میں ہے۔

مذکورہ بالا سوال نامے کی تیاری کے وقت سوویت حکومت نے ملک کی صنعتی اور زرعی زندگی کو نئے سرے سے منظّم کرنا شروع کیا ہی تھا۔اس وقت عورتوں کے لئے تقریباً کوئی نوکری یا عہدہ خالی نہ تھا اور اگر کوئی تھا بھی تو تنخواہ بہت ہی تھوڑی تھی۔سوال نامے میں عورتوں کو کوئی ملازمت پیش نہیں کی گئی تھی۔اور نہ کوئی باعزت روزگار کے ذریعے اپنی اخلاقی زندگی کو بحال کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔انہیں اپنی اخلاقی پستی کے معاشی وجوہ کا پورا احساس تھا۔ان بدنصیب عورتوں کی اکثریت بچوں کی پرورش کر رہی تھی۔اور وہ ہر وقت یہ خواب دیکھتی تھیں کہ بچوں کے باشعور ہونے سے پہلے اپنے ذلیل پیشے سے نجات حاصل کر لیں، تاکہ وہ ان کے لئے ندامت کا داغ ثابت نہ ہوں۔

اس سوال نامے سے ایک اور حقیقت کی تصدیق ہوئی جسے آج ہر ماہر نفسیات، مصلح اور زانی مرد اچھی طرح جانتا ہے لیکن اس سے بہت کم شریف عورتیں آگاہ ہیں۔وہ حقیقت یہ ہے کہ ایسی لڑکیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو ہوس پرستی یا حد سے زیادہ بڑھی ہوئی جنسی خواہش کی تسکین کی خاطر عصمت فروشی اختیار کرتی ہیں۔روسی عورتوں نے متفقہ طور پر بتایا کہ اس قسم کی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعت جنس سے قطعاً اچاٹ ہو جاتی ہے اور دل کو جنسی فعل سے نفرت ہو جاتی ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا

کہ وہ بدکاری کی طرف مائل ہوئیں تو لذت کشی کا خیال تک ان کے قریب نہ پھٹکا تھا۔

اشترا کی ماہرین نفسیات نے اس سوال نامے کے جوابوں کی روشنی میں اس عام تجربے کی تصدیق کی کہ اکثر طوائفیں نفسیاتی اعتبار سے صحت مند ہوتی ہیں۔ان کے دماغوں میں خلل ہوتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس قدر، جتنا کہ عام با خلاق عورتوں کے دماغوں میں پایا جا سکتا ہے۔یعنی ان کی ذہنی حالت عام عورتوں کی سی ہوتی ہے۔شائستگی اور حیا سے بے حیائی اور بدکاری کی طرف میلان کا باعث نفسانی دباؤ نہیں بلکہ معاشی دباؤ ہے۔

آج کل ہمارے ہاں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ بداخلاق لڑکی کی سماجی حیثیت کو بحال کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے کافی عرصہ تک نفسیاتی شفاخانے میں رکھا جائے۔ یہ نظریہ سائنس اور عقل کے خلاف ہے۔اس کے نتیجے کے طور پر بے شمار مضحکہ خیز سکیمیں تیار ہونے لگتی ہیں۔مثلاً عورتوں کے لئے ''نجات گھر'' اور ''اصلاح گاہیں'' تعمیر ہونے لگتی ہیں۔لڑکی کو پہلے جرم پر قید کی سزا دی جاتی ہے اور اس کے دوران میں ایک افسر اس کی نگرانی کرتا ہے۔وہ تصدیق کر دے کہ ملزمہ کا اخلاق درست ہو گیا ہے تو اسے تجربتاً رہا کر دیا جاتا ہے۔ایسی سکیموں سے کوئی مقصد حاصل ہوتا ہے تو صرف یہ کہ جرائم اور بدکاری کا عام سبب یعنی افلاس وقتی طور پر.....پس منظر میں چلا جاتا ہے۔روسی عورتوں نے بدمعاشی کے معاشی اسباب پر بہت زیادہ زور دیا اور نہایت موثر الفاظ میں مطالبہ کیا کہ ہمیں کوئی باعزت کام دیجئے۔ مناسب تحفظ کا یقین دلا دیجئے۔ہم اپنے آپ کو فوراً بحال کر لیں گی۔

وہ جواب خاص طور سے بصیرت افروز تھے جو عصمت کی تجارتی لوٹ کھسوٹ سے متعلق تھے۔ان سے اس فریب کی قلعی کھل گئی کہ عصمت فروشی کے اڈوں کو چند امیر اور صاحب دماغ آدمیوں کا گروہ چلاتا ہے اور اس پراسرار گروہ کا راز فاش ہو گیا۔جسے ''عصمت کا تاجر'' کہتے ہیں۔کیونکہ سوال نامے نے ثابت کر دیا کہ بدکاری سے نفع کمانے والے لوگ عام عورتیں اور مرد ہوتے ہیں۔ان دنوں روس میں بدکاری سے نفع کمانے والوں کی اکثریت عام اور گمنام قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ان میں تانگے والے ہوٹلوں کے بیرے، عام جرائم پیشہ اور نشہ کے عادی لوگ ہوتے ہیں۔اور گھٹیا درجے کے ناچ گھروں، ہوٹلوں ریستورانوں اور تفریح گاہوں کے مالک اور سب سے بڑھ کر ایسے جاگیردار اور صاحب جائداد لوگ شامل ہیں جو سستے ہوٹلوں سراؤں اور سیاحوں کی قیام گاہوں کے مالک ہوتے ہیں۔

اب ہم نکتہ اختلاف یعنی اس مسئلے پر پہنچ گئے ہیں جس کا سامنا اشترا کی ماہرین کو عصمت فروشی کے خلاف مہم چلانے سے پہلے کرنا پڑا۔دوسرے لفظوں میں یہ ایسا نکتہ ہے جو اشترا کی مہم کو باقی تمام مہموں سے ممیّز کرتا ہے جو کسی دوسرے ملک میں عصمت فروشی کے خلاف چلائی گئیں۔

اس نکتے کی آسان تشریح یہ ہے کہ سوویت یونین میں بدمعاشی کے خلاف زبردست مہم چلانے کی ٹھان لی گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ اس مہم کا رخ طوائف کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ منظّم بدکاری ایک سماجی برائی ہے اس کا بنیادی سبب عورتوں کا افلاس ہے۔اور نفع اندوزی کا لالچ اس لعنت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔اس پالیسی کی اخلاقی بنیاد کیا ہے؟ اس کی مکمل تشریح میکسم گورکی ان الفاظ میں کر چکا ہے۔

اب ہم نکتہ اختلاف یعنی اس مسئلے پر پہنچ گئے ہیں جس کا سامنا اشترا کی ماہرین کو عصمت فروشی کے خلاف مہم چلانے سے پہلے کرنا پڑا۔دوسرے لفظوں میں یہ ایسا نکتہ ہے جو اشترا کی مہم کو باقی تمام مہموں سے ممیّز کرتا ہے جو کسی دوسرے ملک میں عصمت فروشی کے خلاف چلائی گئیں۔

اس نکتے کی آسان تشریح یہ ہے کہ سوویت یونین میں بدمعاشی کے خلاف زبردست مہم چلانے کی ٹھان لی گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ اس مہم کا رخ طوائف کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ منظّم بدکاری ایک سماجی برائی ہے اس کا بنیادی سبب عورتوں کا افلاس ہے۔ اور نفع اندوزی کا لالچ اس لعنت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس پالیسی کی اخلاقی بنیاد کیا ہے؟ اس کی مکمل تشریح میکسم گورکی ان الفاظ میں کر چکا ہے۔

''دنیا میں ایک بھی غلام اور مظلوم باقی نہ رہے تو اغلب ہے کہ انسان مثالی طور پر نیک بن جائے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی غلام اور مظلوم نہ رہے تو ان لوگوں کے خلاف زبردست جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے جو غلاموں کی محنت پر زندہ رہنے کے عادی ہو چکے ہیں''

سوویت حکومت نے 1925 میں ایک قانون کے ذریعے اپنے نظریوں کو عملی شکل دی۔ اس قانون کا نام تھا ''عصمت فروشی کے خلاف جدوجہد کے اقدامات'' اس قانون کا پیش لفظ چونکا دینے والا تھا۔ اس میں بدکاری اور بیماری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ اور ہر حکومتی ادارے، ٹریڈ یونین، امداد باہمی اور عوامی کو ہدایت دی گئی کہ مندرجہ ذیل امور پر فوراً عمل کیا جائے۔

1- حکم دیا گیا کہ ملیشیا یعنی مسلح مزدوروں کے دفاعی دستے ٹریڈ یونینوں کی براہ راست حمایت حاصل کریں اور محنت کش عورتوں کو ان کی موجودہ ملازمتوں سے ہر قیمت برطرف نہ ہونے دیں۔ اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جائے کہ غیر شادی شدہ عورتوں کو جو محنت کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں یا جو حاملہ ہیں، جو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مائیں ہیں۔ یا بے گھر نوجوان لڑکیوں کو کسی صورت میں بھی ملازمت سے برطرف نہ کیا جائے۔

2- اس وقت ملک میں بہت زیادہ بے روزگاری پائی جاتی تھی اس مسئلے کے جزوی حل کے لئے مقامی حکومتوں کے مختلف اداروں کو ہدایت دی گئی کہ غریب عورتوں کو محنت مزدوری بہم پہنچانے کے لئے امداد باہمی بنیادوں پر زرعی فارم اور فیکٹریاں قائم کی جائیں۔

3- تمام عورتوں کو سکولوں اور تربیت گاہوں میں داخل ہو کر علم اور فن سیکھنے پر ابھارا گیا اور یونینوں کو ہدایت کی گئی کہ صنعتی اور پیشہ ورانہ اداروں میں عورتوں کے داخلے کی جو مخالفت پائی جاتی ہے۔ اس کا کامیابی سے مقابلہ کیا جائے۔

4- رہائشی مکانوں کا بندوبست کرنے والے محکموں کو حکم دیا گیا جن عورتوں کا کوئی مخصوص ٹھکانہ نہیں یا جو لڑکیاں ملازمت کے سلسلہ میں دیہات سے شہروں میں آتی ہیں ان کے لئے مشترکہ رہائشی ادارے قائم کئے جائیں۔

5- لاوارث اور بے گھر بچوں اور لڑکیوں کے تحفظ کے لئے جو قوانین بنائے گئے ہیں۔ ان پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

6- ملک کی تمام آبادی کو جنسی بیماری یعنی آتشک کی خطرناک مصیبت اور عصمت فروشی کی لعنت سے آگاہ کرنے اور نئی جمہوریت سے ان برائیوں کے خاتمے کے لئے قومی امنگ اور عزم کے ساتھ جہالت پر عام دھاوا بولا جائے اور تعلیم کو رواج دیا جائے۔

یہ سب اقدامات ابتدائی قسم کے تھے اور ان کا مقصد نہایت غریب عورتوں اور لڑکیوں کی حالت کو قدرے بہتر بنانا تھا۔ اشتراکی حکومت کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ بدکاری سوسائٹی کے ہر طبقے میں پاؤں جما چکی ہے۔ صرف معاشی دباؤ کے ہلکا کر دینے سے یہ موجودہ نسل سے تو ہرگز دور نہیں ہو سکتی۔ اور شاید

آئندہ نسل میں بھی باقی رہے۔لہٰذا اس پر براہ راست حملہ کیا گیا۔اس مقصد کے پیش نظر مرکزی حکومت نے تین مزید قانون نافذ کئے۔

1-زارشاہی کے قانون میں بدکردار عورتوں کے خلاف جتنے بھی ظالمانہ اقدامت روا رکھے گئے تھے انہیں قانون اور پولیس کی سرگرمیوں سے قطعاً الگ کر دیا گیا۔

2- مفت خوروں اور طفیلیوں کے خلاف شدید جنگ کا آغاز کیا گیا۔کیونکہ ان لوگوں کا مفاد بلا واسطہ یا بالواسطہ عصمت فروشی سے وابستہ تھا۔مقامی حکومتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں ان بے رحموں سے بے رحمی کے ساتھ پیش آئیں۔

3- جو لوگ جنسی بیماریوں سے متاثر تھے انہیں ہر ممکن طریقے سے ڈاکٹر اور طبی سہولتیں مفت بہم پہنچائی گئیں۔

ان قوانین پر عمل کرانے کے لئے محکمہ صحت عامہ کے ماتحت ایک نیا ادارہ قائم کیا گیا لیکن شروع ہی سے بہت سے مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔اقتصادی اقدام سے رفتہ رفتہ خاطر خواہ نتیجہ نکلنے لگا تھا۔لیکن منظّم بدکاری یعنی عصمت کی تجارت کے خلاف جدوجہد میں کوئی کامیابی نظر نہ آئی۔

زارشاہی پولیس کے وحشیانہ طریقے مسلح مزدوروں کے بعض دفاعی دستوں نے ہو بہو اختیار کے لئے جن کے قائد ایسے لوگ تھے جو بداخلاقی سے متعلق نئے نظریئے کو سمجھ نہ سکے تھے۔اس لئے 1923 میں عوامی مجلس انصاف نے ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر دی۔جس کا آزاد ترجمہ حسب ذیل ہے۔

دفعہ نمبر170 جو شخص ذاتی منفعت یا کسی دوسری غرض سے جسمانی یا اخلاقی دباؤ کے ذریعے عصمت فروشی کی حوصلہ افزائی کرے گا وہ اپنے پہلے جرم پر کم تین سال سزائے قید کا مستوجب ہوگا۔

دفعہ171 عصمت کے تاجر اپنے پہلے جرم پر کم سے کم تین سال قید اور تمام ذاتی جائیداد کی ضبطی کی سزا کے مستوجب ہوں گے۔اگر طوائف کسی ملزم کی زیر نگرانی ہو یا اس کی ملازمت میں ہو یا اس کی عمر اکیس سال سے کم ہو تو قید کی سزا بڑھا کر کم سے کم پانچ سال کر دی جائے گی۔

ان قوانین پر عملدرآمد کی ذمہ داری پہلے پہل محکمہ صحت عامہ کے سپرد کی گئی تھی۔لیکن بعد میں جنوری 1924 میں امور داخلہ کی عوامی مجلس کے حوالے کر دی گئی۔یہ ادارہ تقریباً ہمارے ہاں کے محکمہ عدل وانصاف یا سرکاری وکیل اعظم کے دفتر سے مشابہ ہے اس کے بعد ایک اور آرڈی ننس جاری کیا گیا۔جسے فوراً قانونی شکل دے دی گئی۔یہ قانون عصمت فروشی کے خلاف جدوجہد میں ملیشیا کے فرائض سے متعلق تھا۔یہ غیر معمولی قانون تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔کیونکہ یہ پہلا قانونی اقدام ہے جو منظّم بدکاری کی سماجی بنیادوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوا اور یہ اس قابل ہے کہ دوسرے ملکوں کو نمونے کا کام دے سکے اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- پہلے حصے میں ملیشیا کے فریضے وضاحت سے بیان کئے گئے۔ملیشیا کا فوری کام یہ تھا کہ وہ بدمعاشی کے تمام اڈوں کا سراغ لگائے کیونکہ یہ بدطنیت لوگوں کو لئے حصول منفعت کا ایک بڑا اور مستقل ذریعے تھے جو شخص اڈوں کو چلانے والا یا ان مکانوں کا مالک یا کرائے پر دینے والا نکلے یا ان اڈوں کے لئے گاہک یا عورتیں مہیا کرنے میں جس شخص کا کسی طرح بھی کوئی ہاتھ ثابت ہو اسے فوراً گرفتار کیا جائے اور ضابطہ فوجداری کی دفعات کے مطابق سزا دی جائے۔جن مکانوں میں عصمت فروشی کا کام ہوتا ہو، ان کے مالکوں یا

مالکنوں، دلالوں یا کٹنیوں وغیرہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو انسانوں کے سوداگروں کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔ ملیشیا کو تنبیہ کی گئی کہ وہ بدمعاشی کے مشہور اڈوں پر چھاپے کے فوراً بعد تفریح گاہوں، ریستورانوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرے۔ تفریح گاہ یا ہوٹل وغیرہ کا مالک خواہ لاکھ عذر پیش کرے کہ اسے قطعاً کوئی علم نہیں کہ اس عمارت میں کیا ہوتا ہے، اسے بہرصورت پکڑا جائے اور اس پر الزام لگا کر سزا دی جائے جس مکان میں بدکاری کے متعلق ثبوت مل جائے اسے اس وقت تک لازماً بند رکھا جائے جب تک اس کے مالک اور اس کے مددگاروں کو قرار واقعی سزا نہ مل جائے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایسے سخت اور لازمی اقدام کے متعلق ہمارے ہاں کے قانون سازوں نے کبھی سوچا تک نہیں۔ ہمارے ہاں عصمت فروشی کا اڈہ روپیہ لگانے کا سب سے اعلیٰ ادارہ ہے۔ کیونکہ پولیس خواہ جتنی مرتبہ چاہے۔ چھاپے مارے اس کے مالک کا کھوج ہی نہیں ملتا اور وہ ہر طرح بری الذمہ رہتا ہے۔

2- اس قانون کا دوسرا حصہ بالکل اچھوتا ہے اس میں ملیشیا اور عوام کو تنبیہ کی گئی کہ بدکار عورت کے خلاف کسی قسم کا ذاتی اقدام نہ کیا جائے حتیٰ کہ ایک دفعہ کے ذریعے طوائفوں کی گرفتاری ممنوع قرار دے دی گئی انہیں عدالت میں صرف ان کے تاجروں کے خلاف گواہوں کی حیثیت سے طلب کیا جا سکتا تھا تاہم اس قانون میں ایک استثنائی دفعہ بھی تھی جس کے تحت ملیشیا کو اختیار تھا کہ وہ کم سن نوجوان لڑکیوں کو حکومت کی ایک خاص تحقیقاتی تنظیم یعنی مزدوروں اور کسانوں کی تحقیقاتی مجلس کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ اس قانون میں اس طریق کار کو مفصل طور پر بیان کیا گیا جسے بدمعاشی کے اڈوں پر چھاپہ مارتے وقت اختیار کرنا ملیشیا کے لئے ضروری تھا۔ ملیشیا کے ارکان کے لئے لازمی تھا کہ وہ عورتوں کو سماجی لحاظ سے اپنے برابر سمجھیں انہیں جرائم پیشہ لوگوں کی بے بس اور بدنصیب شکار جانیں۔ اور خواہ وہ ان کے ساتھ کسی طرح پیش آئیں وہ ان سے شریفانہ انداز میں گفت گو کریں اور ان پر ہزگز ذاتی حملے نہ کریں حد تو یہ ہے افسروں کو بدکردار عورتوں کے نام اور پتے حاصل کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

لیکن ہمارے ہاں کے پولیس افسر کے قریب یہ تمام اقدام عجیب اور ناقابل عمل ہیں۔ کیونکہ یہاں رسماً طوائفوں کے ساتھ انسان سے نچلے درجے کی مخلوق ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن روس میں یہ نئے قوانین نہایت ہی کارگر اور کامیاب ثابت ہوئے۔ ملیشیا اور دوسری عوامی تنظیمیں۔ مثلاً ٹریڈ یونینیں جو بدکاری کے خلاف جدوجہد کر رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگیں کہ جس عورت کی گذران گناہ پر ہے اسے مادی حالات کا دباؤ اور نفع اندوز جرائم پیشہ لوگوں کا مفاد ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

حیران قوانین سے حقیقی نتائج کیا نکلے؟ بدمعاشی کے اڈوں کے مالک اور بدمعاشی کے کاروبار میں ان کے شریک کار رفیق عدالتوں میں قطار اندر قطار پیش ہونے لگے اور انہیں جیلوں کا راستہ دکھایا جانے لگا جیسا کہ توقع تھی ان لوگوں نے مزاحمتی مہم چلانے کی کوشش کی۔ سوویت یونین کے اخباروں کے ''ایڈیٹر کی ڈاک'' کے کالم دن بدن پھیلنے لگے۔ یہ خط اخلاقی چاشنی لئے ہوتے تھے۔ ان میں سوویت حکومت پر عموماً الزام لگایا جاتا کہ وہ طوائف کی حفاظت کر کے اور بدمعاشی کے اڈوں کے کرایہ دار مالکوں ایسے گناہگار

لوگوں کو سزائیں دے کر ہولناک بداخلاقی کی مرتکب ہو رہی ہے پس پردہ رہ کر عصمت فروشی کا کاروبار چلانے والے افراد کے خلاف ملیشیا کی جدوجہد جتنی تیز اپنی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ تیز اور وسیع کر دیں۔

جن بڑے بڑے چکلہ داروں کو ابھی تک گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے جلد ہی سوویت حکومت پر الزام لگانا شروع کر دیا کہ وہ صاحب جائداد لوگوں یعنی ہوٹلوں کے مالکوں وغیرہ کو غیر منصفانہ سزائیں دے رہی ہے۔ امور داخلہ کی مجلس نے ان لزامات کے جواب میں کہا کہ کوئی سماج اپنے کسی رکن کو منظّم عصمت فروشی جیسے قبیح فعل کی حمایت کا حق نہیں دے سکتا اور اس دلیل کے جواب میں طوائفوں کو بھی اپنا پیشہ جاری رکھنے کا حق حاصل ہے۔ سوالنامے سے اخذ کردہ نتیجے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا کہ عصمت فروشی ایک تلخ معاشی ضرورت ہے اور عورتیں اسے اختیار کئے ہوئے ہیں انہیں نجات دلانا اور قابل عزت کام عطا کرنا سماج کا فرض ہے۔

1924 کے اواخر میں ایک نئی شکل کا سامنا ہوا۔ اسے اخبار ''ازدستیا'' نے اپنے ایک ضمیمے میں ماسکو کے باشندوں کے سامنے پیش کیا اور بتایا کہ سوویت یونین میں اخلاقی منصوبہ بندی کافی حد تک کامیاب رہی ہے اس وقت تک عصمت فروشی کے خاتمے کی جدوجہد کے لئے صرف مذکورہ بالا اقدام اٹھائے گئے تھے لیکن اب ایک نیا اخلاقی مسئلہ اٹھایا گیا یعنی ہماری اصطلاح میں ''آگ کا رخ گاہکوں کی طرف کر دیا گیا''۔

''ازدستیا'' نے اطلاع دی کہ عصمت کی تجارت سے نفع کمانے والوں کو ختم کرنے میں بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے اور اپنے اداریئے میں تنبیہہ کی کہ عصمت فروشی کے خاتمے میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ تمام عورتوں کے لئے ملازمت کا بندوبست کیا جائے۔ اخبار مذکور نے ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کیا کہ جدوجہد کی کامیابی کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ مردوں میں نیا اخلاقی نظریہ پیدا ہو۔ اس مسئلے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔ اگر ایک شہری کے لئے کسی عورت کی لوٹ کھسوٹ پر بسر اوقات کرنا جرم ہے۔ تو مردوں کا عصمت کو خرید کر کسی عورت کے وقار کو تباہ کرنا بھی برابر کا جرم ہے''۔

ہم نے بدکاری کی تاریخ کا تجزیہ کرتے وقت بتایا تھا کہ یہ مسئلہ سب سے پہلے سماجی حیثیت میں اس وقت سامنے آیا جب کہ جاگیرداری زوال پذیر ہو چکی تھی اور محبت اور شادی کے بارے میں سماج کا نقطہ نظر بنیادی طور سے بدل گیا تھا۔ لیکن روس میں نئی بات یہ ہوئی کہ اس مسئلے کو لاکھوں مردوں کے آگے پہلی مرتبہ پیش کیا گیا۔ سوویت یونین کے مردوں کے سامنے ایسے حقائق تھے۔ جن سے گریز ناممکن تھا وہاں ایک ایسا سماجی نظام قائم ہو چکا تھا جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر پوری قانونی، سماجی برابری دے دی گئی تھی۔ محبت اور شادی کے ذریعے جنسی خواہش کی تسکین کے راستے سے تمام روکاوٹیں دور کی جا رہی تھیں ان حالات میں کسی مرد کا ضمیر جنس کی خریداری کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ مرد کب تک نہ صرف عورت کو اخلاقی پستی کے گڑھے میں گراتے رہتے بلکہ اپنے وقار کو بھی پہنچاتے رہتے۔

سوویت ماہرین کو پہلے سے علم تھا کہ یہ مسئلہ اٹھے گا۔ ''ازدستیا'' کے مقالہ افتتاحیہ کے بعد پروفیسر ایلسترانوف نے اسے جنسی بیماریوں کے خلاف جدوجہد کی دوسری کانگرس کے موقع پر اور زیادہ ٹھوس اور واضح طریقہ سے پیش کیا اس نے کہا کہ عورتوں کی لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف ملیشیا کی کامیاب جدوجہد کا اب یہ تقاضا ہے کہ ان مردوں پر سماجی دباؤ ڈالا جائے جو ابھی تک بدمعاشی کی حوصلہ افزائی کر

رہے ہیں۔

اس نے دعویٰ ہم اس مسئلے کو تنگ اخلاقی نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اسے ایک نہایت ہی اہم سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں، سوویت یونین ایک ایسی ریاست ہے جس کی بنیاد انسانوں کی ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کے خاتمے پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص عورتوں پر یہ ہولناک ظلم روا رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو ہمارے سماج کا فرد نہیں سمجھ سکتا''۔

درست کہ پروفیسر صاحب کا بیان ہمارے کانوں کو ایک وعظ لگتا ہے لیکن یہاں بھی اشتراکی ماہرین نے پہلے نظریہ پیش کیا پھر سائنسی منصوبہ بندی کے مطابق عملی اقدام کیا امور داخلہ کی مجلس نے اس مسئلے کو محض مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے فوراً ملیشیا کے حوالے کر دیا تا کہ وہ مناسب کاروائی کرے۔

سچ مچ ایک حیران کن قانون منظور کیا گیا۔ اس کی رو سے ملیشیا کے افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ بدمعاشی کے کسی اڈے پر بھی چھاپہ ماریں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا شراب خانہ ہو یا محض کوئی کالی گلی تو جتنے بھی مرد وہاں ملیں ان کے نام اور گھروں، کارخانوں وغیرہ کے پتے ضرور درج کریں۔ لیکن انہیں گرفتار نہ کیا جائے۔

اگلے دن ان تمام مردوں کے نام اور شناخت کی فہرست کسی ایسے مقام پر چسپاں کر دی جاتی جہاں عام لوگ آتے جاتے یا جمع ہوتے۔ فہرست کا عنوان ہوتا ''عورتوں کا جسم خریدنے والے'' یہ فہرست ایک خاص مدت کے لئے چسپاں رکھی جاتی۔ عام طور سے ایسی فہرستیں سرکاری عمارتوں کے باہر فیکٹریوں کے نوٹس بورڈوں پر چسپاں کی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے یہ قانونی اقدام بہت زیادہ موثر ثابت ہوا۔ ہمارے ملکوں میں پولیس ایک ان لکھے قانون کے تحت مجبور ہے کہ وہ مردوں سے راز داری اور عزت کے ساتھ پیش آئے۔ کیونکہ اسے پورا احساس ہے کہ وہ ایک ایسے شریف آدمی کا ننگا کر دے جو کسی چکلے کا سرپرست ہو تو اس بیچارے کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی۔ سوویت حکومت نے صرف اتنا کیا کہ اس طاقتور اور خفیہ سماجی احساس کو ایک موثر حربے میں ڈھال دیا۔ اس نے قلم کی ایک ہی جنبش سے آدمی کے ضمیر کو عوام کا ہدف تنقید بنا دیا۔ سوویت حکومت نے گناہگاروں کو سزا دینے اور اخلاقی جعلسازی کے خلاف تلقین کرنے کی بجائے ایسا اقدام کیا کہ مردوں کے لئے آئندہ اپنی فریب کاری کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔

سوویت ماہرین کو پہلے سے علم تھا کہ یہ مسئلہ اٹھے گا۔ ''از دستیا'' کے مقالہ افتتاحیہ کے بعد پروفیسر ایلستر اتوف نے اسے جنسی بیماریوں کے خلاف جدوجہد کی دوسری کانگرس کے موقع پر اور زیادہ ٹھوس اور واضح طریقہ سے پیش کیا اس نے کہا کہ عورتوں کی لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف ملیشیا کی کامیاب جدوجہد کا اب یہ تقاضا ہے کہ ان مردوں پر سماجی دباؤ ڈالا جائے جو ابھی تک بدمعاشی کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

اس نے دعویٰ کیا کہ ''ہم اس مسئلے کو تنگ اخلاقی نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اسے ایک نہایت ہی اہم سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں، سوویت یونین ایک ایسی ریاست ہے جس کی بنیاد انسانوں کی ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کے خاتمے پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص عورتوں پر یہ ہولناک ظلم روا رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو ہمارے سماج کا فرد نہیں سمجھ سکتا۔''

درست کہ پروفیسر صاحب کا بیان ہمارے کانوں کو ایک وعظ لگتا ہے لیکن یہاں بھی اشتراکی

ماہرین نے پہلے نظریہ پیش کیا پھر سائنسی منصوبہ بندی کے مطابق عملی اقدام کیا امور داخلہ کی مجلس نے اس مسئلے کو محض مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے فوراً ملیشیا کے حوالے کر دیا تا کہ وہ مناسب کاروائی کرے۔

سچ مچ ایک حیران کن قانون منظور کیا گیا۔ اس کی رو سے ملیشیا کے افسروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ بدمعاشی کے کسی اڈے پر بھی چھاپہ ماریں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا شراب خانہ ہو یا محض کوئی کالی گلی تو جتنے بھی مرد وہاں ملیں ان کے نام اور گھروں، کارخانوں پر غیرہ کے پتے ضروری درج کریں۔ لیکن انہیں گرفتار نہ کیا جائے۔

اگلے دن ان تمام مردوں کے نام اور شناخت کی فہرست کسی ایسے مقام پر چسپاں کر دی جاتی جہاں عام لوگ آتے جاتے یا جمع ہوتے۔ فہرست ایک خاص مدت کے لئے چسپاں رکھی جاتی۔ عام طور سے ایسی فہرستیں سرکاری عمارتوں کے یا فیکٹریوں کے نوٹس بورڈوں پر چسپاں کی جاتی تھیں۔

ظاہر ہے یہ قانونی اقدام بہت زیادہ موثر ثابت ہوا۔ ہمارے ملکوں میں پولیس ایک ان لکھے قانون کے تحت مجبور ہے کہ ہو مردوں سے راز داری اور عزت کے ساتھ پیش آئے۔ کیونکہ اسے پورا احساس ہے کہ وہ ایک ایسے شریف آدمی کو ننگا کر دے جو کسی چکلے کا سرپرست ہو۔ تو اس بیچارے کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی۔ سوویت حکومت نے صرف اتنا کیا کہ اس طاقتور اور خفیہ سماجی احساس کو ایک موثر حربے میں ڈھال دیا۔ اس نے قلم کی ایک ہی جنبش سے آدمی کے ضمیر کو عوام کا ہدف تنقید بنا دیا۔ سوویت حکومت نے گناہگاروں کو سزا دینے اور اخلاقی جعلسازی کے خلاف تلقین کرنے کی بجائے ایسا اقدام کیا کہ مردوں کے لئے آئندہ اپنی فریب کاری کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔

ایسا دلیرانہ قدم اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھایا گیا تھا جن ماہرین نفسیات نے اخلاقی جعلسازی کے خاتمے کا منصوبہ بنایا تھا انہوں نے اس کا نفاذ عین مناسب وقت پر کیا۔ یہ قانون اس وقت تک نافذ نہ کیا گیا جب تک پہلے موثر قوانین کے ذریعے منظّم بدکاری کی معاشی بنیادیں پوری طرح کھوکھلی نہ کر دیں۔

ہمیں یہ بات خاص طور پر دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ یہ اقدام کوئی اخلاقی جبر نہ تھا۔ مردوں کو جنسی خواہش کی تسکین سے ہرگز نہ روکا گیا۔ نہ ہی انہیں عورت کا جسم خریدنے پر سزا کی دھمکی دی گئی بلکہ انہیں صاف صاف بتا یا دیا گیا کہ نئی ریاست اس فعل کو اس لئے برا تصور کرتی ہے کہ یہ انسانوں کی لوٹ کھسوٹ کی ایک ہولناک شکل ہے اور سماج کے باعزت افراد کو جو غریبوں اور بدنصیبوں کی اخلاقی پستی سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کے خواہاں نہیں۔ یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اپنی ذاتی تسکین کے لئے اس لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے پر مصر ہیں۔

محض قانون نافذ کرنے پر اکتفا کر لیا جاتا اور متعلقہ مسائل کو نہایت احتیاط سے واضح نہ کیا جاتا تو یہ قانون ہرگز اس قدر موثر ثابت نہ ہوتا۔ اس قانون کے اجرا کے ساتھ ہی لوگوں کو باشعور بنانے کی مہم قومی پیمانے پر شروع کی گئی اس مہم کی خصوصیت کا خاص پہلو یہ تھا کہ سوویت یونین کے تھیٹروں میں اس کی ڈرامائی پیش کش کی گئی اس ڈرامے میں ایک ایسی عدالت کا منظر دکھایا گیا۔ جس میں عصمت کی تجارت کے مقدمے کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔

کہانی میں بتایا گیا کہ کس طرح ملیشیا نے ایک چکلے پر چھاپہ مارا اور کس طرح اس اڈے کے مالک، عورت اور گاہک کو عوامی عدالت کے سامنے لایا گیا۔ عصمت فروشی کے کاروبار کے متعلق مکمل اور واضح شہادت اور ثبوت مل جانے کے بعد چکلے کے مالک کو قید کی سزا دی گئی طوائف کو چھوڑ دیا گیا اور گاہک

کو نہ صرف اپنی اور عورت کی عزت خراب کرنے بلکہ قومی اخلاقی کے ضابطے کو توڑنے کا مجرم بھی ٹھہرایا گیا۔قدرتاً یہ ڈرامہ خلاف معمول لاتعداد عوام کی کشش کا باعث ہوا اور جس کسی تھیٹر میں بھی اسے پیش کیا جاتا اس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ رہتی۔اس ڈرامے کی شعوری اور بچگانہ سادگی نے اسے فحاشی کی لفظی تصویر سے بہت زیادہ بلند اور موثر بنا دیا۔اس ڈرامے میں ایک سماجی مسئلے کو نہایت سیدھے سادھے الفاظ میں پیش کیا گیا تھا۔یہ ہر قسم کی حماقتوں، مضحکہ خیز پیچیدگیوں اور لفظی گورکھ دھندوں سے بالکل پاک تھا۔ دوسرے لفظوں میں ایک کھلی سماجی حقیقت کو سٹیج پر ہو بہو پیش کر دیا گیا تھا۔

کرداروں نے حقیقت اور قانون دونوں کی ترجمانی کی۔ہر تماشائی مرد، عورت اور نوجوان سمجھ گیا کہ کون سا اخلاقی مسئلہ درپیش ہے۔ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب ضرور کچھ ہونے والا ہے اور آئندہ جو آدمی کسی طوائف کے ہاں پایا گیا اس کا علم سب کو ہو جائے گا اور جب اس کا نام عورتوں کے جسموں کے خریداروں کی فہرست میں شامل کر کے رسوائے عام کر دیا جائے گا تو وہ اپنے رشتہ داروں، ساتھیوں اور تمام قوم کی نظروں میں ذلیل اور ملزم ٹھہرے گا۔

عیسائیت اور ڈاکٹر

ہم نے ابھی تک اس جدوجہد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جو روس میں جنسی بیماری، یعنی آتشک کو ختم کرنے کے لئے کی گئی۔سوویت حکومت نے زارشاہی سے دوسری سماجی لعنتوں کے ساتھ زرد پٹے کے نظام، یعنی عصمت کی تجارت کو بھی ورثے میں پایا، اور اس کے ساتھ ہی جنسی بیماری کا ہولناک مسئلہ بھی، اس زمانے میں روس میں آتشک کا مرض بری طرح پھیل چکا تھا۔اس موذی مرض کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔کہ اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ چہرے کے خدوخال کو بگاڑ دیتا ہے۔چنانچہ روس کی بعض چھوٹی قومیں، خصوصاً جو دریائے والگا کے کنارے آباد تھے، اس لاعلاج بیماری کے ہاتھوں اپنی بدوضعی کے لئے ملک بھر میں مشہور تھے، اس پر طرہ یہ کہ آزاد محبت کے نئے تجربوں نے دونوں جنسی طاعونوں، یعنی آتشک اور سوزاک کو اور بھی ہوا دی۔

اس نازک صورت حال کے باوجود روس کے طبی ماہروں نے حتی الوسع دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی پیروی کرنے سے گریز کیا۔کیونکہ ان ملکوں میں جنسی بیماری کے خلاف جتنی مہمیں چلائی گئی تھیں وہ سب بے اثر ثابت ہو چکی تھیں۔لہٰذا انہوں نے اپنی توجہ اکیلی جنسی بیماری کے خلاف طبی جدوجہد پر مرکوز نہیں رکھی۔وہ اپنے اس درست فیصلے پر جمے رہے کہ جنسی بیماری صرف اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب کہ عصمت فروشی کے خلاف عام بداخلاقی کا بھی انسداد کیا جائے۔انہوں نے اخلاقی مسئلے کو بنیادی قرار اور اس نتیجے پر پہنچے کہ عام اخلاقی مسئلے کو حل کر لیا گیا تو سوزاک اور آتشک پر سائنسی طریقے سے حملہ کرنا آسان ہو جائے گا۔اور ان دونوں علتوں کا انسداد اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ انہیں عام سماجی بیماریوں مثلاً تپ دق، شراب نوشی وغیرہ کا ایک جزو قرار دے کر ان کے خلاف قومی پیمانے پر وسیع مہم چلائی جائے۔اس وقت ایسا کرنا آسان بھی ہوگا۔کیونکہ لوگوں میں کسی قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ پیدا نہیں ہوگی۔جو اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔جب کہ آتشک اور سوزاک کے ازالے کو عام اخلاق سدھار مہم سے الگ کر لیا جائے۔سب سے پہلے ضروری تھا کہ اس فضول حجت بازی کو رد کیا جائے کہ کسی قسم کی عورت سب سے زیادہ بیماری پھیلانے کا موجب ہو سکتی ہے۔سیدھی بات یہ ہے کہ ہر بیمار عورت اور مرد دوسروں کے لئے

وبا کا سرچشمہ ہے۔ سوویت حکومت نے موجودہ اور آئندہ نسلوں پر جنسی بیماریوں کے مضر اثرات پر بڑی سنجیدگی سے غور کر کے ضابطہ فوجداری میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ کر دیا۔ اس قانون کے رو سے قرار پایا کہ آئندہ کوئی شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جنسی بیماری میں مبتلا ہے اور اس سے دوسروں کو بیماری لگ سکتی ہے جنسی فعل کا ارتکاب کرے گا۔ تو اس کی یہ حرکت سنگین جرم شمار کی جائے گی۔ اس طرح جنسی بیماری کے انتقال کو فرد کے ضمیر پر نہ چھوڑا گیا۔ بلکہ ملزم کو ریاست کے سامنے جواب دہ بنا دیا گیا۔

یہاں بھی اشتراکی حکومت صرف قانون پاس کر کے نہیں بیٹھ رہی۔ اس اقدام کے ساتھ ہی باقاعدہ منصوبے کے تحت ملک بھر میں جنسی امراض کی تشخیص کے مرکز اور علاج کے رہائشی شفاخانے کھولے گئے۔

یاد رہے کہ یہ مرکز آج سے تقریباً بیس سال پہلے کھولے گئے تھے۔ اس وقت آتشک اور سوزاک کی تشخیص اور علاج کے طریقے مقابلتہً گھٹیا تھے۔ علاوہ ازیں سوویت یونین اقتصادی مشکلوں میں بری طرح گرفتار تھا اور اس کے لئے ڈاکٹری سامان اور دوائیاں وساور سے منگوانا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کے باوجود یہ شفاخانے اس قدر کامیاب رہے کہ ان کے سامنے ہمارے ہاں کی تمام طبی مہمیں ہیچ ہیں۔

اس کا سبب بالکل واضح اور عام فہم ہے۔ سوویت روس میں ان شفاخانوں یعنی ''صحت گاہوں'' عصمت فروشی اور بدکاری کے انسداد کی مہم کا ایک جزو بنا دیا گیا۔ ان کی کوئی جداگانہ حیثیت نہ تھی۔

ان مرکزوں کو ابتدا ہی سے اس طرح منظّم کیا گیا، جس طرح صحت افزا پہاڑی مقامات پر تپ دق کے اسپتالوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ان میں رہائشی مریضوں اور عام بیماروں، دونوں کا علاج ہوتا تھا۔ مہم کے آغاز میں بڑے بڑے شفاخانوں نے اپنی تمام تر توجہ صرف طوائفوں پر مرکوز کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن پیشہ ور عورتوں کے خلاف ضابطہ فوجداری کو اندھا دھند استعمال نہیں کیا گیا۔ عدالتوں نے ایسی طوائفوں کو بھی پیشہ جاری رکھنے پر سزا نہ دی۔ جنہیں معلوم ہوتا کہ ان سے دوسروں کو بیماری لگ سکتی ہے۔ کیونکہ انہیں ایک ایسی سماجی علت کی شکار مانا جاتا تھا۔ جو ان کے بس کی بات نہ تھی۔

کوئی ملزم طوائف عدالت میں پیشی بھگت چکتی تو اس سے معزز شہریوں کی ایک کمیٹی ملاقات کرتی اور اسے شفاخانے میں داخل ہونے پر راضی کرتی۔ تاکہ کم سے کم اس کی حالت اتنی بہتر ہو جائے کہ اس سے دوسروں کو بیماری لگنے کا احتمال نہ رہے۔

اس طریقے کار پر عمل شروع ہوا تو ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے ہاں کی پولیس اور ڈاکٹر اس مسئلے سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایسی عورت کا علاج لاحاصل ہے۔ جو پھر سے پیشہ شروع کر دے اور جلد ہی دوبارہ بیمار ہو جائے۔

اشتراکی سائنس دانوں نے اس مسئلے کا حل بھی فوراً تلاش کر لیا، انہوں نے زنانہ شفاخانوں کو نئے سرے سے منظّم کیا اور نئے ادارے کھولنے کی بجائے انہی صحت گاہوں کو فنی تربیت کے سکولوں اور ملازمت گاہوں میں بدل دیا۔

تاہم بنیادی مقصد یہی رہا کہ بیماروں کا علاج کیا جائے اور انہیں جلد از جلد شفا حاصل ہو۔ ان شفاخانوں میں مریض عورتوں کا داخلہ جبری نہ تھا۔ ان کی نگرانی کے لیے افسر مقرر نہ کیے گئے اور نہ ہی راز داری کا کوئی خاص پر تکلف اہتمام کیا گیا۔ اس پلان کی خصوصیت یہ تھی کہ علاج کے دوران میں تمام مریضوں کو ایک ایسا پیشہ سیکھنے موقع دیا جاتا جو عام زندگی میں ان کے کام آ سکے۔ چنانچہ علاج کے دوران

میں ہی اکثر مریض کام سیکھ کر روپیہ کمانے لگے۔اس کا نفسیاتی پہلو بالکل واضح ہے۔

سزا، وعظ وتلقین یا نفسیاتی علاج کی بجائے زیر علاج عورتیں علم وفن ملازمتیں اور باعزت روزگار سے روپیہ حاصل کرنے لگیں۔ان مریضوں میں بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو کسی طرح بھی پیشہ ور نہ تھیں۔ وہ ایسی بے روزگار لڑکیاں تھیں جو زار شاہی میں باعزت روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

جب بیمار لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد اس قابل ہو جاتی کہ ان سے دوسروں کو بیماری لگنے کا خدشہ نہ رہتا تو انہیں شفاخانے کی بجائے اپنے گھروں میں سونے کی اجازت دے دی جاتی۔لیکن دن کے وقت تربیت اور مزیدی علاج کے لیے شفاخانوں میں باقاعدہ حاضر ہوتی تھیں،اچھی اور بری عورتوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔تمام مریضوں میں یہ احساس پیدا کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو ایسے شہریوں سے گھٹیا خیال نہ کریں جو آتشک اور سوزاک کی بجائے دوسری بیماریوں مثلاً تپ دق وغیرہ میں مبتلا ہیں اور انہی کی طرح مختلف شفاخانوں میں زیر علاج ہیں۔

اس طرح سوویت یونین کی صحت گاہیں عملاً منظّم بدکاری یعنی تجارت کے خلاف جدوجہد کے مرکز بن گئے۔تھوڑے عرصے میں ماسکو شہر کے شفاخانوں میں پچاس لاکھ روبل سالانہ کی مالیت کی اشیائے استعمال تیار ہونے لگیں۔یہ مرکز لوگوں میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔پہلے پہل راضا کار عورتوں کے دستے چکلوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو شفاخانوں میں مفت ور عورتوں علاج کرانے کی ترغیب دیتے تھے۔رضا کار عورتوں کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح پیشہ ور عورتوں کے دل سے یہ خوف نکالا جائے کہ شفاخانے دراصل نئی قسم کی جیل ہیں۔اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔تو اکثر طوائفیں خود بخود شفاخانوں میں آنے لگیں۔چونکہ اس سلسلے میں جو پروپیگنڈا کیا گیا اس کی بنیاد ان اطلاعات پر تھی جو مشہور سوال نامے کے ذریعے اکٹھی کی گئی تھیں۔اس لیے علاج معالجے کے اس نئے طریقے کو مقبول بنانے کی ہر کوشش حقیقت پسندانہ تھی اور اس کی کامیابی لازمی تھی۔

منتظمین نے جلد ہی یہ فیصلہ کیا کہ جو عورتیں شفاخانوں میں زیر علاج ہیں، وہ کم سے کم دو سال اور وہیں رہیں۔اس دو سال کی مدت شامل نہ تھی۔جو ابتدائی علاج میں صرف ہوئی تھی۔اس فیصلے کے بعد شفاخانوں کے ورکشاپوں کا انتظام جمہوری اصولوں کے مطابق کیا جانے لگا۔عورتوں نے اپنی قوت ایجاد سے کام لے کر خود ایک ضابطہ اخلاق مرتبہ کیا اور اس سے انحراف کرنے والی کے لیے سخت سے سخت سزا یہ تجویز کی گئی اسے شفاخانے سے خارج کر دیا جائے۔

اشتراکی صحت گاہوں کا اصل کام جنسی بیماریوں کی روک تھام تھا۔کیا وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئیں؟

اس کے جواب میں ایک ہی مثال کافی ہے۔جو اعداد وشمار کی بھاری بھرکم کتابوں پر حاوی ہے۔ امریکہ میں جنسی بیماری کے انسداد کی کوشش ایک مدت سے جاتی ہے اس پر بھی امریکہ میں جو صورت حال پائی جاتی ہے۔اس کا مقابلہ ان نتائج سے کیا جائے جو روس میں صحت گاہوں کے قیام کے بعد حاصل ہوئے،جن کا مقصد نہ صرف جنسی بیماری کی روک تھام تھا، بلکہ اس سے بھی بڑے مسئلے کا حل یعنی عام اخلاقی اصلاح کرنا تھا۔تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

امریکہ کے محکمہ صحت عامہ کے منتظمین نے بڑے فخر سے اعلان کیا ہے کہ 1935 سے 1940 تک پانچ سال عرصہ میں جنسی بیماری کے انسداد پر جو دوائیں ریاست میں صرف ہوئیں ان کی

مقدار پہلے سے دوگنا تھی۔لیکن دوسال بعد نتیجہ نکلا کہ جنسی بیماریوں کے متعلق مہم کو تیز تر کرنے اور طریقہ علاج کو بہتر بنانے کے باوجود آتشک اور سوزاک پہلے سے بھی زیادہ پھیل گئے۔

سوویت یونین میں انسدادی مہم کو1926 کے قریب باقاعدہ اور موثر طریقے پر منظّم کیا گیا۔اگلے پانچ سال تک اسے بڑھایا گیا۔1931 کے اختتام تک یہ سکیم اتنی کامیاب ثابت ہوئی، کہ مریضوں کے فقدان کے باعث شفاخانوں کے دروازے بند ہونے لگے،اس کے دوسال بعد جنسی بیماریوں کے خاص انسدادی مرکز بالکل بند ہوگئے۔1938 تک سرخ فوج اور بحریہ سے آتشک اور سوزاک کو بالکل ختم کردیا گیا۔اور شہری آبادی میں بیماری کی حیثیت، صحت کے ایک معمولی مسئلے کی رہ گئی۔کیونکہ اس وقت تک تمام صحت گاہیں بند ہوچکی تھیں اور عصمت فروشی ختم ہوچکی تھی۔

اس حیران کن مہم کی مزید تفصیلات دوسرے ذریعوں سے مل سکتی ہیں۔ڈاکٹر جے۔اے۔اسکاٹ نے1945 میں برطانیہ کے ماہرین کے سامنے سوویت یونین کے کام کا جائزہ لیا جو جنسی بیماریوں سے متعلق برطانوی رسالے کے مارچ1945 کے شمار میں شائع ہوا۔ڈاکٹر موصوف نے بیان کیا، کہ اشتراکی حکومت کے برسراقتدار آنے سے پہلے روس میں صرف تیرہ میڈیکل سکول تھے۔اور آج ستر ہیں۔1914 میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ زار کی سلطنت میں آتشک کی وبا دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہے یاکوت کے علاقے میں تیس فی صد آبادی آتشک میں مبتلا تھی۔ماسکو شہر میں اس کی شرح338 فی ہزار تھی۔اس بیماری کے عام انتشار کے سبب کے علاوہ روس کے ڈاکٹروں کو بعض نئے اسباب کا مقابلہ کرنا پڑا۔یہ سب جنسی اختلاط نہ تھا۔اس مرض کے پھیلاؤ کے دوسرے اسباب ہمہ گیر قسم کی رسمیں تھیں۔مثلاً مقدس تصویروں کو بوسہ دینا، مشترکہ حقہ نوشی اور بچوں کو دانتوں سے چبا کر روٹی کھلانا۔چنانچہ1921 کے بعد ڈاکٹر برنز کو خاص طور سے ان گندی رسموں کے خلاف تعلیمی مہم چلانے کا کام سونپا گیا۔

طوائفوں کے علاج کے لیے جو اقدام کیے گئے ان کے علاوہ ملک کی آبادی میں جنسی وباؤں کے انسداد کے لئے ایک خاص اور وسیع تنظیم بنائی گئی۔ڈاکٹر اسکاٹ کے قول کے مطابق جنسی بیماری کی ڈسپنریاں جن میں سے اکثر حرکت پذیر تھیں۔دوسرے طریقوں سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئیں۔

یہ ڈسپنریاں دراصل باقاعدہ اور مکمل شفاخانے تھے۔اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ چلتے پھرتے شفاخانے سال میں ایک مرتبہ اپنے علاقے کے ہر باشندے کے پاس ضرور گئے۔چھوٹی سے چھوٹی ڈسپنسری میں دوطبی ماہر، دوغیر سند یافتہ طبی کارکن، ایک معائنہ کرنے والی عورت، ایک کلرک اور دوار دلی ہوتے تھے، قانون کے رو سے کم سے کم اتنے عملے کا ایک ڈسپنسری میں موجود ہونا ضروری تھا۔ہر ڈسپنسری میں آتشک اور سوزاک کے جراثیم اور مریض کے خون کا معائنہ کرنے کا پورا سامان موجود تھا۔اور ان میں مردوں اور عورتوں کے علاج کے لیے علیحدہ جگہ اور وقت کا انتظام بھی تھا۔کسی زمانے میں وسویت یونین میں چلتی پھرتی قسم کے تقریباً دو ہزار شفاخانے تھے، جنسی بیماریوں کے انسداد کے بعد انہی ڈاکٹروں نے ان شفاخانوں میں جلد کی متعدی بیماریوں کی تشخیص اور علاج کا کام شروع کردیا۔

ان ڈسپنسریوں کے اسٹاف کے ذمے طبی اور سماجی دونوں قسم کے کام تھے۔یہ لوگ جنسی بیماری، عصمت فروشی اور عام جنسی مسائل پر لیکچروں اور مختصر عرصے کے تدریسی نصابوں کا انتظام کرتے تھے۔ فلموں، اشتہاروں اور نمائشوں کے ذریعے عوام کی حمایت حاصل کی جاتی تھی، اسی کام کا نتیجہ تھا کہ عوام کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت، نفرت اور مزاحمت نہیں ہوئی۔اور ہمہ گیر ڈاکٹری معائنے کرنے میں خاطر

خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ جولوگ ایک مرتبہ شفایاب ہوجاتے تھے۔ان میں سے شاید ہی کوئی جنس بیماری میں دوبارہ مبتلا پایا گیا۔

ڈاکٹر اسکاٹ بیان کرتے ہیں کہ روس میں جوعورتیں یا مرد ارادتاً یا دانستہ بیماری کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ یا دوسروں کو یہ مرض لگاتے ہیں وہ ملک کے قانون کے مطابق چھ مہینے سے تین سال تک سزا کے مستوجب ہیں۔لیکن اختیارات کواستعمال کرنے کی نوبت شاذونادر ہی آتی ہے۔

ڈاکٹر اسکاٹ بتاتے ہیں کہ سوویت یونین میں جنسی بیماریوں کے جدید شفاخانے آرسینی کلز Arsenicals اور سلفانومائیڈرز sulfonamides ہر دو کا استعمال کرتے ہیں۔لیکن یہ بات پنسلین pencillin کی ایجاد سے پہلے کی ہے جنسی بیماری کے علاج کے لیے سوویت یونین کے ڈاکٹروں نے جو دوائیں تیار کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کامیاب دو اگلوکوز ٹرٹیپو سائیڈ glucostreptocid ہے۔ جوگلوکوز مالی کیول glucosemolecule اور سلفانومائیڈ کا مرکب ہے۔

جرمن حملے سے پہلے روس میں آتشک کی ابتدائی اور وبائی صورتوں کا قلع قمع کیا جاچکا تھا۔ یہاں تک کہ 1939 میں ماسکو کے میڈیکل سکولوں میں ڈاکٹری کے طالب علموں کے مشاہدے کے لیے بھی کوئی مریض دستیاب نہ ہوتا تھا، البتہ سوویت یونین میں تیسرے درجے کا آتشک ابھی تک پایا جاتا ہے جو بیماری لگنے کے تیس سال بعد یکا یک پھوٹ پڑتا ہے۔لہٰذا وہاں آتشک کی بیماری کے اس درجے کی تشخیص اور علاج ابھی تک جاری ہے۔

ڈاکٹر اسکاٹ کی رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر آرفارگن نے کہا کہ روس کی فیکٹریوں میں حفظان صحت کا جو وسیع کام ہوا ہے۔اس کا مقابلہ اس کام سے کیا جائے جو آج کل انگلستان میں ہورہا ہے تو روس کی کامیابی ہمارے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری وزارت صحت اور وزارت محنت فیکٹریوں حفظان صحت کے کام کی حوصلہ افزائی کررہی ہیں۔لیکن وہ اپنے منصوبے میں روس سے بہت پیچھے ہیں۔ڈاکٹر موصوف نے دونوں حکومتوں کے طرز عمل کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا کہ دو سال پہلے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ وزارت محنت جس کتابچے کو فیکٹریوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اس میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ جس مرد یا عورت کو جنسی بیماری کا شبہ ہو۔اس کے لیے ڈاکٹر سے مشہور طلب کرنا یا کسی شفاخانے میں جا کر تشخیص کرانا ضروری ہے، ۔لیکن وزارت محنت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

ایک اور ماہر نابیرو نے اس مہم کا حوالہ دیا جو روس کے دیہات میں جنسی امراض کے انسداد کے لیے چلائی گئی اور بیان کیا کہ اگر سوویت یونین جیسے وسیع ملک میں ایک ایسی صورت حال پیدا کی جاسکتی ہے تو بشرط ارادہ برطانیہ عظمیٰ جیسے چھوٹے سے ملک میں ایسی مہم بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے۔لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں نیت ہی نہیں۔عمل کا تو ذکر ہی کیا۔

ظاہر ہے مندرجہ بالا حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔تمام سرمایہ دار ملکوں کے سائنس دان اور صحت عامہ کے منتظمین جنسی بیماری پر قابو پانے کے لیے تحقیق اور علاج کی ہر سہولت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہیں۔وہ سوزاک اور آتشک کے لیے ایک دن اور ایک ہفتے کے موثر علاج دریافت کرنے کوشش میں کوشاں ہیں۔ چونکہ شہری آبادی کی بہ نسبت افواج میں سخت اقدام کرنا سہل ہے۔اس لیے انہیں افواج

میں قدرے کامیابی رہی ہے۔لیکن ان کے سامنے مستقبل اور مقصد کیا ہے؟

ہمارے ہاں کے سائنس دان رفتہ رفتہ اس رائے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ جو1943 میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ کے ایک افسر ڈاکٹ راجرای ہیرنگ نے نیویارک کی تپ دق اور صحت کی انجمن کے سامنے پیش کی تھی۔

''جنسی بیماری پر قابو پانے کے کام میں کسی پراسرار شعیدہ بازی کی ضرورت نہیں بلکہ مسئلے کی اہمیت کے احساس، بیماری کے خاطر خواہ علم، انسانی خدمت کی معمولی سی واقفیت اور اس یقین کی ضرورت ہے کہ کچھ کیا جاسکتا ہے اور ضرور کرنا چاہیئے۔''

اس نے یہاں تک کہہ دیا ''کہ یہ بیماریاں چھوت کی بیماریاں ہیں۔ ذلت کی بیماریاں نہیں۔ طوائف جرائم پیشہ نہیں۔ وہ تو ایک سماجی مسئلہ ہے جو پہلے ہی ایک طبی مسئلہ بن چکی ہے یا جلد ہی بن جائے گی۔ مجرم اس کی لوٹ کھسوٹ کرنے والے ہیں''۔

مندرجہ بالا بیان کو جنسی بیماری کے خاتمے کے پروگرام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تاہم اس میں چند بنیادی امور کو ضرور چھوا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہیرنگ نے اس واہیات مقالے کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دلائی جسے مسٹر پال ڈی کروئف نے ایک رسالے میں ''آتشک کا یک روزہ علاج'' کے عنوان کے نام نہاد ترقی یافتہ طریقے اس خوف کو مٹا رہے ہیں جو بسا اوقات جنسی بیماری کو روکنے میں موثر ثابت ہوتا ہے۔1944 میں امریکی محکمہ صحت عامہ نے اعلان کیا کہ امریکہ کی شہری آبادی میں سوزاک کی بیماری میں گیارہ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ غالباً اس کا سبب علاج کے ان سنسنی خیز طریقوں کا پراپیگنڈا ہے جن میں زود اثر دوائیں استعمال کی جاتی ہیں''۔

تجربہ شاہد ہے کہ طبی تحقیقات نے جنسی بیماری کے علاج کے طریقوں کو بہتر بنایا تو اس کے ساتھ ہی بیماری کا خوف کم ہو جانے کی وجہ سے اخلاقی دباؤ کمزور پڑ گیا۔ اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ طبی سرگرمیوں کو تیز تر کر دینے کے باوجود بیماری میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ایک ایسی دوا کی ایجاد کے لئے بڑے پیمانے پر تجربے کیے جا رہے ہیں۔ جس کو استعمال کر کے بازاری عورت کے پاس جائیں تو آتشک اور سوزاک کی بیماری لگنے کا ڈر نہ رہے۔ ان کوششوں کا زنا اور عصمت فروشی پر جو اثر پڑے گا۔ وہ ظاہر ہے۔ یہ کتنا تکلیف دہ امر ہے کہ ہمارے بہت سے طبی ماہر جو صحت عامہ کو بہتر بنانے کی غرض سے جنسی وبا کے مسئلہ میں بری طرح مصروف ہیں، وہ اتنے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کہ عصمت فروشی کی محض اس لیے مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے جنسی بیماری پھیلتی ہے۔ بعض ڈاکٹر تو بدکاری اور بداخلاقی کے وسیع مسائل پر غور کرنے کو بھی حماقت تصور کرتے ہیں اور مصر ہیں کہ ان مسائل سے سائنس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ دلیل غیر شعوری طور پر اس مکروہ عیاری کی حمایت میں جاتی ہے۔ جو آج بھی جنسی بیماری کے خلاف قومی پیمانے پر انسدادی مہم چلانے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ ہم برطانیہ کی وزارت محنت کے رویے پر ڈاکٹر نارگن کی تنقید اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اس قسم کا رجحان برعظیم امریکہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ نیویارک سٹیٹ میڈیکل جرنل کے مارچ1943 کے شمارے میں بتایا گیا کہ جب ہیلتھ کمشنر، ڈاکٹر ارنسٹ ایل اسٹینز ے سکولوں میں حفظان صحت کی تدریس کی تجویز پیش کی تو اعلیٰ تعلیم کے بورڈ نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اس کے ایک سال بعد امریکی محکمہ صحت عامہ اور دفتر اطلاعات جنگی کو سماجی بیماریوں کے انسدادی طریقوں کی عام تعلیم کی نئی اور حوصلہ افزا مہم منسوخ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مذہبی

مشیروں کے ایک گروہ نے اس فلم کی تجارتی تھیٹروں میں تقسیم روک دی جس کا نام ''امریکی عوام سے'' تھا۔ اور جس میں جین ہرشولٹ نے کام کیا تھا۔ اور جسے والٹر دینگر نے تیار کیا تھا۔ لہٰذا ساری مہم شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔

ماہ ستمبر میں امریکی محکمہ صحت عامہ اور دفتر اطلاعات جنگی نے رائے عامہ کو دوبارہ باخبر بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ڈاکٹر پیرن نے مجلس نشریات جنگی سے خط و کتابت بھی کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ مجلس اس وقت اس وقت تمام بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں نشر و اشاعت کی مہم چلا رہی تھی۔ لیکن اس پر سخت دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اس کام کو ترک کر دے۔ اس ضمن میں جو اشتہارات تیار کیے گئے تھے۔ ان پر اشاعت سے پہلے ہی گندے، اخلاق سوز اور مکروہ ہونے کا لیبل لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر پیرن نے جواب میں کہا کہ یہ سکیم سائنسی بنیادوں پر تیار کی گئی ہے۔ جنسی اخلاق سکھانا گھر، اور سکولوں کا اہم فریضہ ہے۔ چونکہ یہ وبائیں بے حد خطرناک ہیں۔ اس لیے جنسی بیماریوں سے نپٹنا صحت عامہ کے اداروں کی ذمہ داری ہے۔ میں پرزور سفارش کرتا ہوں کہ اس مہم کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے اور شہریوں کا تعاون حاصل کرنے کی اجازت دی جائے''۔

مجلس نشریات جنگی نے جواب دیا کہ ہمیں ''جنسی بیماری کی نزاکت اور خطرے کا پورا احساس ہے، لیکن اس مہم کی متنازعہ فیہ نوعیت کے پیش نظر'' ہم مجبور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ایسی نیک مہم کے سبوتاژ کی جتنی بھی مذمت کی جائے تھوڑی ہے۔ دراصل عام تعلیم کی بجائے سازشی لوگ ہی مکروہ اور اخلاق سوز ہیں۔ خیز ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان حضرات کے ارادے خواہ کچھ بھی ہوں۔ انہیں اپنی مکروہ حرکتوں کے لیے تمام تر مواد اس افسوسناک ذہنی الجھاؤ سے ملتا ہے جو طبی حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ زار شاہی روس میں جو صورت حال پائی جاتی تھی۔ اس کا مقابلہ ان حقائق سے کرنا دلچسپی سے خالی نہیں جو ہمارے ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے چوری چھپے گھروں میں دھندا کرنے والی عورتوں سے جتنے مردوں کو بیماری لگی تھی۔ ان کی تعداد ایسے مردوں سے دگنی تھی جن کو بازاری عورتوں سے بیماری لگی تھی۔ حالانکہ اول الذکر عورتوں پر سخت قسم کی طبی نگرانی تھی۔ اور دوسری پابندیاں عاید تھیں آج کل ڈاکٹری معائنے کے فن اور علاج میں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن صورت حال کیا ہے؟

جنسی بیماری کے مذکورہ بالا اسباب کا مطالعہ حال ہی میں امریکی محکمہ صحت کے ایک افسر ڈاکٹر بانکوم جانسن نے کیا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ چکلوں کے سرپرستوں کو جنسی بیماری سے محفوظ رکھنے میں جدید ترین طریقے بھی ناکام رہے ہیں جو لوگ روس کے زرد پٹے کے نظام کا حال پڑھ کر حیران اور خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے مذکورہ نتیجہ جنگ کے دوران میں ٹیکساس کے شہر الپاسو کی صورت حال کے مطالعے کے بعد نکالا تھا۔ اس شہر میں کبھی عصمت فروشی کے نو اڈے تھے۔ اور وہ ان سپاہیوں کی جیب سے روپیہ کھینچ رہے تھے جو قریب ہی قلعہ بلس میں تربیت پا رہے تھے۔ فوجی افسروں نے اڈوں کو جبراً بند کر دیا تو یہی اڈے سرحد پار، میکسیکو کے شہر جوار یز میں منتقل ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد اطلاع ملی کہ فوج میں جنسی بیماری کم ہوگئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر جانسن نے دو حیران کن حقائق کا انکشاف کیا۔ اس نے اپنی رپورٹ، ''جنسی بیماری سے متعلق'' جلد نمبر 23، مطبوعہ جنوری 1942 میں بتایا کہ ''عصمت فروشی'' کے اڈوں کو سرکاری طور سے بند کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپتالوں کے ڈاکٹروں نے جنسی بیماری میں معتدبہ کمی کی رپورٹ دی۔ لیکن ساتھ ہی زیر علاج سپاہیوں کی

تعداد بڑھ گئی۔

اعداد وشمار کے اس تضاد کی تشریح بالکل آسان ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے خیال کیا کہ وہ اڈے در حقیقت بند ہو گئے۔ حالانکہ ہوا صرف یہ کہ ان کے مالک ان اڈوں کو ٹیکساس کی سرحد کے پار لے گئے۔ اور ڈاکٹروں نے اس خوف سے رپورٹ میں نئے مریضوں کی تعداد بتانے میں تامل کیا کہ یہ امر فنی نقطہ نظر سے درست نہ تھا۔ تقریباً ہر شہر میں سالہا سال سے دیکھا جاتا ہے کہ بدکاری کے خلاف پولیس ذرا سخت رویہ اختیار کرلے تو حقائق کو بالکل اسی طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ چکلے بند کر دئے جاتے ہیں۔ تو اس کے بعد زود یا بدیر پہلے مقام کے حدود سے باہر حسب معمول کاروبار جاری ہو جاتا ہے۔ یا پھر شراب خانون، ناچ گھروں، سیاحوں کے کیمپوں وغیرہ میں دھندا شروع ہو جاتا ہے، پولیس کا تشدد بہت بڑھ جائے تو بدمعاشی اور بدکاری کے جدید ناظم کرائے کی گاڑیوں میں چلتے پھرتے اڈے قائم کر لیتے ہیں۔ بیمار عورتوں کو اس طرح منتشر کرنے اور تمام قوم کے لیے خطرناک نتائج پیدا کرنے کے واقعات کے علاوہ ہم اوپر ایسے اعداد وشمار بھی درج کر چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں پیشہ ور عورتوں کی بجائے وکٹری گرلز سے بیماری لگتی ہے۔

روس میں جنس کی باقاعدہ تجارت ہوتی تھی۔ اس نظام میں اور اس بدکاری اور بدمعاشی میں جو ہمارے ملکوں میں دن رات ترقی کر رہی ہے، عملاً کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ روس میں بدکاری پر سخت وحشیانہ نگرانی تھی اور عصمت فروشی کے وجود کے عام تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن ہم اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ہمارے سماج کے بالکل نچلے طبقوں میں ہی عصمت کی تجارت ہوتی ہے۔ آجکل ہم اتنے سائنس پرست ضرور ہو گئے ہیں کہ آتشک اور سوزاک کے متعلق بلا جھجک پڑھنے اور بات چیت کرنے لگے ہیں۔ لیکن ہم اس سے آگے نہیں بڑھتے، ہمارے ڈاکٹر بڑے دھڑلے سے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عقل اور سائنس کے پجاری ہیں۔ ان کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آج تک عام فریب کاری اور خوش فہمی کو طبی زبان کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ ہمارے اجداد کے زمانے کی واہیات مہموں کو دہرا رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ احیا پرستانہ وعظ سے کام لیتے تھے اور ہم زود اثر ادویات اور پنسلین سے کام لیتے ہیں۔

جس پریشان کن ذہنی الجھاؤ کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس سے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل یہ مضحکہ خیز بحث جاری ہے کہ منظور شدہ چکلوں میں جو بدکاری ہوتی ہے وہ مقابلتہً کم خطرناک ہے۔ یا وہ بدمعاشی جو ایسے خلاف قانون اڈوں میں جاری ہے جنہیں پولیس خفیہ یا ظاہری طور پر برداشت کر رہی ہے۔ اس بحث کا مقصد اس مکروہ تکرار پر دہ ڈالنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کہ ہم کیسے جی بھر کر عیاشی کرنے کے باوجود جنسی بیماری سے محفوظ رہیں

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ آج سے کافی عرصہ پہلے زار شاہی روس میں اس بحث کو اپنے آخری اور تلخ نتیجے پر پہنچا کر دم لیا گیا۔ ذرا بنیادی امور کو لیجئے جنسی بیماری کس طرح لگتی ہے؟ ابتداً جنسی فعل سے۔ مرد اور عورت اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مردوں اور عورتوں کو صفحہ ہستی سے مٹایا نہیں جایا سکتا، ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ انہیں نظر بند کرنا بھی محال ہے۔ انہیں ہسپتالوں میں بھی بند نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ لاکھوں مریضوں کے لیے بے شمار اداروں کی تعمیر و تنظیم ناممکن ہے اور بیمار اشخاص کو دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے سے روکنا بھی آسان کام نہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ ہمیں اسی شیطانی چکر

میں الجھائے رکھتا ہے۔

اس مایوس کن صورت حال سے یہ عقیدہ جنم لیتا ہے کہ منظّم بدکاری، یعنی عصمت کی تجارت اور جنسی بیماری، ہر دو ابدی چیزیں ہیں۔ لیکن ہم آج کل کے ترقی یافتہ اور جدید مہذب زمانے میں یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ آتشک اور سوزاک جیسے ہلاک آفرین طاعون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ لہٰذا طبی نقارے پر چوٹ پڑتی ہے اور ہم دوبارہ اسی چکر میں پھنس جاتے ہیں۔

گذشتہ دو برس میں ایک بالکل نیا اور نازک سا واقعہ رونما ہوا ہے، جس سے جنسی بیماری کے متعلق رائے عامہ اور الجھ گئی ہے۔ ہمارے ڈاکٹر ایسے سفید پوش مجاہد تو نہیں ہیں 'جن کا سائنسی تقدس کسی شبہ سے بالا ہو۔ اس لیے طبی تحقیقات نے خاص طور سے جنسی بیماری کے معاملے میں انوکھا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ان میں سے ایک تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ بدکاری اور بدمعاشی کو تمام مردوں، عورتوں اور نوجوانوں کے لیے بے ضرر بنا دیا جائے۔

جو پادری فوجوں میں ملازم ہیں وہ اس تحقیق کو بڑی تشویش ناک نظر سے دیکھتے ہیں' کسی قاری کو حقیقت حال کا پورا علم نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ امریکی فوج کے دو ڈاکٹروں، کرنل ولیم ڈنٹسن اور کیپٹن جیمز لولیس کی رپورٹ کا مطالعہ کرے جو امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے سرکاری ترجمان کے 13 مارچ 1943 کے شمار میں چھپی ہے۔ اس سائنسی رسالے میں اس تجربے کا ذکر ہے جو پانچ ہزار امریکی سپاہیوں پر کیا گیا۔ اس پیشتر کہ یہ سپاہی اتوار منانے کے لیے قلعہ چھوڑتے، انہیں جدید ترین مانع مرض دوائیں استعمال کرائی جاتیں۔ چنانچہ مشاہدہ کیا گیا کہ جن سپاہیوں کو یہ دوائیں استعمال نہیں کرائی گئی تھیں ان کے مقابلے میں اول الذکر گروہ کے بہت کم سپاہیوں کو یہ بیماری لگی۔ اب اس طریقے کو مزید آزمایا اور بہتر بنایا جا چکا ہے لیکن اس کی اشاعت نہیں کی جا رہی۔ ''ماہرین'' کا خیال ہے کہ یہ تجربہ مکمل ہو گیا تو جنسی بیماری پر قومی پیمانے پر کنٹرول کیا جا سکے گا۔

ہمارے رائے میں عصمت فروشی، بدکاری اور نوجوانی کے جرائم کا انسداد قطعاً ناممکن ہو جائے گا۔ ہم اس طبی طریقے کو قبول کر لیں تو کسی قسم کے کنٹرول کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ فوجی ڈاکٹروں میں دن بدن یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ سماجی اصلاح کے ادارے بدکاری کے خلاف اپنی تمام سرگرمیوں ترک کر دی۔ پیشہ ور شوقین طوائفوں کے خلاف مزید اقدام کرنا بند کر دیں۔ اور جنسی بیماری کے انسداد کے لیے حفاظتی دواؤں کا آزادانہ استعمال کریں۔ ایک مکتبہ خیال سے تعلق رکھنے والے سائنس دان تو ایسا فیصلہ کر بھی چکے ہیں۔ اس مکتبہ خیال کے حامی اپنا پراپیگنڈا ابھی احتیاطاً ذاتی بحث مباحثے تک ہی محدود رکھتے ہیں اور رسالوں میں مبہم طبی اصطلاحات اور تراکیب کے پردے میں اپنے مقصد کا پرچار کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی وہ زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جمہوری ممالک کے اس فوجی اور طبی اخلاقیات کے تباہ کن پہلو کے خلاف اگر کسی نے آواز بلند کی ہے تو وہ صرف فوجی پادریوں کی ذات ہے۔

صرف ایک لحاظ سے وہ سوویت یونین کے سرکاری نقطہ نظر کے قریب ہیں اور ہم بلا خوف مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید پادریوں کے گناہ کے متعلق نظریئے اور بداخلاقی کے بارے میں اشتراکی نقطہ نظر میں صرف ایک ہی اختلاف کا پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے نظریے کی ایمانداری سے تبلیغ کی جاتی ہے۔ اور دوسرے نظریے پر کامیابی سے عمل ہو رہا ہے۔

مہینے میں پانچ کروڑ مرتبہ

بدکاری کے خلاف سوویت یونین کی انسدادی جدوجہد کا مزید جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنسی بیماری یعنی آتشک کے تدراک کے لیے آج تک جو کچھ امریکہ میں کیا گیا ہے اس کے باقی ماندہ حصے کو بیان کر دیا جائے پرل ہاربر کے واقعہ سے لے کر آج تک امریکہ کے مختلف قدرتی خطوں میں جنسی بیماری کے خلاف جدا جدا مگر وسیع پیمانے پر مہمیں چلائی گئی ہیں۔ یہ مہمیں سوویت یونین کی جدوجہد سے کئی طرح مختلف ہیں۔ خاص فرق یہ ہے کہ امریکی شہروں میں تمام تر توجہ جنسی بیماری کے طبی علاج پر مرکوز رہی، اور سوویت یونین میں سماجی بیماری کے سماجی محرکات کا دور کرنے پر زور دیا گیا۔

ابتدائی اقدامات میں وہ مہم خاص طور سے قابل ذکر ہے جو شہر سیکرمنٹو کے محکمہ صحت نے اگست 1941 میں شروع کی۔ اس وقت جنسی بیماری کی ہولناک وبا کا الزام طوائف اور وکٹری گرل پر دھرا جاتا تھا۔ چونکہ پولیس اور ڈاکٹر جن اقدامات کی سفارش کرتے تھے، ملک کا قانون ان پر عمل درآمد کی اجازت نہ دیتا تھا، اس لیے محکمہ صحت نے اس ہنگامی مسئلے کو نرالے طریق پر سلجھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جنسی بیماریوں یعنی آتشک اور سوزاک کے لیے ایک تجربہ گاہ کھولی گئی، اور شہر کے تمام مردوں ورعورتوں کو فوری توجہ کے لیے بلایا گیا۔

اس اقدام سے کیا مقصود تھا؟ اس کا جواب نہایت سیدھا سادا ہے یہ مرکز شام کے سات بجے سے صبح کے تین تک کھلا رہتا تھا۔ کیونکہ انہی ساعتوں میں اکثر مرد بازار جاتے تھے۔ اس میں ایک ڈاکٹر ہر وقت حاضر رہتا تھا اور اس کے پاس ایسی دوائیں ہر وقت موجود رہتی تھیں، جو آتشک اور سوزاک کی بیماری لگ جانے کے فوراً بعد مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ ''رفاہ عامہ'' کا یہ مرکز کتنا قابل نفرت تھا! یہ ایک عمارت کے سب سے نچلے کمرے میں واقع تھا، جس کا دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا! دروازے پر ایک سائن بورڈ لٹک رہا تھا، جس پر ''انسدادی مرکز'' کے حروف لکھے تھے۔ ان حروف پر سبز روشنی پڑتی تھی۔ مرکز کے اندر مختصر سا سامان تھا۔ تاہم دن کے وقت محکمہ صحت کے ملازم مزید دوائیں لے آتے تھے اور علاج معالجے کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے۔

نشر واشاعت دو طریقوں سے کی گئی۔ اولاً، تمام طوائفوں اور آوارہ عورتوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ وہ بیماری کی شرح کو اگر اس سطح سے نیچے رکھنا چاہتی ہیں۔ جس پر پولیس کے لیے چھاپہ مارنا لازمی ہو جاتا ہے، تو انہیں چاہیئے کہ اپنے خریداروں کو نصیحت کریں۔ کہ وہ ہم آغوشی کے بعد احتیاطاً انسدادی مرکز کا رخ کریں دوسرا طریقہ قدرے پیچیدہ تھا۔ سینکڑوں اشتہارات چھپوائے گئے اور ناچ گھروں، سرکاری دفتروں، شراب خانوں وغیرہ پر چسپاں کیے گئے۔ ان پر مختصر سی عبارت درج تھی:۔

''جنسی بیماریوں کو روکا جا سکتا ہے۔

۔خیراتی اسپتال۔

پندرہ منٹوں کے اندر۔

محکمہ صحت کے خیراتی شفاخانوں میں جایئے۔

شفاخانہ فلاں جگہ ہے

تربیت یافتہ ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہے''۔

یہ شفاخانہ کھلنے کے بعد چار مہینوں کے اندر تقریباً چار ہزار مرد اس میں داخل ہوئے ان میں تقریباً

نصف شہری تھے اور نصف فوجی، ان کے قول کے مطابق بازاری عورت سے بیماری لگنے اور ہسپتال سے حاضری کے درمیان اوسطاً پندرہ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ چونکہ سخت راز داری ملحوظ تھی۔ اس لیے مریضوں کے متعلق کوئی ریکارڈ نہ رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس امر کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ یہ شفاخانے آتشک اور سوزاک کو روکنے میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہے ہیں۔ تاہم شفا پانیوالوں کی فی صد شرح کافی تھی۔ ان شفاخانوں میں مریض سے صرف یہ دریافت کیا جاتا تھا کہ اس نے کسی بازاری عورت سے فعل کیا تھا یا کسی پیشہ ور سے۔ یا عام شوقین عورت سے اور جواب محکمے کے رجسٹر میں درج کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ کسی قسم کے اعداد و شمار جمع نہ کیے جاتے تھے۔ اور علاج کے موثر یا ناکام رہنے کا کوئی اندازہ نہ لگایا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ سکیم بنیادی طور سے غیر سائنسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شہر سکریمنٹو کے شفاخانے کے ڈاکٹر رسل فرانظر نے رسالہ اطلاعات امراض جنسیہ کے شمارہ بابت ماہ اگست 1942 میں اپنی رپورٹ شائع کی تو وہ اس شستہ بیان سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کہ ''موثر مانع امراض کیمیائی دواؤں کو وسیع پیمانے پر رائج کرنے اور شفاخانوں کے قیام کا مسئلہ کافی غور طلب ہے''۔

دوسرے شہروں میں جو تجربے کئے گئے وہ بھی اسی قسم کے تھے۔ لہٰذا ان کے ذکر کے اعادے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ 1944 میں صورت حال یکسر بدل گئی۔ پنسلین کی وسیع پیمانے پر تیاری اور ہر دو جنسی امراض آتشک اور سوزاک میں اس کے کامیاب اور موثر استعمال سے ایک مرتبہ پھر نہ صرف جنسی بیماریوں کے انسداد بلکہ ان کے قطعی خاتمے کی توقع پیدا ہوگئی۔ فوج اور بحریہ میں ہزار ہا مردوں پر تجربہ کیا گیا اور اس دوا کے اثرات کا گہرا مشاہدہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بہ یک وقت بے شمار بیماروں کے معائنے کے طریقے پہلے سے زیادہ مکمل اور بہتر ہو گئے۔ اس لیے طبی اور سماجی اعتبار سے اس بات کا امکان پیدا ہوگیا کہ جنسی بیماریوں کے خلاف بڑے پیمانے پر مہمیں چلائی جائیں۔

سب سے پہلی مہم کا بندوبست ایلا باما میں کیا گیا۔ 1943 میں امریکی پارلیمان کا ایک ممبر بروس ہینڈرسن جو ضلع کوکس کا امیر جاگیردار تھا۔ یہ قانون منظور کرانے میں کامیاب ہوگیا کہ چودہ اور پچاس سال تک کی عمر کے باشندوں کے لیے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانا لازمی ہے۔ ایک اور قانون کے ذریعے لازمی قرار پایا کہ معائنے کے بعد جو لوگ آتشک کے مریض نکلیں وہ اپنے گھرانے کے ڈاکٹر سے یا سرکاری ہسپتال میں مفت علاج کرائیں۔ یاد رہے کہ اس قانون کو قانون ساز اسمبلی نے بڑی قیل وقال کے بعد پاس کیا کیونکہ اس کے خواب میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بیمار اتنی پھیل چکی ہے کہ اس کے خلاف ایسی سخت او روسیع جدوجہد کی ضرورت ہوگی جو دیکھنے میں آئی۔

مسٹر ہینڈرسن کے سامنے ایک واضح مقصد تھا اس کی جاگیر بہت بڑی تھی اور اس کے تمام رعیت جنسی بیماری میں مبتلا تھی لہٰذا ان کے علاج میں ایسے نفع آیا ہر سال اس کے حبشی مزدوروں کے خون کا معائنہ مفت ہونے لگا تو اس کے طبی اخراجات کی مد میں 75 فیصد کمی ہوگئی لہٰذا موصوف نے محسوس کیا کہ اسی طرح ریاست کے تمام قانون سازوں کے طبی اخراجات میں کمی ہوسکتی ہے۔ خون کے معائنے کے اخراجات کے لیے پچھتر ہزار ڈالر کی رقم منظور کی گئی اور سب سے پہلا تجربہ برمنگھم جیسے بڑے شہر میں کیا گیا۔ اس شہر کی آبادی 50 ہزار کے قریب تھی۔ جن میں 40 فیصد حبشی تھے۔ جو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کا شکار تھے۔ اور یہ انسانی لوٹ کھسوٹ جنوبی ریاستوں کا خاصہ ہے وہاں حبشی آبادی پر پول ٹیکس عائد ہے اور ان کا معیار زندگی اور تعلیم بہت ہی پست ہے البتہ یہ مہم کالے اور گورے دونوں قسم کے لوگوں کے لئے

چلائی گئی۔

نشر واشاعت میں سنسنی خیز طریقوں سے کام لیا گیا۔ بڑے بڑے بازاروں میں ہر کہیں بڑے بڑے اشتہار لگائے گئے کہ ''پنسلین سب سے بڑے موذی' مفلوج اور بانجھ کر دینے والے مرض سوزاک کو چار گھنٹوں میں ختم کر دیتی ہے''۔

''پنسلین کے استعمال سے آتشک کا علاج 9 دن میں ہوسکتا ہے''۔ وغیرہ وغیرہ نوٹس بورڈ' شوکارڈ' کاریں ہر آدھ گھنٹے کے بعد ریڈیائی اعلانات غرضیکہ تجارتی پروپیگنڈے کی طرح ہر طریقے اور ذریعے سے کام لیا گیا۔ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ اور افواج کے محکمہ حفظان صحت نے پورے تعاون سے کام کیا۔ بڑے بڑے ہیلتھ افسروں نے مہم میں حصہ لیا جن کی مدد کے لئے ہزاروں رضا کار عورتیں، لڑکیاں اور مرد نکل آئے اور انہیں تجارتی چیمبروں، ٹریڈ یونینوں، عورتوں کے کلبوں، حتی کہ کلیساؤں تک بھرتی کیا۔

اس وقت لوگوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہی برمنگھم جہاں چند سال پیشتر آتشک اور سوزاک کے الفاظ سن کر شریف شہریوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ وہاں بیماریوں کے خلاف اس طرح جہاد شروع ہوا۔ گویا یہ ایک مدت سے معاشرے کا جزو بن چکی تھیں، اخباروں نے اس نعرے کو خاص طور سے اچھالا کہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے معائنہ گاہ میں ملئے۔

یہ مہم وسط مئی سے جون کے آخر تک جاری رہی اور یہ دنیا کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی مہم تھی اس سے پہلے خون کے معائنے کا بندوبست پیمانے پر نہ کیا گیا تھا۔ ہل مین میونسپل اسپتال میں ایک خاص ڈسپنسری کھولی گئی وہاں کے سابقہ کفن گودام میں معائنہ خون کی دنیا بھر میں سب سے بڑی تجربہ گاہ قائم ہوئی۔

یہ تجربہ گاہ جلد ہی ''willow run'' (ولورن) کے نام سے مشہور ہوگئی اس کا سبب کام کی تیز رفتاری تھی کیونکہ اس میں سول اور فوجی ماہرین ایک دن میں دس ہزار اشخاص کے خون کا معائنہ کر ڈالتے تھے۔ بیالیس دن کے عرصے میں تین لاکھ اشخاص کا معائنہ کیا گیا۔ خون مختلف مقامات پر حاصل کیا جاتا تھا اور اس کے بے شمار نمونے کرائے کی گاڑیوں میں مذکورہ تجربہ گاہ میں روزانہ لائے جاتے تھے۔ معائنہ منیر ینی کے طریق خوردبینی پر کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ سو فیصدی کامیاب نہ سہی لیکن اس وقت کے حالات میں موزوں ترین تھا۔ کیونکہ اس میں بہت کم وقت صرف ہوتا تھا۔ اور تفصیلی معائنے کا طریق قابل عمل نہ تھا۔ رضا کار عورتوں کو ایک دن میں 2 ہزار نالیوں اور 12 ہزار نلکیوں کو گرم پانی میں جوش دے کر جراثیم سے پاک کرنا پڑتا تھا۔

ظاہر ہے کہ خون کے نمونے کے تعین کا کام بہت زیادہ تھا۔ ہر معائنہ گاہ گویا الیکشن بوتھ تھا۔ ایک کلرک ہر شہری کا نام، پتہ، عمر، فون نمبر درج کرتا تھا اور اس کے بعد اسے ایک شیشے کی نالی ور ایک سفید کارڈ دے دیتا تھا۔ ان دونوں پر ایک ہی نمبر لکھا جاتا تھا، تاکہ دوسروں کی نالیوں او کارڈوں میں مل نہ جائیں۔ نالی خون کے معائنے کے کام آتی تھی اور کارڈ معائنے کا ثبوت تھا۔ چند دوسرے کلرک اسی قسم کے رنگین کارڈ تیار کرتے تھے، جن پر وہی اندراج کئے جاتے تھے اور ایسے اشخاص کی مزید پیروی کے کام آتے تھے جن کے خون بیماری کے جراثیم نکلتے۔

ہر شخص کے خون کے معائنہ کی تصدیق کے لئے سختی سے تحقیقات کی جاتی تھی، جو شخص پہلے سے بیمار ہوتے ان کے لئے حکم تھا کہ وہ اپنے پرائیویٹ ڈاکٹروں سے اپنے گھروں پر سرکاری ہسپتالوں میں

معائنہ ضرور کرائیں۔ تمام شہری آبادی کے خون کے معائنے کی تصدیق کے لئے مذکورہ بالا کارڈوں کا راشننگ دفتر کے ریکارڈ سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ گویا معائنے سے بہت کم لوگوں کو بچ نکلنے کا امکان تھا اور جان بوجھ کر معائنہ سے بھاگنے والوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔

تجربہ گاہ کی رپورٹ معائنے سے 48 گھنٹوں کے اندر مرکزی دفتر میں پہنچ جاتی تھی جس کسی شخص کا خون صاف ہوتا اس کا ریکارڈ بند کر دیا تھا۔ جن لوگوں کو معائنے سے تین دن بعد تک محکمہ صحت کی طرف سے کوئی مراسلہ موصول نہ ہوتا وہ جان جاتے تھے کہ ان کا خون صاف ہے۔ لیکن تجربہ گاہ سے مثبت رپورٹ موصول ہوتی تو مریض کی پیروی خاص ماہرین کرتے تھے اور اس شخص کو خاص معائنہ کرانا پڑتا تھا۔

اس مہم کے دوران میں جتنے لوگوں کا معائنہ کیا گیا ان میں 2 لاکھ 90 ہزار کی عمر قانون کی مقرر کردہ حدود کے درمیان تھی۔ بعد میں اندازہ لگایا گیا کہ کل 3 لاکھ اشخاص کا معائنہ کیا گیا جن میں مشکوک قسم کے لوگ اور ایسے اشخاص بھی شامل تھے جن کا دوبارہ معائنہ ہوا اور نوے فیصد اشخاص رضا کارانہ طور پر معائنہ کے لیے آئے۔

ان نتائج سے آتشک سے متعلق ان شماریات کی تصدیق ہوگئی جنہیں ڈاکٹر لوگ کئی نسلوں سے پیش کرتے آئے تھے۔ 2 لاکھ 90 ہزار میں تقریباً 40 ہزار یا 13.7 فیصد اشخاص آتشک کے مریض نکلے۔

ان دنوں علاج کے طریقے بھی تشخیص کے طریقوں کی طرح زیادہ موثر نہ تھے مثبت رپورٹ والے اشخاص کو بعض دوسرے مرکزوں میں جانا پڑتا تھا اور جب بیماری کی تصدیق ہو جاتی تو ان پر علاج اسی صورت میں واجب تھا جب ان کا مرض نام نہاد ابتدائی یا وبائی منزل میں ہوتا لیکن سوزاک کے مریض کی کوئی تشخیص یا معائنہ نہ ہوتا تھا۔ آتشک کے مریض کے دوسرے معائنے کے دوران میں کوئی شخص سوزاک میں بھی مبتلا پایا جاتا تو اسے پنسلین کے ٹیکے لگائے جاتے۔ یہ علاج مفت تھا اور اس کی مدت چار گھنٹے تھی۔

شادی شدہ افراد کی صورت میں، بیوی اور خاوند دونوں کے پنسلین کے ٹیکے لگائے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں سہ افرادی، طریق علاج بھی رائج تھا۔ تیسرے فرد کا علاج بیوی اور خاوند سے علیحدہ مگر اسی دن کیا جاتا تھا۔ آتشک کا علاج زر دیر طلب مگر پیچیدہ تھا، حالانکہ 35 ہزار پرانے مریض ابھی علاج کے لیے منتظر بیٹھے تھے، لیکن سب سے پہلے پرانے مرض والوں کا علاج خاص مرکزوں میں کیا گیا۔ ان مرکزوں میں پنسلین، آرسینی کلز (arcenicals) اور بسموتھ bismouth کی دوا استعمال کی جاتی تھی اور علاج کی مدت نو دن تھی۔

لیکن کچھ عرصے تک یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا یہ مہم کہاں تک کامیاب رہی۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ جنسی بیماری کسی خاص علاقے میں ایک دن کے لئے بھی محدود نہیں رہ سکتی۔ چونکہ ایلا باما میں ہر سال بہت تھوڑے اشخاص کی تشخیص اور علاج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہر علاقے میں الگ الگ مہم چلانا پڑے گی۔ عین ممکن ہے کہ ملحقہ علاقوں س برمنگھم میں بہت سے مریض گھس آئیں اور وہاں دوبارہ بیماری پھیل جائے آج تک صحیح پر معلوم نہیں ہو سکا کہ آتشک کس تیز رفتاری سے پھیلتا ہے۔ توقع ہے کہ یہ مہم آئندہ سال تک اس سوال کا جواب بھی بہم پہنچا دے گی۔

جو تجربہ ایلا باما میں کیا جا رہا ہے اس سے نہ صرف جنسی بیماری کا علاج ہوا ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہ فائدہ ہوا ہے کہ اس برعظیم (امریکہ) میں لوگوں کو جنسی بیماری کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہوگئی

ہے۔تعلیمی افادے کے پیش نظر دوسرے مقامات پر بھی اس تجربے کی تقلید ہونے لگی ہے۔

سوناح (جارجیا) میں جہاں ایلاباما کی طرح کوئی جبری قانون رائج نہیں، ماہ اکتوبر اور نومبر 1945 میں سماجی بیماری پر اس سے بھی زیادہ دلچسپ حملہ کیا گیا، یہ مہم رضا کارانہ تھی اور صحت عامہ کی تاریخ میں بے مثال تھی کیونکہ اس میں آتشک اور تپدق دونوں مہلک بیماریوں کا بہ یک وقت ڈاکٹری معائنہ شامل تھا اور خون کے معائنے کے علاوہ ہر شخص کے سینے کا عکس ریز بھی کیا جاتا تھا۔

خیال ہے کہ یہ مہم برمنگھم والی مہم سے زیادہ کارگر ثابت ہوگی۔نشر واشاعت سے یہ مہم عوام میں بے حد مقبول ہوئی۔بازاروں میں جو اشتہار لگائے گئے ان میں لکھا تھا کہ ''تپ دق کا علاج مرض کے ابتدائی درجوں میں ہی ممکن ہے آج کا عکس ریز کل کا محافظ زندگی ہے''۔

اس مہم کے عروج کے دنوں میں بڑے بڑے مرکزوں میں مردوں اور عورتوں کی لمبی لمبی قطاریں معائنے کے لئے اپنی اپنی باری کی منتظر نظر آتی تھیں۔جنسی بیماری اور تپ دق کا علاج مفت تھا۔

امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل میں اکتوبر 1945 میں جنسی بیماری کے خلاف ایک اور نئی مہم کی خبر چھپی جو آج کل تجربتہً جاری ہو چکی ہے۔آج کل ان مہموں پر پریس میں عام تنقید ہونے لگی ہے اور نئی تجویزیں پیش کی جانے لگی ہیں اس مہم کی تجویز کو پیش کئے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔اس میں کہا گیا تھا کہ حاملہ عورتوں کے خون کا معائنہ کر کے دیکھا جائے کہ وہ آتشک سے متاثر تو نہیں اور جو ہوں ان کا باقاعدہ علاج کیا جائے۔

اس تجویز پر الینائس میں 1939 سے عمل ہو رہا ہے جب کہ وہاں حاملہ عورتوں کے تحفظ کے قانون کا نفاذ ہوا۔پانچ سال کے عرصے میں کوئی ایک ہزار چار سو انچاس عورتیں آتشک کی مریض نکلیں، ان کا علاج ایک ہزار ستاسی ڈاکٹروں نے کیا۔قانون کی رو سے ہر ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ ہر حاملہ عورت کے معائنہ خون کی رپورٹ مرکز کو بھیجے۔خون کا معائنہ لازمی ہے۔خواہ سرکاری تجربہ گاہ ہو یا منظور شدہ پرائیویٹ تجربہ گاہ میں۔مثبت معائنے کی صورت میں رپورٹ کی ایک نقل تجربہ گاہ سے جنسی بیماری انسداد کے محکمے میں بھیجی جاتی ہے۔اس محکمے کی سنٹرل رجسٹری (جہاں سارے محکمے کی ڈاک کی وصولی اور ترسیل کا کام ہوتا ہے) ہر تجربہ گاہ سے باقاعدہ رپورٹ وصول کرنے کی ذمہ دار ہے۔کسی تجربہ گاہ سے رپورٹ موصول نہ ہو تو یاد دہائی کرائی جاتی ہے۔رپورٹ ملنے کی پر متعینہ ڈاکٹر کے پاس آتشک کے علاج کی دوائیں اور محکمہ صحت کا رسالہ دستور العمل بھیجا جاتا ہے۔

الینائس پلان کے آغاز کے وقت سلفونامائیڈز sulfonamides اور پنسلین کا استعمال ابھی شروع نہ ہوا تھا اس لئے عام طور سے جو دوائیں استعمال کی جاتی تھیں، وہ گوشت میں سوئی کے ذریعے داخل کئے جانے والے بسموتھ کے مرکبات اور نسوں میں داخل کئے جانے والے آرسینی کلز کے مرکبات تھے۔حاملہ عورتوں کے آرسینی کلز کے ٹیکے آخری ایام میں لگائے جاتے تھے۔

اس قانون کی بڑی خامی اس کا جبری نہ ہونا ہے کوئی آتشک زدہ حاملہ عورت انکار کر دے تو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔میڈیکل سائنس ثابت کر چکی ہے کہ آتشک زدہ حاملہ عورت کا بچے کی پیدائش سے پہلے علاج نہ کرانا بچے کی موت یا سے بری طرح اپاہج بنانے کے برابر ہے لہٰذا مذکورہ رعایت بہت بڑی غلطی ہے۔

اس کے باوجود یہ قانون بے حد کامیاب رہا۔ساڑھے پانچ سو مریض حاملہ عورتوں میں سے علاج

کے بعد 94 فیصد نے تندرست بچے جنے۔ مریض ماں کا علاج جتنی جلدی شروع ہوا اتنا ہی زیادہ تندرست بچہ پیدا ہوا۔ اس کے برعکس علاج سے بھاگنے والی 355 عورتوں میں صرف 26 فیصد نے تندرست بچے جنے۔

الینائس کے محکمہ صحت کے ڈاکٹر مسٹر ہرمین ایم سولیودے کا بیان ہے کہ

''مشاہدے میں آیا ہے کہ اکثر حاملہ عورتیں بہت دیر سے یا بچے کی پیدائش سے چند ہی روز پیشتر علاج کی درخواست کرتی ہیں''۔ قدرتاً اس سے یہ قانون اور بھی کمزور پڑ جاتا ہے تاہم علاج معالجے کے جدید ترین طریقوں کا استعمال کیا جائے تو اس قانون میں تبدیلی ضروری بھی نہیں رہتی۔ حالانکہ الینائس پلان کے تحت بیشمار مصیبتوں کا ازالہ ہوا ہے لیکن خاطر خواہ نشر و اشاعت نہ ہونے کے سبب اس سکیم کی کامیابی کے باوجود دوسرے شہروں اور ریاستوں میں اس کی تقلید کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔

فوری علاج کے مرکزوں میں حالیہ کامیابی کے سبب بہت سے شہروں میں ترغیب پیدا ہوگی اور وہاں بھی آتشک زدہ لوگوں کے علاج کی زبردست کوششیں کی جائیں گی لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا ضرور ہوگا۔ 1945 کے آغاز میں محکمہ صحت عامہ نے بتایا تھا کہ امریکہ میں فوری علاج کے چھپن مرکز تھے ان میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ مریض علاج کے لئے آتے تھے۔ ان میں سے تقریباً نصف کے قریب آتشک اور نصف سے زیادہ سوزاک میں مبتلا تھے اور کل تعداد کا 20 فیصد دونوں بیماریوں میں مبتلا تھے اگرچہ 1944 کے مقابلے میں زیر علاج عورتوں کی تعداد تگنی سے بھی زیادہ تھی لیکن یہ ان مریضوں کی تعداد کا ایک ادنیٰ سا جزو تھی جن کو ہر سال جنسی بیماریوں لگتی تھیں۔

سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ جنگ کے دنوں میں امریکہ میں ہر سال دس لاکھ افراد کو آتشک اور اس سے کئی گنا زیادہ کو سوزاک کا مرض لگتا ہے اور ہر سال کم از کم 30 ہزار بچے آتشک کی بیماری ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

کیا پنسلین اور دوسری طبی ایجادیں اس صورت حال کی اصلاح کر سکیں گی جنسی بیماری کی صورت پر دو بڑے متضاد محرکات اثر انداز ہو رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ فوری علاج کے مرکزوں کے قیام سے علاج کا زمانہ گھٹ کر ایک چوتھائی اور علاج کا خرچ آدھا رہ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقامی منتظمین بھی مرکز کی امداد کے بغیر جنسی بیماری کے انسداد کا کام شروع کر سکیں گے۔

دوسرا یہ کہ فوج اور بحریہ کی خاص مساعی کی بدولت بیماریاں 1941 سے متعدی صورت اختیار نہیں کر سکیں۔ لڑائی ختم ہوتے ہی عام سپاہیوں کو معطل کر دیا جائے گا تو اس صورت حال کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اس کے علاوہ جو اتحادی فوجیں یورپ میں لڑ رہی ہیں ان میں جنسی بیماری اس قدر پھیل رہی ہے کہ ماہرین طب پریشان نظر آتے ہیں مثال کے طور پر کینیڈا کی افواج میں جنسی بیماری کو تقریباً ختم کر دیا گیا تھا لیکن 1945 کے وسط سے یورپ میں مقیم یا کینیڈا واپس آنے والی افواج میں آتشک اور سوزاک کی شرح اچانک بڑھ گئی اور اتنی ہی تیزی سے جنسی بیماری کینیڈا کے شہروں میں پھیلنے لگی۔

اگرچہ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا فضول ہے لیکن جنگ کے دوران میں جو تحقیقات افواج میں کی گئی اس کی روشنی میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جنسی بیماری کا مسئلہ زمانہ امن میں نازک صورت اختیار کر جائے گا۔ اس تحقیقات کو ڈاکٹر جی ڈبلیو لاری مور اور ٹی ایچ سٹرن برگ نے 1945 میں امریکی رسالہ صحت عامہ میں مختصر بیان کیا ہے۔

امریکی افواج کے 80 لاکھ سے زیادہ سپاہیوں پر جنسی بیماری کے انسداد اور علاج کا تجربہ کیا گیا۔ فوجی منتظمین کو غیر معمولی اختیارات بیحد روپیہ اور سہولتیں حاصل تھیں ۔ آتشک اور سوزاک کے انسداد میں ہر معلوم حربے کو استعمال کیا گیا۔ یہ مہم شہری آبادی میں اس کامیابی سے نہ چلائی جا سکتی تھی، جس کامیابی سے فوج میں چلی۔

1944 میں فوج میں ڈیڑھ کروڑ کتابیں تقسیم کی گئیں جن کا موضوع جنسی بیماری اور جنسی مسائل تھا۔ ان سپاہیوں کی تعداد جن میں لٹریچر تقسیم کیا گیا امریکہ کی کل آبادی کا تقریباً پندرھواں حصہ تھی۔ یہ لٹریچر نہایت اعلیٰ اور دل کش تھا۔ تحریر میں پرانے انداز کے طبی لیکچروں کی بجائے پروپیگنڈے کا عمدہ اسلوب اختیار کیا گیا تھا۔ اس لٹریچر کے اثر کو دوبالا کرنے کی غرض سے بے شمار فلمیں دکھائی گئیں جنہیں ایک کروڑ سپاہیوں نے دیکھا۔

ڈاکٹر لاری مور اور سٹرن برگ جنسی بیماری کے خاتمے کی جدوجہد میں مندرجہ ذیل اسباب کو بہت زیادہ اہم بتاتے ہیں۔

(1) خوف (2) شعور (3) غرور (4) حب وطن

ان کے خیال میں افواج میں طبی اور تعلیمی سرگرمیوں کی ناکامی کے مندرجہ ذیل بڑے اسباب تھے۔

(1) جنسی ترغیب (2) جنسی فلموں، مزاحیہ ڈراموں، ملازمت پیشہ لڑکیوں اور تجارتی اشتہاروں کا خواہش انگیز اثر (3) جنگ کے سبب گھرانوں کا انتشار (4) علاج کے نئے طریقے جن کے طفیل مردوں میں خیال پیدا ہو گیا کہ جنسی بیماری اتنی خطرناک نہیں۔ (5) شراب نوشی (6) عام اخلاقی معیار۔

ان اسباب کا افواج کی تعلیمی مہم پر کیا ردعمل ہوا؟

میں نے اس سلسلے میں سرجن جنرل کے دفتر کے محکمہ انسداد امراض جنسیہ کے افسر اعلیٰ لفٹیننٹ کرنل ٹامس سٹرن برگ سے ٹیلیفون پر بات کی۔ اس نے بتایا۔

''اس سال ماہ نومبر میں گزشتہ سال کے مقابلے میں جنسی بیماری کی شرح تقریباً دوگنی تھی۔ پچھلے سال 30 فی ہزار اور اس سال 60 فی ہزار تھی۔ 1944 می اوسط شرح 33 فی ہزار تھی۔ یوں تو فوجوں میں ہر کہیں جنسی بیماری کی شرح بڑھ رہی ہے لیکن مختلف علاقوں میں اوسط شرح 33 فی ہزار تھی۔ یوں تو فوجوں میں ہر کہیں جنسی بیماری کی شرح بڑھ رہی ہے لیکن مختلف علاقوں میں اوسط شرح بھی مختلف ہے۔ جو فوجیں جزائر فلپائن اور جنوبی بحرالکاہل میں لڑ رہی ہیں ان میں بیماری کی شرح 80 تا 100 فی ہزار ہے۔ جو فوجیں یورپ کے میدان جنگ میں ہیں ان میں یوم فتح کی تقریب کے بعد سے بہت زیادہ بیماری پھیل رہی ہے اور وہاں بیماری کی اوسط شرح باقی تمام علاقوں سے زیادہ ہے۔ لڑائی ختم ہونے سے پہلے یورپ میں اوسط شرح 40 فی ہزار تھی اور اب 170 ہزار ہے۔ گویا 325 صد یعنی سوا تین گنا اضافہ ہوا ہے''۔

میں نے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں اس روافزوں اضافے کا کیا سبب ہے کرنل صاحب نے جواب دیا کہ ''یہ اضافہ حیران کن نہیں ہے کیونکہ ہر جنگ کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے جنگ کے خاتمے پر عام اخلاقی معیار گر جاتا ہے۔ سپاہیوں کے پاس فرصت کا کافی وقت ہوتا ہے جن سپاہیوں کو سمندر پار جانا ہوتا ہے انہیں کافی عرصہ کشتیوں اور جہازوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے وہ بندرگاہ میں بیٹھے بیٹھے اکتا جاتے ہیں او راپنی دلچسپی اور دل بہلا دے کے دوسرے طریقے ڈھونڈ نکالتے ہیں وہ شہروں میں زیادہ آزادی سے

گھومنے پھرنے لگتے ہیں اور بہت جلد جنسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں''۔

میں نے کرنل صاحب سے پھر سوال کیا کہ آپ کے خیال میں سب سے زیادہ خطرناک محرک کون سا ہے؟

کرنل صاحب نے فرمایا کہ ''جواب صاف ہے سب سے زیادہ خطرناک سبب ہے حرام کاری''۔

میجر جارجز ایک لوک کینیڈاوی افواج میں اسی قسم کے منصب دار ہیں۔انہوں نے کینیڈاوی افواج کے متعلق بھی چونکا دینے والی اطلاعات بہم پہنچائیں۔ میں نے امریکہ اور کینیڈا کے چند سول افسروں سے ملاقات کی۔انہوں نے اپنے نام کے اظہار سے تو انکار کیا لیکن جو حقائق اور اعداد و شمار ان سے حاصل ہوئے وہ سب ایک سے تھے انہوں نے کہا ''جب سے لڑائی ختم ہوئی جنسی بیماریاں بہت تیزی سے پھیل رہی ہیں یہاں تک کہ اس برعظیم میں ان کے وبائی صورت اختیار کر جانے کا اندیشہ ہے۔فوج سے معطل کئے ہوئے سپاہی آتشک اور سوزاک کی طرف سے بالکل لاپروا ہیں اور اپنی تعلیم کو سرے سے بھلا چکے ہیں۔ان میں معائنے اور علاج وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں پائی جاتی۔

صورت حال اس قدر نازک ہے کہ نیویارک سٹیٹ میڈیکل جرنل میں تمام ماہرین اور منتظمین کو متنبہ کیا گیا کہ میدان سے واپس آنے والے سپاہیوں کے گھروں میں آتشک اور سوزاک کی ہولناک مصیبت ڈیرا جمارہی ہے۔

گورڈن بیٹس جو کینیڈا کی مشہور ہیلتھ لیگ کے ڈائرکٹر ہیں اور کئی سال سے جنسی بیماری کے ماہر حیثیت سے مشہور ہیں۔وہ فرماتے ہیں:۔

''ظاہر ہے کہ بعض ایسے لوگ جنہیں زیادہ باخبر اور ہوشیار ہونا چاہئے۔ یہ خیال کرتے ہیں کہ جنسی بیماری کے حقائق کی تعلیم، تشخیص اور علاج کی سہولتیں ہی اس مرض پر قابو پانے کے لئے کافی ہیں۔ایک دوسرا گروہ جنس کے جسمانی حقائق سے باخبر ہونے پر اسی طرح زور دیتا ہے کہ گویا انہی حقائق کی تعلیم سے آتشک اور سوزاک پر قابو پا لیا جائے گا۔اگر اس جنسی بیماری کے انسداد کے کام کو محض ہدایات دینے تک محدود رکھنا ہے تو تعلیم اور موثر طریقہ علاج، دونوں کی بدولت عرصہ علالت کو قدرے گھٹایا جا سکتا ہے۔ معاشی اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر دیا گیا تو کثرت اختلاط کے ساتھ مریضوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے گا''۔

ڈاکٹر بیٹس اور بھی واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ''جنسی بیماری پر محض اخلاقی نقطہ نظر سے بحث کرنا قدامت پسندی کی دلیل ہے لیکن اصلی اخلاقیات کے بغیر جن کا تعلق کردار اور سماج سے ہے، جنسی بیماری پر قابو پانا بھی محال ہے''۔

''ظاہر ہے کہ یہ رائے ہماری فوجی ڈاکٹروں کی رائے سے بالکل متضاد ہے۔ہم امریکی افواج میں جنسی بیماری کی انسدادی مہم کے متعلق ڈاکٹر لاری مور اور سٹرن برگ کی رپورٹ کا ذکر کر چکے ہیں انہوں نے اخلاقی دلائل کو محض غیر موثر کہہ کر نظر انداز کر دیا۔فوج میں جنسی بیماری کے تدراک کی مہم کا خلاصہ یہ ہے کہ ہتھیار خواہ کسی قسم کے ہوں۔مقصد صرف جنسی وباؤں کی روک تھام ہے نتیجۃً ڈاکٹر لاری مور اور سٹرن برگ نے خیال کیا کہ فوج میں طبی نقطہ نظر سے جو مہم چلائی گئی تھی، وہ کامیاب رہی۔یعنی اس میں وہ کامیابی ہوئی جس کا ڈھنڈورا لڑائی کے خاتمے سے تھوڑا عرصہ پہلے پیٹا گیا تھا۔ جب کہ جنسی بیماری نے ہولناک وبا کی صورت اختیار نہ کی تھی اور ان ذلیل طریقوں، آلوں اور دواؤں کی مقدار اور تعداد کو پیش نظر

رکھا جائے جو سپاہیوں نے بدفعلی کے وقت بطور حفاظت استعمال کیں تو اس نام نہاد ''کامیابی'' کی قلعی کھل جاتی ہے۔

چونکہ ہم اس مسئلے کے مطالعے کو صرف طبی امور تک محدود کرنا نہیں چاہتے، اس لئے ہمیں اس حفاظتی ساز و سامان سے آزادانہ نمٹنا پڑے گا۔

شاید یہاں اس امر کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ فوجی منتظمین وقتاً فوقتاً اور مختلف مقامات میں جنسی بیماری کے خلاف اپنی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگاتے رہے ہیں کہ سپاہیوں نے کس قدر حفاظتی دوائیں اور کتنے آلے وغیرہ استعمال کئے۔ لہٰذا یہ اعداد و شمار اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے، کہ سپاہیوں نے کتنی مرتبہ بدفعلی کی اور مانع امراض دواؤں کے طفیل بیماری سے محفوظ رہے۔

بہت سے قاری اصل شماریت پر حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ مذکورہ بالا چیزوں کی تعداد اور مقدار بے اندازہ اور ناقابل یقین ہے۔ 1945 کے شروع میں امریکی فوج میں فی کس فی چیز کے حساب سے ایک مہینے میں 5 کروڑ حفاظتی چیزوں کی کھپت تھی۔

یہ ہے فوج کے منتظمین کی کامیابی کا پیمانہ۔ ہمارے سپاہیوں کی تعداد 80 لاکھ ہے۔ انہوں نے ہر ماہ 5 کروڑ حفاظتی چیزیں استعمال کیں۔ اب بدفعلی کے ارتکاب کا حساب لگایا جائے تو جو نتیجہ حاصل ہوگا اس پر شاید اوچھے نکتہ چین بھی جو پادریوں اور اخلاق پرستوں پر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی قوم نے اس قدر وسیع پیمانے پر زنا کاری کو بے ضرر بنا دینے کی کامیابی پر شیخی بگھاری ہو۔ یعنی ایک مہینے میں 5 کروڑ مرتبہ۔

گناہ کے خاتمے کا پنجسالہ منصوبہ

اب ہم بدکاری اور بداخلاقی کے انسداد کی اشتراکی جدوجہد کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد 1929 کے موسم گرما میں آخری اور نازک مرحلے پر پہنچ گئی۔ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی حکومت کی ایک آدھ وزارت نہیں بلکہ پوری آٹھ وزارتیں اس جدوجہد میں شریک تھیں جو مشترکہ سائنسی منصوبے پر چل رہی تھیں۔

جو بن بیاہ لڑکیاں صحت گاہوں میں علاج کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کر کے گریجوایٹ بن گئی تھیں۔ انہیں ملازمت دلانے کی ذمہ داری وزارت محنت نے اپنے ذمے لی۔ سماجی تحفظ کی عوامی وزارت نے عورتوں کی تربیت گاہوں اور ورک شاپوں کو ملک بھر میں قائم کرنے کا کام شروع کیا۔ اور ایسی عورتوں کو محفوظ اور عمدہ رہائشی مکانات مہیا کرنے کا فریضہ سنبھالا۔ جن کے متعلق خدشہ تھا کہ وہ بری صحبت کے اثر سے بدکاری میں دوبارہ مبتلا ہو جائیں گی۔

وزارت صحت عامہ نے صحت گاہوں کو وسیع کیا۔ جنسی بیماریوں کے زیادہ سے زیادہ ماہرین کی تربیت اور بے کس ماؤں کی امداد کا وسیع منصوبہ تیار کیا۔ اور تحفظ زچہ بچہ کے بے شمار مرکز کھولے۔

وزارت انصاف اس وقت تک ملیشیا یعنی قومی رضا کاروں کو نئے سرے سے منظّم کر چکی تھی۔ اور بے حد فعال، ہمدرد انسانیت اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار پولیس تیار کر چکی تھی۔ اب اس منظّم بدکاری اور عصمت کی تجارت کے باقیات پر آخری بھرپور حملہ کر دیا۔ گذشتہ پانچ برس کے عرصے میں جن

تاجران عصمت نے اپنا ذلیل کاروبار نہ چھوڑا تھا وہ روپوش ہو گئے تھے، اب وہ ناقص العقل لڑکیوں اور عورتوں کو اپنے جال میں پھنسانے میں مصروف تھے۔ اس اثنا میں وزارت انصاف اور وزارت امور داخلہ نے باہمی تعاون سے خفیہ چکلوں کا کھوج لگانے کے لیے خاص سراغرساں پیدا کر لیے تھے۔ چنانچہ خفیہ چکلوں کے مالکوں کو ڈھونڈ کر سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ چکلہ داروں کے خلاف عام لوگ حکومت کی پوری مدد کرتے تھے۔

وزارت تعلقات عامہ نے مردوں میں ان کی ذاتی اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کیا اور عوام میں ایسے لوگوں کو سختی سے ہدف تنقید بنانے کا جذبہ پیدا کیا جو نابالغوں اور نوجوانوں کو جرائم پر ابھارتے تھے۔

آخری کام، یعنی تمام تنظیموں، اداروں، شفاخانوں، ورکشاپوں اور زچہ و بچہ کی حفاظت گاہوں کو ہر ممکن مالی امداد دینے کی ذمہ داری وزارت تجارت اور وزارت مالیات کے سپرد کی گئی۔

ظاہر ہے اب انسداد عصمت فروشی کی مہم نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ یہ جدوجہد ابتدائی مرحلے سے نکل کر ایک نئی منزل میں داخل ہو گئی۔ اب اس کا دائرہ عمل وسیع ہو گیا، چنانچہ جرائم اور بداخلاقی کا نام ونشان تک مٹانے کے لیے وسیع قومی جہاد شروع ہو گیا۔

اب حالات کا تقاضا تھا کہ جرائم، بدکاری اور بداخلاقی پر خصوصی سائنٹیفک حملہ کیا جائے۔ بے کاری ختم ہو جانے سے غریب اور مفلس عورتوں کے سامنے یہ سوال کے برابر پہنچ گئی تھی، عصمت فروشی کا معاشی محرک ختم ہو گیا تھا اور اب عورتوں کے سامنے یہ سوال نہ تھا کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے پیشہ اختیار کریں یا نہ کریں۔ سوال صرف ان عورتوں کی بحالی کا تھا جو حالات اور افلاس سے مجبور ہو کر طویل مدت سے پیشہ اختیار کیے ہوئے تھیں، اس کی عادی ہو گئی تھیں اور اپنے آپ کو کسی باعزت کام کے اہل نہ پاتی تھیں۔ ظاہر ہے عورتوں کے اس گروہ کے ساتھ ان کے ''مربیوں'' کا وجود داٹل تھا۔ اس ناپسندیدہ اقلیت کو ختم نہ کیا جاتا تو یہ لوگ نابالغ نوجوان اور غیر مستقل مزاج عورتوں کی کشش کا دائمی محرک بنی رہتیں۔ اور رفتہ رفتہ عصمت فروش عورتوں کی صفوں میں اضافہ ہوتا رہتا۔

اصولاً عصمت کے تاجروں کے اس ''ہراول دستے'' کی گرفتاری، ان کے ساتھ ناقابل اصلاح سماجی عناصر کا سلوک اور ان کی سماج سے علیحدگی جائز تھی۔ لیکن اشتراکی حکومت نے اس قدام پر غور تک کرنے سے انکار کر دیا۔ اشتراکی منتظمین آخر تک اپنے قائم کردہ سائینٹفک اصول پر قائم رہے کہ ''طوائف معاشی اور سماجی طاقتوں کی شکار ہے، وہ ایک انسان ہے۔ لیکن سماجی طاقتوں کی غلام اور مظلوم ہے۔ اس کی سماجی بحالی صرف ایک نئے، مثبت اور صحت مند ماحول ہی میں ممکن ہے''۔ شہریوں کی جو کمیٹیاں بدکاری کے خاتمے کی مہم میں حکومت کا ہاتھ بٹاتی آئی تھیں، ان سے طویل بحث اور تبادلہ کے بعد اشتراکی ماہرین نفسیات نے شفاخانوں اور ورکشاپوں کے نظام میں انقلابی تبدیلیاں کر کے جرائم اور بدکاری کو قطعی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

نئی صورت حال اسی انقلابی تبدیلی کی متقاضی تھی۔ 1924 تک رہائشی شفاخانوں میں زیر علاج عورتوں کی صرف ایک چوتھائی تعداد نے مختلف پیشے سیکھے تھے اور 1934 تک تین چوتھائی عورتیں مختلف فنون میں تربیت حاصل کر چکی تھیں۔

اس لیے اس وقت تک بہت سے رہائشی شفاخانے بند ہو چکے تھے باقی ماندہ مریض عورتوں میں

نفسانی عدم صحت کی علامات پائی جاتی تھیں امراض نفس کے ماہرین کی نظر میں اس کا سبب طویل عرصے کا پست اور ذلیل طریق زندگی تھا۔ اس لیے وہ ان کے علاج کی طرف باقاعدہ اور منظّم طریقے سے متوجہ ہوئے۔ انہوں نے امراض نفس کے علاج کے تقریباً وہی طریقے اختیار کیے جس کی زبانی وکالت ہمارے ہاں کے ماہرین کرتے رہتے ہیں۔ عورت کے انفرادی روحانی طریق علاج پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اشتراکی ڈاکٹروں نے اپنی تمام تر کوشش اس سماجی اور معاشی ماحول کو بدلنے کے لیے وقف کر دیں۔ جس میں وہ رہتی تھیں۔ انہوں نے اس ماحول کو ایسا بنا دیا کہ عورت کے لیے با اخلاق طریق سے زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔

یہ طریقے اس قدر منطقی، عقلی اور سادہ تھے، کہ 1934 تک رہائشی شفاخانوں کی نوعیت عام کھلے مرکزوں کی سی نہ رہی تھی۔ عورتوں کو اب بھی ان میں داخل ہونے پر مجبور نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جو عورت علاج کے لیے راضی ہو جاتی تھی، اس کے لیے دو سال تک وہاں رہنا ضروری تھا، ان شفاخانوں کا روزانہ معمول بالکل بدل دیا گیا۔

پہلے پہل ان میں زندگی کا وہی معمول تھا جو عام شفاخانوں میں ہوتا ہے یعنی صبح سویرے اٹھنا، وقت پر کھانا اور آرام کرنا، سہل کام، مقررہ وقت پر علاج معالجہ، تفریح اور تعلیم اور وقت پر جلدی سو جانا وغیرہ، اس قسم کی زندگی عورتوں اور لڑکیوں کی اکثریت کے مزاج کے تو موافق تھی، لیکن جو عورتیں عرصے سے بازاری زندگی کی عادی ہو چکی تھیں۔ ان کے لیے یہ طرز زندگی ایک بوجھ اور وبال ثابت ہوا۔ یہ عورتیں سالہا سال سے شام کے وقت سے اپنا دھندا شروع کرنے کے عادی تھیں۔ ان کے لیے شام کے وقت سونا دشوار تھا۔ اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے جاگنے اور کروٹیں بدلتے رہنے سے بہت جلد اکتا جاتی تھیں۔ ان کے لیے شام کے وقت سونا دشوار تھا۔ اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے جاگنے اور کروٹیں بدلتے رہنے سے بہت جلد اکتا جاتی تھیں۔ لہٰذا نتیجہ مقصد کے برعکس نکلا، وہ شفاخانوں سے نفرت کرنے لگیں۔ اور ان میں رات کی تاریکی میں بازاروں میں آوارہ گردی کرنے، ہوٹلوں اور شراب خانوں کے طواف کی عادت عود کر آئی۔

چنانچہ رات کو دن میں بدل دیا گیا۔ اب شفاخانے کی ورکشاب میں تیسرے پہر کام شروع کیا جاتا جو ساری رات جاری رہتا۔ سونے کا وقت صبح کاذب اور جاگنے کا اگلی دوپہر کا مقرر ہوا۔ اسی طرح دوسری سرگرمیوں اور کاروبار کا وقت بھی بدل دیا گیا۔ لہٰذا شفاخانے میں داخل ہونے والی طوائف کے لیے اپنے روزانہ کے معمول میں کوئی فرق نہ رہا۔ طوائف کا علاج رات کو عین اس وقت شروع کیا جاتا جب کہ اس کی پرانی عادت اسے مردوں کی تلاش کے لیے شفاخانہ چھوڑنے پر مجبور کرتی اس طریق علاج کا نفسیاتی اصول بالکل واضح ہے مثالی قسم کی مریض عورت دو طاقتور مشروط انعکاسات میں مبتلا تھی (انعکاس مشروط میں کوئی خاص عادت اپنے اصلی سبب سے ہٹ کر کسی دوسرے سبب سے پیوستہ ہو جاتی ہے) پہلا اسے رات کے وقت سرگرم رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور دوسرا کسی مفید کام کے بجائے رنگ رلیوں پر بھارتا تھا۔ ان دونوں عادتوں کو بہ یک وقت ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسی کوشش کا نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہ نکلتا۔ اس لیے ہر ایک کے ساتھ الگ الگ نمٹا گیا۔ اور سب سے پہلے عورتوں کے کام کی نوعیت بدل گئی۔

لہٰذا شفاخانوں میں بہت سی تبدیلیاں کی گئیں۔ وزارت صنعت نے ورکشاپوں کی نئی تنظیم کا منصوبہ بنایا۔ تجربے کے طور پر کیف کے شفاخانے میں ایک خاص اور اہم صنعت شروع کی گئی۔ ان میں

خاص برقی آلات طب تیار کیے جانے لگے۔ جن کی سوویت یونین کے ڈاکٹروں کو بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اس صنعت کا عورتوں پر حیرت انگیز مفید اثر پڑا۔ اس سے پہلے وہ پارچات یا عام استعمال کی چیزیں تیار کیا کرتی تھیں۔ یہ کام ان کے لیے کسی خاص دلچسپی کا موجب نہ تھا۔ اب انہیں ایک ایسا دلچسپ کام دیا گیا جو قوم کے لیے بے حد مفید تھا۔ ان میں خدمت قوم کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور بڑے شوق سے محنت کرنے لگیں۔ اس نئے کام کی اہمیت کا شعور پیدا ہوتے ہیں ان عورتوں کے کردار اور سیرت میں بھی نمایاں تبدیلی ہوئی۔ جنہیں دماغی اعتبار سے ناکارہ خیال کیا جاتا تھا، اب وہ اچھی طرح سمجھ گئیں کہ جو سامان وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی ہیں، ان کے ہموطنوں کی زندگی بچانے کے لیے اس کی سخت اور فوری ضرورت ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان سے کام لینا مقصود نہیں بلکہ وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے محنت کر رہی ہیں۔

یہ تجربہ غیر متوقع طور پر اتنا کامیاب ثابت ہوا۔ کہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی تقلید شروع ہو گئی۔ جن عورتوں میں قدرے صلاحیت کی کمی تھی۔ ان کے لیے ماسکو کے قریب ایک اجتماعی زراعتی فارم قائم کیا گیا۔ اس میں محکمہ زراعت کے لیے فصلیں اگانے اور مویشی پالنے کا کام شروع کیا گیا۔ اس کام میں بھی عورتوں کی سماجی ذمہ داری اور قومی خدمت پر زور دیا گیا۔

ان تجربوں کے دوران میں عورتوں نے خاص فنون اور پیشوں میں مہارت پیدا کر لی، وہ قوم کی اقتصادی زندگی میں نہایت مفید ثابت ہوئیں۔ اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئیں۔ بد دل قسم کی عورتوں نے بھی اس موقع غنیمت سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس بے تابی اور شوق کا مظاہرہ کیا اس سے وہ ماہرین امراض نفس بھی بے حد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جو قدرے مایوس ہو گئے تھے۔ اب ماہرین نے مزدوروں اور کسانوں کی کمیٹیوں سے فوراً مشورہ کیا اور اس سلسلے میں جو کانفرنسیں ہوئیں، ان میں فیصلہ کیا گیا کہ بحالیات کے کام کو تیز تر کر دیا جائے۔

ادھر طبی ماہرین نے نہ صرف جنسی بیماریوں کے علاج بلکہ عورتوں کی بدوضعی کو دور کرنے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ ہر شفا خانے میں ایک ایک پلاسٹک سرجن مقرر کیا گیا۔ جو بدنصیب عورتیں آتشک کے ہاتھوں بدشکل ہو گئی تھیں، انہیں سماج میں رہنے کے قابل بنانے کے لیے ان سرجنوں نے ناک اور دوسرے نازک اعضا کے خطرناک آپریشن کرنے شروع کر دیئے۔

امراض زناں کے ماہرین ایسی عورتوں کے علاج میں شریک ہوئے جنہیں از دواجی زندگی اور تولید کے قابل بنایا جا سکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک وسیع تہذیبی اور ثقافتی پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ مشہور فن کار اور اداکار ہر شفا خانے میں تہذیبی ڈرامے پیش کرنے لگے۔ زیر علاج عورتوں کے لیے خاص اخبار جاری کیے گئے اور انہوں نے خود بہت سے اخبار نکالنے شروع کر دیئے۔

یہ شفا خانے قومی زندگی سے کٹے ہوئے نہ تھا۔ مریضوں کو اپنا ماضی بھول جانے کی بھی ہدایت نہ کی جاتی تھی۔ بلکہ ہر عورت کو اس طویل المیاد اور قدیم بدعت کے خاتمے کی جدوجہد میں، جو دوسرے ملکوں میں ناکام رہی تھی، اس کی ذاتی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ اس کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی تھی کہ اپنے گھناؤنے ماضی پر اس کی ذاتی فتح ایک نتیجہ خیز سماجی تجربے کے لیے بے حد مفید ثابت ہو گی اور یہ کہ وہ اصلاح انسانی کی اصلاح و ترمیم کی جنگ میں سب سے اگلی صف میں ہے۔

شفاخانوں کے کام میں خاطر خواہ کامیابی کی توقعات کے باوجود بعض اشتراکی ماہرین کا خیال تھا کہ ''ہراول دستے'' میں لڑنے والی ان عورتوں کے لیے بدکاری کا شکار ہوئے بغیر سماج میں دوبارہ داخل ہونا ممکن نہیں۔ یہ عورتیں خود اس خطرے سے آگاہ تھیں، لہٰذا ان کی سماجی بحالی کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

1- ہر زیر علاج عورت کو شفاخانے سے اس وقت خارج کیا جاتا جب کسی معزز برادری میں اس کی قبولیت کا خاطر خواہ بندوبست ہو جاتا۔ چند معزز شہریوں کے سوا جن سے شفاخانے کی زندگی کے آخری ایام میں اس کی خط و کتابت ہوتی، باقی سب لوگوں کے لیے اس کی ماضی کی زندگی صیغہ راز میں رکھی جاتی۔ یہ رضا کار پہلے سے اس کے لیے ملازمت یعنی اس کام کا بندوبست کرتے جس کی ترتیب وہ خاص طور پر حاصل کر چکی ہوتی۔ وہ اس کے لیے ایک شریف اور معزز گھرانے کی تلاش کرتے۔ عورت کی آمد کے سلسلے میں بہت احتیاط کی جاتی تھی تاکہ کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو سکے۔

2- وارثین کا ایک منتخب گروہ طویل عرصے تک اس کی امداد کا ضامن بنتا۔ ملازمت کے دوران میں اس عورت کی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ لیکن نگرانی کا یہ طریقہ ہمارے ہاں کے عارضی اور تجربی، دور ملازمت سے بہت سے مختلف تھا، کیونکہ اس کی بنیاد نگران اور ماتحت، ہر دو کی ذاتی دوستی پر تھی۔ یہ بات خاص طور سے ملحوظ خاطر رکھی جاتی کہ سابقہ مریض عورت اپنی موجودہ ملازمت میں پوری طرح کامیاب اور اس کے اہل ثابت ہو۔ عورت کے ساتھ کم از کم ایک وارث بھی وہی ملازمت کیا کرتا تھا۔

3- ہر ضلع میں وارثین کے مختلف گروہوں کو امدادی انجمنوں میں منظم کیا گیا۔ یہ لوگ مہینے میں تین مرتبہ اکٹھے ہوتے اور ڈاکٹروں، ماہرین نفسیات اور فیکٹری کے منیجروں سے ملاقات کرتے۔ کسی عورت کو اپنے کام میں کوئی مشکل پیش آتی تو اسے تجربہ کار مددگار مہیا کیے جاتے۔ سابقہ مریض عورتیں پوری طرح بحال اور آباد ہو جاتیں تو وہ اپنی خدمات مذکورہ انجمنوں کے رضا کارانہ امداد کے لیے پیش کر دیتیں۔

4- شادی، ملازمت، اجرت، کرایہ وغیرہ کی مشکلات اور جھگڑوں میں امداد بہم پہنچانے کے لیے یہ انجمنیں عورتوں کے لیے وکالت کا خاص انتظام کرتی تھیں۔

5- شفایاب عورتوں کو تاکید تھی، کہ وہ زیر علاج سہیلیوں سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم رکھیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ تاکہ وہ عام گرہستی اور برادری کی زندگی میں جلد از جلد داخل ہو جائیں۔

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے سوویت یونین میں عصمت فروشی کو ختم کرنے کے لیے جو جدوجہد شروع کی گئی تھی۔ ہم اس کی تمام حکمت عملی اور طریق کار جائزہ لے چکے ہیں۔

اس جدوجہد کو ترک کئے ایک مدت ہو چکی ہے اور اب وہ محض قصہ ماضی ہے۔ یہ جدوجہد ان لڑائیوں کی طرح فتح پر ختم ہوئی جو سٹالن گراد، کیف سیوستوپول وغیرہ کے ناموں کے ساتھ ہمیشہ یاد رہیں گی اور جو دشمن کی مکمل شکست اور تباہی پر ختم ہوئیں۔ آج دنیا بھر کے مبصرین گواہی دیتے ہیں کہ سوویت یونین کے شہروں اور دیہات سے عصمت فروشی کو نابود کیا جا چکا ہے۔ 1917 میں زار شاہی پولیس کے

نامکمل اعداد وشمار کے مطابق اکیلے شہر لینن گراد (سابقہ سینٹ پیٹرز برگ) میں ساٹھ ہزار رجسٹرڈ اور کئی ہزار ایسی طوائفیں تھیں جو لائسنس کے بغیر چوری چھپے پیشہ کرتی تھیں۔

1928 میں یعنی انسدادی جدوجہد کے آغاز سے پانچویں سال بعد شوقیہ زنا کاری عملاً ختم ہو چکی تھی اور پانچ ہزار پیشہ ور عورتیں علاج وتربیت کے بعد معزز شہری بننے کے لئے تیار تھیں۔ لیکن تین ہزار عورتیں ابھی تک عصمت فروشی پر گزارہ کرتی تھیں۔

ڈاکٹر جے اے سکاٹ کی رپورٹ کے مطابق جو مارچ 1945 کے برطانوی رسالہ امراض جنسیہ میں چھپی اور جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ 1930 تک ماسکو شہر میں طوائفوں کی تعداد گھٹ کر تقریباً آٹھ سو رہ گئی تھی، دوسرے شہروں کی صورت حال بھی اسی طرح حوصلہ افزا اور خوشگوار تھی۔ بعد میں قومی پیمانے پر اخلاقی بحالیات کی جو مہم چلی وہ انہی باقی ماندہ عورتوں کے لیے شروع کی گئی تھی۔

اس جدوجہد کے نتائج؟

ان مریض عورتوں میں سے تقریباً اسی فیصد نے شفاخانوں میں تعلیم وتربیت حاصل کر کے ملک کے صنعتی کارخانوں اور زراعتی فارموں میں ملازمت اختیار کی اور پانچ سال سے زائد عرصے کے لیے اپنے کام کو بڑی خوبی سے سرانجام دیتی ہیں۔

چالیس فیصد سے زیادہ ''شاک بریگیڈوں'' یعنی سب سے اعلیٰ اور تیز کارگروں کے دستوں کی رکن بنیں یا اعلیٰ اور شاندار قومی خدمات کے لیے منتخب ہوئیں۔ اکثر نے شادی کر کے کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔

انیس فی صد سے کم مریض عورتیں ایسی نکلیں جو علاج اور تربیت کے بعد بھی اپنے آپ کو نئے سماجی ماحول کے مطابق نہ ڈھال سکیں۔ لہٰذا انہیں مزید تربیت کے لیے دوبارہ تربیت گاہوں میں آنا پڑا۔ باقی ماندہ تعداد ایسی عورتوں پر مشتمل تھی جو جنسی بیماریوں اور دماغی نقائص کے سبب اس قدر ناکارہ ہو چکی تھیں کہ وہ نئے سماج میں اپنے لئے کوئی مقام پیدا کرنے سے قاصر رہیں۔

لہٰذا سوویت یونین میں عصمت فروشی کے خاتمے کے جدوجہد کو غلاموں اور مظلوموں کی جدوجہد میں بدل دیا گیا اور اشتراکی سماج سے عصمت کی تجارت کا صدیوں پرانا ناروگ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اور اس کے ساتھ ہ جنسی بیماری بھی ناپید ہو گئی۔ روسیوں کی موجودہ نسل نے اپنی زندگی میں کسی طوائف کی شکل تک نہیں دیکھی۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنوں نے روس کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تو حالت پھر خراب ہو گئی۔ 1944 میں جرمنوں کو روس سے نکال باہر کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جو علاقے ان کے قبضے میں رہ چکے تھے۔ ان میں ہر قسم کی وباؤں کا دور دورہ ہے۔ نازی سپاہیوں نے ہزاروں روسی عورتوں اور لڑکیوں سے جبراً زنا کیا تھا۔ اس لیے ایک بڑی تعداد آتشک اور سوزاک کے عارضے میں مبتلا ہو گئی تھی۔ تادم تحریر اعداد وشمار جمع نہیں ہو سکے ہیں اور علاج معالجے کے لیے جو اقدام کئے گئے ہیں۔ ان کی نوعیت ہنگامی ہے۔ لیکن یوکرین کی اشتراکی جمہوریت کے حالات کے مطالعے سے اصل صورت حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یوکرینی قوم کو سب سے زیادہ جنگ کی تباہی کا شکار ہونا پڑا۔ جنگ کے دوران میں یوکرین کی صحت عامہ کا کیا حال ہوا اور مریضوں کی تندرستی کے لیے کچھ کیا جا رہا ہے، اس کی اطلاع براہ راست یوکرین کے وزیر صحت مسٹر الارین کونونینکو سے حاصل کی گئی ہے۔

ان کے بیان کے مطابق نازیوں کے حملے سے پہلے یوکرین کے لوگ اپنے ہاں کے اعلیٰ نظام صحت پر فخر کیا کرتے تھے۔ یوکرین کی جمہوریت میں نو میڈیکل اور دو فارمیسی کالج تھے، جہاں سے تقریباً ساڑھے تین ہزار طلبا ہر سال گریجویٹ بن کر نکلتے تھے۔ یہ طبی ماہرین ہمارے ہاں کے تربیت یافتہ طبی کارکنوں کے برابر ہیں۔ سوویت یونین میں ایسے تربیت یافتہ مرد اور عورتیں عام لوگوں کی کما حقہ خدمت کرتے ہیں اختیارات میں ہمارے ہاں کے ڈاکٹروں اور رجسٹرڈ نرسوں کے مابین ہیں۔

1941 میں یوکرین میں 932 ہسپتال تھے۔ جن میں 129000 مریضوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ دیہات میں 2445 طبی مرکز تھے۔ بڑی ڈسپنسریوں اور رہائشی شفاخانوں کی تعداد چھ ہزار کے لگ بھگ تھی اور چھوٹی ڈسپنسریاں دس ہزار تھیں، ٹریڈ یونینوں اور اجتماعی کھیتوں کی تنظیموں کے اپنے چار سو سینی ٹوریم اور 173 آرام و تفریح گاہیں تھیں جن میں 10 لاکھ سے زائد بالغ افراد اور بچے رہائش اختیار کیا کرتے تھے۔

صحت عامہ کی اس شاندار تنظیم کی بدولت جنسی بیماریوں کو ختم کرنے میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ 1941 تک آتشک کے نوے فیصد مریض صحت یاب ہو چکے تھے اور باقی ماندہ مریض زیادہ تر پرانے بیمار تھے۔ اس وقت تک جنسی ناسور کا مرض معدوم ہو چکا تھا اور سوزاک خاتمے کے قریب تھا۔ اس کے ساتھ ہی سوزاک کی شرح تیزی سے گھٹ رہی تھی۔

اس کام میں عورتوں کے ہسپتال جن میں 31 ہزار عورتوں کی رہائش کا انتظام تھا اور 1647 انسدادی صحت گاہیں جو حاملہ اور شیر خوار بچوں کی ماؤں کے لیے مخصوص تھیں۔ خاص طور پر سے مدثابت ہوئیں۔

یوکرین پر نازیوں کے قبضہ کے دوران میں صحت عامہ کا یہ شاندار ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ ہسپتال، رہائشی شفاخانے، کالج اور طبی ادارے جان بوجھ کر تباہ کئے گئے جو باقی رکھے گئے ان میں عوام کا داخلہ منع تھا اور وہاں جرمن سپاہ کے لئے چکلے جاری کئے گئے، جرمن سپاہیوں اور افسروں کے لئے باقاعدہ چکلوں کے قیام سے جنسی بیماری میں ہولناک اضافہ ہوا۔ لیکن اس حادثے کے اعداد و شمار شاید کبھی جمع نہ کئے جاسکیں۔ کیونکہ لاکھوں بالغ افراد اور بچے یوکرین سے جبراً نکال دیئے گئے۔ ان میں سے بہت سے ہلاک ہو گئے اور جو باقی بچے وہ طویل عرصے تک وقتاً فوقتاً یوکرین کو واپس لوٹتے رہے۔ اس لئے میڈیکل ریکارڈ کا صحیح رکھنا ناممکن ہو گیا۔

یوکرین کی آزادی کے بعد علاج معالجے اور انسداد امراض کا کام فوراً شروع کیا گیا مئی 1945 تک چھوت کی بیماریوں کے انسداد کے لئے تقریباً 766 مرکز کھولے جا چکے تھے۔ چھ ہزار کے قریب عورتوں کے ہسپتال اور ابتدائی طبی امداد کے مرکز قائم ہو چکے تھے۔

مایوس اور قریب المرگ قسم کے مریضوں کی طرف فوری توجہ دینے کے لئے ساڑھے چار ہزار مرکز قائم کئے گئے اور میڈیکل کالجوں میں طلبا کی تعداد جنگ سے پہلے کے طلبا کی تعداد کے نصف تک جا پہنچی۔

جنسی بیماریوں کے خلاف الگ سے کوئی مہم نہ چلائی گئی۔ یوکرین کی صحت عامہ کو جنگ سے پہلے کے معیار پر لانے کے لئے وسیع جدوجہد جاری ہے۔ خصوصاً تپ دق چھوت کی بیماریوں مثلاً چیچک اور گلے کے امراض وغیرہ کے انسداد کے لئے بے حد کوششیں جاری ہیں۔ امریکہ کے محکمہ صحت عامہ نے

آتشک اور سوزاک کے علاج کے لئے جو نئے طریقے رائج کئے ہیں، ان کا مطالعہ کرنے کے لئے اشتراکی ماہرین امریکہ کا دورہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے سریع الاثر علاج کے مرکزوں کا خاص طور سے مشاہدہ کیا۔ سوویت یونین میں پنسلین کو رائج کیا جا رہا ہے۔ لیکن یوکرین کے ماہرین طب کا خیال ہے کہ جنسی بیماری کے ازالے کے لئے ان کی جنگ سے پہلے کے زمانے کی ایجاد گلوکوز ٹریٹپو سائیڈ ہی کافی ہے۔

جو علاقے جرمنوں سے آزاد کرائے گئے ہیں، ان میں یوکرین کو مثالی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں صحت کا مسئلہ بہت نازک ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہمارے لئے ایک چیلنج رکھتی ہے کہ یوکرین کی حکومت کے اس امر پر زور دینے کے باوجود کہ جرمنی کے تسلط کے دنوں میں وہاں کی صحت عامہ بے حد تباہ ہوگئی اور جنسی بیماریوں کا مسئلہ ہنگامی صورت اختیار کر گیا، یوکرین میں عصمت فروشی کے خلاف خاص جدوجہد کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اگرچہ یہ سماجی علت دوبارہ نمودار ہوگئی ہے۔ لیکن اکا دکا واردات تک محدود ہے۔

آج اشتراکی اخبارات اپنے ملک کی از سر نو تعمیر کے زمانے میں نااہل منتظمین کی بے رحمانہ تنقید اور بحالیات کے مسائل کے کھلے اعتراف نزاکت سے بھرپور ہیں۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ جنسی بیماری کے مسئلے پر کوئی خاص زور نہیں دیتے۔ کیونکہ اب وہاں اس مرض کو تپ دق اور جلد کی بعض وبائی بیماریوں سے کم خطرناک تصور کیا جاتا ہے اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سوویت یونین دو تین سال کے عرصے میں آتشک اور سوزاک کی بیماریوں کی اتفاقی امراض کی سطح پر لے آئے گا۔

قتل۔ صیغہ راز

سوویت یونین نے بدمعاشی، بدکاری اور بیماری پر فتح پائی، اسے معاشرتی اصلاح کے ایک قابل دید مگر الگ مظہر کی حیثیت سے دیکھنا سخت غلطی ہوگی۔ ہم پوری طرح بتا چکے ہیں کہ وہاں کس طرح بدکاری اور بیماری کے انسداد کی کوشش میں نمایاں کامیابی ہوئی، لیکن ہم نے جو کچھ اب تک بیان کیا ہے وہ اس وقت تک بے معنی ہوگا۔ جب تک ہم اشتراکی اخلاقیات کے وسیع تصور یعنی ''بنی نوع انسان کے سائنسی اصولوں کے مطابق اصلاح'' کی دلیرانہ جدوجہد میں اسے موزوں مقام پر رکھ کر نہیں دیکھتے۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ انقلاب کے فوراً بعد جو سوالنامہ روسی عورتوں میں پھرایا گیا اس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے بیان کیا اس سے اشتراکی سائنسی دانوں اور سیاسی رہنماؤں کو یقین ہو گیا کہ بدکاری اور گناہ کا بنیادی سبب معاشی ہے۔ یعنی اس کا محرک افلاس اور بے روزگاری ہے۔ تاہم انہیں معلوم تھا کہ صرف بے روزگاری کو ختم کر دینے سے، جیسا کہ 1929 کے بعد کیا بھی گیا۔ منظم بدمعاشی اور تجارتی بدکاری خود بخود ختم ہو جائے گی، بلکہ برعکس نتیجہ نکلنے کا امکان ہے۔ اگر معاشی منصوبہ ہر خواہشمند عورت کو مستقل ملازمت نہ دلا سکتا، تو یہ جدوجہد بے کار ثابت ہوتی، پانچ سالہ تاریخی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے سے جو عظیم الشان صنعتی ترقی ہوئی، اس سے نہ صرف موجودہ جنگ (دوسری جنگ عظیم) میں سرخ فوج کی شاندار فتوحات کی بنیاد پڑ گئی بلکہ روس کے ہر باشندے کی زندگی پر بھی نہایت خوشگوار اثر پڑا۔

اب تک بعض قاریوں کے ذہن میں یہ سوال ہو گیا ہوگا کہ طوائف نے اپنا پیشہ چھوڑ کر باعزت ذریعہ معاش اختیار کر لیا، تو اس کے بعد سوویت یونین کی عام اخلاقی حالت کا کیا ہوا؟ یا زیادہ واضح الفاظ میں سوویت یونین کے مردوں، عورتوں اور نوجوانوں کے جنسی تعلقات کا کیا ہوا؟ کیا جنسی بیماری اور عصمت فروشی کے خاتمے سے معزز شہریوں کے اخلاق گر گئے؟

ہم اس سوال کو اور بھی واضح اور کھلے الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ آیا آزاد محبت کے اس نام نہاد نئے رجحان کے پردے میں، جس کو گورکی اور لنین نے سختی سے مخالفت کی تھی، طوائفوں کا کام عام روسی عورتوں نے سنبھال لیا؟

نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا، اسے چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ وہاں نہ صرف عصمت فروشی ختم ہوگئی، بلکہ بداخلاقی کے ہر مظہر مثلاً نام نہاد آزاد محبت اور زنا وغیرہ پر جس کامیابی سے قابو پایا گیا، اس کی مثال ہمارے ملکوں کی تاریخ میں قطعاً ناپید ہے اور اخلاقی اصلاح کا یہ سلسلہ آج تک کامیابی سے جاری ہے۔ اشتراکی سائنس دانوں نے جس انقلابی تبدیلی کی پیش گوئی کی تھی۔ وہ حرف بحرف پوری ہوئی، کیونکہ سماجی اور اقتصادی منصوبہ بندی کی بدولت اکثریت کے لیے محبت کی شادی اور اس کے ذریعے ذاتی تسکین کی اعلیٰ ترین صورتوں کا حصول ممکن ہوگیا۔

کہاں محبت اور شادی اور کہاں سائنسی اور اقتصادی منصوبہ بندی! ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں؟ اکثر قاریوں کے نزدیک یہ بیان مہمل ہوگا، لیکن یہ حقیقت ہے اور اس کے حق میں اس قدر فلسفیانہ دلائل دیئے جا سکتے ہیں کہ اس کتاب میں کئی بابوں کا اضافہ ہو جائے، لیکن ہم اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے، کیونکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس دلچسپ موضوع پر اشتراکی اخباروں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بے حد طویل اور ضخیم ہے۔ گزشتہ واقعات پر ایک سرسری نظر دوڑانے سے معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں سوویت یونین میں جو بحث چلی وہ دو متضاد نظریوں پر مشتمل تھی۔

ایک طرف ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ جہاں تک جنسی معاملات کا تعلق ہے انسانی تجربے کو ٹھوس حقائق شاہد ہیں کہ فطرت انسانی میں تبدیلی اور اصلاح کی کوئی امید نہیں اور اگر عصمت فروشی اور بدکاری کا عارضی طور پر ختم بھی کر دیا جائے مرد و عورت زنا بداخلاقی کو پھر بھی ترک نہیں کریں گے۔

دوسری طرف وہ سائنس دان اور ماہرین سیاست تھے جو اس بات پر مصر تھے کہ تاریخ میں آج تک انسانیت کو با اخلاق طریقے سے زندگی گزارنے اور محبت کرنے کے عملی مواقع بہم ہی نہیں پہنچائے گئے اور انہوں نے اشتراکی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اٹھارہ کروڑ انسانوں کو ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں۔

جیت دوسرے گروہ کی ہوئی اور سوویت یونین اپنے تمام سماجی تجربوں میں سب سے زیادہ غیر معمولی تجربے یعنی اخلاقی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگیا۔ اور اس منصوبہ بندی کے مطابق پہلا قدم اٹھتے ہی جو واویلا مچایا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ روس سے باہر کی دنیا کو اشتراکی مقاصد کا ذرہ برابر علم نہ تھا اور مسلسل بیس برس تک ان مقاصد کو سمجھنے سے دانستہ انکار کیا گیا۔ دراصل پہلی نظر میں لگا بھی یوں کہ اخلاقی اصلاح کا ابتدائی قدم الٹی طرف اٹھا ہے۔ یعنی وہاں اخلاق کی اصلاح کے بجائے ان کی مکمل تباہی مقصود ہے اور وہ اقدام یہ ہے کہ سوویت یونین نے ایک تاریخی قانون کے ذریعے اسقاط حمل کو جائز قرار دے دیا اور ہر خواہش مند عورت کو حمل گرانے کی آزادی دے دی۔

اسقاط حمل۔ پیدائش سے پہلے ہی انسانی زندگی کی ہلاکت۔ یہ حرکت مہذب سماج میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔ لوگ حمل گرانے کو قتل ہی کی ایک صورت تصور کرنے میں حق بجانب ہیں، کیونکہ ہونے والے ماں باپ اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے نوزائیدہ بچے کا خون کرتے ہیں لیکن سوویت یونین کے دشمن اور دوست اس روشن حقیقت کو نہ دیکھ سکے کہ اشتراکی سائنس دان اور سیاسی رہنما بھی انہی کی طرح اسقاط حمل کو انسانی قتل اور بداخلاقی تصور کرتے ہیں اور اس فعل کو فرد

اور قوم دونوں کی بہتری کے خلاف جانتے ہیں پھر سوویت حکومت نے اس غیر مہذب فعل کو کیونکر قانوناً جائز تسلیم کر لیا؟

اس سلسلے میں جو طویل نظری بحث ہوئی، اس کی تفصیل میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمارے ملکوں میں اسقاط حمل کے خلاف یا حمایت میں بے شمار مذہبی اور علمی چیزیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ دراصل اتنا پراسرار اور نا قابل فہم نہیں سوویت یونین میں اسقاط حمل کو عصمت فروشی کی طرح ایک سماجی جرم مانا جاتا ہے۔ جس کا بنیادی سبب انسانوں کا عام افلاس ہے۔

اس مسئلے کے متعلق جو الجھاؤ پایا جاتا ہے اسے جدلیات کی مدد سے فوراً دور کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب روس کے وقت کی بین الاقوامی صورت حال کا جائزہ لیجئے۔ اس وقت دوسرے مہذب ممالک کی طرح زار شاہی روس میں بھی حمل گرانا قانوناً جرم تھا اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سخت سزا مقرر تھی۔ اس کے باوجود تمام ممالک میں اس مذموم فعل کا ارتکاب وسیع پیمانے پر ہوتا تھا عام طور سے حمل گرانے کا کام ڈاکٹر انجام نہ دیتے تھے۔ بلکہ اس کے ذمہ دار ایسے جرائم پیشہ لوگ تھے جنہیں شاید ہی کبھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہوگا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جرمنی میں ہر سال دس ہزار عورتوں کی موت خلاف قانون اسقاط حمل سے واقع ہوتی تھی۔ اس سے کئی گنا عورتیں آپریشن کے دوران میں عمر بھر کے لیے زخمی اور بیمار ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہ تعداد وہ ہے جو حکومت کے علم میں آئی اور یہ ایسے واقعات کا ایک ادنیٰ سا حصہ ہے جو حکومت کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

شمالی امریکہ میں نامکمل شماریات سے اندازہ لگایا گیا کہ وہاں ہر سال لاکھوں حمل گرائے گئے۔ زار شاہی روس میں ہر سال پچیس ہزار عورتیں اسقاط حمل کے سبب مرتی تھیں۔

یہ حالت اس وقت تھی۔ جب کہ ہر ملک میں اسقاط حمل کے خلاف سخت قانون رائج تھے۔

اب موجودہ حقائق کو لیجئے۔ اشتراکی کی تجربہ آج سے بیس سال پہلے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ سوویت یونین میں دوسرے ملکوں کی طرح اسقاط حمل کے خلاف پھر سے قانون موجود ہے اور کئی سال سے اسقاط حمل کو ایک جرم تصور کیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس قانون کو 1944 میں پہلے سے بھی زیادہ سخت بنا دیا گیا۔ آخر کیوں؟ کیا اشتراکی کی تجربہ ناکام رہا؟ نہیں! یہ تجربہ ناکام نہیں رہا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عصمت فروشی کی طرح روس میں اسقاط حمل بھی ناپید ہے۔ دوسرے ملکوں میں زبردست مذہبی اور قانونی مخالفت اور طبی سہولتوں کے فقدان کے باوجود اس جرم کی شرح بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اور ہر سال بے شمار عورتیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ یا شکم میں زخم آ جانے کی وجہ سے سد بیمار ہو جاتی ہیں۔

اب اپنے برعظیم (امریکہ) کی صورت حال کو لیجئے، بہت سے ڈاکٹروں نے حال ہی میں تفتیش فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر نفسانی امراض کے معالج اے اے برل نے نیویارک کی اکادمی ادویہ کے اس اجتماع کے سامنے جو اسقاط حمل کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، یہ بیان دیا کہ ''اسقاط حمل ایک لاینحل سماجی مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہمیں اس کی نسلی پیچیدگیوں کا صحیح علم نہیں''۔

اور ''نسلی پیچیدگیوں'' سے ان کا مطلب کیا ہے؟ ان کی مراد ان تبدیلیوں سے ہے جو ارتقا کے دوران میں رونما ہوئیں''۔

آگے چل کر ڈاکٹر برل ذرا صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ ''اسقاط حمل ثقافتی ناہمواری کی علامت ہے''.....حاصل کلام یہ کہ فطرت، انسان کو افزائش نسل پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن تہذیب اسے اس فعل سے

باز رکھنے یا صرف خاص قوانین کے تحت ایسا کہ کرنے کی اجازت دینا بہتر خیال کرتی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر برل سفارش کرتے ہیں کہ ''ہمیں چاہیئے کہ ہم ایماندار ڈاکٹروں کو مستحق افراد کی خواہش اسقاط حمل پوری کرنے کی اجازت دے دیں اور اس طرح عام حمل گرانے والوں کی حوصلہ شکنی کریں''۔

گویا اخلاقیات کو ڈاکٹروں کی تحویل اور حفاظت میں دے دیا جائے۔

اور یہ فیصلہ ڈاکٹر کے دفتر میں ہو کہ کسی عورت یا نوزائیدہ بچے کو جینے کا حق ہے یا نہیں۔یعنی ہر ڈاکٹر بیک وقت سلیمان بھی ہو اور جلاد بھی۔

لیکن امراض نفسانی کے اس ماہر کی رپورٹ میں نہ اس سوال کا کوئی جواب ملتا ہے کہ اسقاط حمل کی کہاں تک آزادی ہونی چاہیئے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ صورت حال کیا ہے؟

حال ہی میں ڈاکٹر آسلون، لاہمن، متیوس اور مشل نے ایک موقر جریدے میں اسقاط حمل کے مسئلے کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔انہوں نے ان حقائق کو فاش کر دیا ہے۔جنہیں محکمہ صحت عامہ اور پریس عوام کے سامنے لانے کی جرأت نہ کرتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسقاط حمل کے جتنے واقعات کی پڑتال کی ہے ان میں تیس فیصد کے مجرم بازاری ڈاکٹر ہیں اور 35 فیصد سے زیادہ کی ذمہ داری دائیوں پر ہیں اوسطاً پچاس فی صد حمل ایسی عورتوں نے ضائع کرائے جو کنواری تھیں یا پھر مطلقہ اور بیوہ۔

یہ مشہور حقیقت پسند ڈاکٹر فرماتے ہیں'' کہ گزشتہ بیس تیس سال سے حمل گرانے کی واردات میں ہولناک اضافہ ہوا ہے۔یہ حقیقت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ حمل گرانے کا مسئلہ دن بدن زیادہ اہم اور نازک ہوتا جا رہا ہے''۔

ہوسکتا ہے وہ قدرے مبالغہ کرتے ہوں۔لیکن ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں صرف 1941 میں 6 لاکھ 80 ہزار حمل ضائع کئے گئے اور جدید ترین حفاظتی طریقوں کے استعمال کے باوجود امریکہ میں ہر سال آٹھ ہزار عورتیں اس مجرمانہ اقدام سے موت کی نذر ہو جاتی ہیں۔ان ڈاکٹروں نے اسقاط حمل کی بڑھتی ہوئی تعداد کا سبب تلاش کرتے وقت کسی ''نسلی پیچیدگی'' کے پراسرار بہانے کا سہارا نہیں لیا۔بلکہ انہوں نے مندرجہ ذیل ٹھوس سماجی اسباب بیان کئے ہیں۔

حرام کی اولاد جننے پر رسوائی، والدین بننے کی ذمہ داریوں سے گریز، عام افلاس اور گزشتہ دس برس کا مسلسل اقتصادی بحران، کنبے کی تعداد کم سے کم رکھ کر معاشی معیار بلند کرنے کی خواہش، پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نظریات کا لامذہبیت کی طرف عام جھکاؤ وہ اس مسئلے کو ہنگامی قرار دیتے ہیں۔کیا وہ جھوٹ کہتے ہیں؟

ذرا خیال کیجئے کہ امریکہ میں ہر سال چھ لاکھ اسی ہزار بچوں کو پیدائش سے پہلے ہی ہلاک کر دیا جاتا ہے۔آپ اس کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں اور ادھر ہمارے برعظیم میں نوزائیدہ زندگیوں کا قتل عام جاری ہے۔فی منٹ فی جان کے حساب سے۔

دوسرے جمہوری ملکوں کا بھی کم وبیش یہی حال ہے، عوام اس صورت حال سے تاریکی میں ہیں۔ منظّم مزدور بے حس ہے، طبی اور قانونی ادارے اصلیت کو چھپاتے ہیں۔پادری اپنے منبروں پر خاموش ہیں اور ادھر اس اخلاقی جنگ میں جو ہمارے بے اخلاق معاشرے میں جاری ہے۔لاکھوں جانیں تلف ہو رہی ہیں۔

ہمارے ہاں ایسے ڈاکٹروں کی بھرمار ہے جو برل کی طرح کہتے ہیں کہ ''اسقاط حمل ایک لاینحل مسئلہ ہے، کیونکہ ہمیں ان نسلی پیچیدگیوں کا صحیح علم نہیں جو ارتقا کے دوران میں رونما ہوئیں''۔

ان حضرات کو چاہیئے کہ وہ ایک مرتبہ سوویت یونین ہو آئیں۔ کیونکہ سائنس وہاں ''نسلی پیچیدگیوں'' کے خاتمے اور ''ثقافتی ناہمواریوں'' کے سلسلے میں بہت کچھ کر گزری ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہاں کیا تبدیلیاں آئیں۔

انقلاب کے فوراً بعد اشتراکی سائنس دان اس فیصلے پر پہنچے کہ اسقاط حمل کا مسئلہ فوری توجہ کا طالب ہے، لہٰذا انہوں نے سوویت حکومت کو اس بات کا یقین دلایا کہ اسقاط حمل کی روک تھام نہ قوانین امتناعی کے ذریعے ہو سکتی ہے اور نہ ڈاکٹروں کو اندھا دھند انسانی زندگی تلف کرنے کی اجازت دینے سے۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ اسقاط حمل ایک سماجی مسئلہ ہے، جس کا تعلق معاشی اور اخلاق سے ہے۔ اس کے خلاف خفیہ جہاد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ تمام قوم کو اس کے اسباب دور کرنے اور نئے قومی اخلاق کی تبدریج تعمیر کے لیے وسیع پیمانے پر جدوجہد کرنی پڑے گی

لہٰذا سوویت حکومت نے عارضی طور پر اسقاط حمل کو قانوناً جائز قرار دیدیا لیکن ساتھ ہی اس پر سخت سماجی پابندیاں لگا دیں تا کہ رفتہ رفتہ اسے ختم کیا جا سکے۔

اگرچہ اس میں دو متضاد باتیں کہی گئی ہیں، لیکن حقیقت بالکل برعکس اور عام فہم ہے، ہوا یوں کہ سوویت یونین میں اس قانون کے اجرا کے ساتھ ہی خاص ہسپتال کھولے گئے۔ جن میں نہ ہر قسم کی طبی سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی بلکہ ان میں مشورے کے لیے مشاورتی بورڈ بھی بٹھائے گئے جو عورتیں یا لڑکیاں حرام کا بچہ نہ جننا چاہتیں انہیں ہدایت دی جاتی کہ ان ہسپتالوں میں جائیں اور خفیہ مدد لیں۔

سوویت یونین کے بدخواہوں کے پراپیگنڈے اور مذہبی لوگوں کے خیال کے برعکس ان ہسپتالوں کا کام ''خفیہ قتل'' نہ تھا، بلکہ عورتوں کو عمل جراحی یعنی آپریشن سے باز رکھنے کی کوشش کرنا تھا۔ اشتراکی حکومت کے ابتدائی ایام میں تمام ملک میں افلاس اور تباہی کا عمل تھا۔ اس کے باوجود مشاورتی بورڈ 50 فیصد سے زائد عورتوں کو حمل ضائع کرنے سے باز رہنے اور مائیں بننے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ محض مشاورتی بورڈوں کے قیام سے روس میں حمل گرانے کی واردات کی شرح پہلے سے آدھی رہ گئی تھی۔ اس کا سبب؟ جن لڑکیوں کو ناجائز حمل ٹھہر جاتا ہے۔ ان کی اکثریت پریشان اور خوفزدہ ہوتی ہے، کیونکہ انہیں کوئی ذمہ دار اور خیرخواہ مشیر نہیں ملتا جس سے وہ مشورہ کر سکیں۔ حمل کے ضائع کرنے کے متعلق ان کا علم سنی سنائی باتوں تک محدود ہوتا ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فوراً ایسا کر گزریں۔ تا کہ ان کا راز فاش نہ ہو اور وہ رسوائی سے بچ جائیں۔ اس قسم کی لڑکیوں کو اگر ہمارے ملکوں میں تجربہ کار اور ہمدرد مشیر مل جائیں، انہیں گرفتاری کا خوف نہ رہے اور بچوں کو جنم دینے کا فیصلہ کرنے پر انہیں ایام زچگی میں امداد اور بعد ازاں مستقل ملازمت کا یقین دلایا جائے تو نہ جانے کتنی اس حرکت سے باز رہنے کا فیصلہ کر لیں۔

روس میں ٹھیک اکیاون فیصد لڑکیوں اور عورتوں نے یہی فیصلہ کیا۔ باقی کے اصرار پر آپریشن کر دیئے گئے۔ آخر سرکاری ہسپتالوں میں یہ حرکت کیونکر گوارا کی گئی؟ وجہ صاف ہے، اگر نہیں وہاں سے مایوس لوٹنا پڑتا تو وہ سیدھی جرائم پیشہ لوگوں اور ناتجربہ کار ڈاکٹروں کے پاس پہنچتیں۔ اور عمر بھر کے لیے روگی ہو بیٹھیں۔ لیکن سرکاری ہسپتالوں میں ان کے آپریشن امراض زنانہ کے ماہرین نے بڑی احتیاط اور بے ضرر

آلات کے ذریعے کئے اور کوئی موت واقع نہ ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر آپریشن کرے تو عورت کے لیے جان لیوا ثابت نہیں ہوتا، چنانچہ روس میں اسقاط حمل سے واقع ہونے والی اموات کی شرح یک لخت صفر کے برابر جا پہنچی، دوسرے ملکوں میں جو خلاف قانون آپریشن ہوتے ہیں جو آپریشن جرائم پیشہ لوگ اور عام ڈاکٹر ضروری آلات کے بغیر کرتے ہیں۔ ان سے واقع ہونے والی اموات کے اعداد و شمار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشتراکی ڈاکٹروں نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے بارہ سال کے عرصے میں تقریباً تین لاکھ عورتوں کی جانیں بچائیں، چونکہ حکومت کی طرف سے محفوظ اور خفیہ آپریشن کا بندوبست کر دیا گیا اور گھبراہٹ میں ناتجربہ کار اور جرائم پیشہ لوگوں سے مہنگے آپریشن کرانے کی ضرورت نہ رہی۔ اس لیے بارہ سال کے عرصے میں چند اموات کی اطلاع ملی۔ جن کا موجب خلاف قانون آپریشن تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں آپریشن کو قانونی قرار دینے کے ساتھ ہی سوویت حکومت نے ایک اور قانون کے ذریعے خلاف قانون آپریشن کے لیے سخت سزا مقرر کر دی۔

اس اثناء میں اس مہم نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ عورتیں آخر یہ آپریشن کراتی کیوں ہیں؟ اس لیے کہ وہ اتنی بدکردار ہیں کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں، یہ جواب بالکل مضحکہ خیز ہے۔ اس مسئلے کو اجتماعی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ یہ اقدام اس لیے کرتی ہیں کہ ان میں اولاد کی پرورش کی طاقت نہیں ہوتی۔ بے شمار عورتوں اور لڑکیوں سے دریافت کرنے کے بعد اشتراکی سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید سماج میں اولاد والی ماں کی تعریف اور قدر زبانی تو بہت ہوتی ہے لیکن عملاً اکثر عورتوں کے لیے بچے کی پیدائش اور پرورش سخت سزا کے برابر ہے۔ حاملہ عوت سے ملازمت چھن جاتی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کا حاملہ ہو جانا بہت بڑی ذلت اور رسوائی ہے۔ اولاد والی عورت کے لیے زیادہ بچے جننا خود اپنے آپ، اپنے شوہر اور پہلے بچوں کو معاشی مصیبت میں مبتلا کرنے کے برابر ہے۔ اگر عورت حمل اور زچگی کے دوران میں طبی امداد حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تو اس کے لیے بچے کی پیدائش خطرناک جسمانی عذاب سے کم نہیں، جو اس کی ہلاکت کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں سوویت حکومت نے جو اقدام کئے انہیں بہت سے سماجی اور طبی ماہرین نے تفصیلاً بیان کیا ہے، مختصراً اقدام ایسے قوانین پر مشتمل ہیں، جن میں ہر کنواری یا شادی شدہ عورت کو ایام حمل میں مفت طبی امداد چھ سے بارہ ہفتے تک رخصت باتنخواہ صحت یاب ہونے کے بعد ملازمت پر واپس آنے کا حق، مقام ملازمت میں دو مہینے سے پانچ سال کی عمر تک بچے کی مفت پرورش اور نگہداشت، چھاتی سے دودھ پلانے والی ماؤں کو روزانہ کئی گھنٹے کی چھٹی اور مالی و معاشی امداد کی ضمانت دی گئی ہے۔

ان قوانین کے نفاذ کے ساتھ ہی وسیع پیمانے پر تعلیمی مہم چلائی گئی اور عام شہریوں کو ذہن نشین کرایا گیا کہ حکومت اولاد والی عورتوں کے لیے تمام سماجی اور معاشی مصیبتوں اور سزاؤں کو دور کر رہی ہے اور ہر عورت کے لیے ماں کے فرائض با اخلاق طریقہ سے سرانجام دینا ممکن ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ نئے سماج کے ایک محنتی فرد کی طرح قابل احترام حیثیت سے زندگی بسر کر سکے گی۔

اس تجربے کا تعلق اخلاقیات یعنی انسانی فطرت کی اصلاح سے تھا اور یہ تجربہ ایک ایسے ملک میں کیا گیا، جہاں بچوں کی شرح اموات اتنی زیادہ تھی، جتنی آج کل ہندوستان یا کیوبک میں ہے اور آج سوویت یونین میں بچوں اور ماؤں کی شرح اموات دنیا کے تمام ملکوں کے مقابلے میں سب سے کم ہے، وہاں ہر سال 60 لاکھ سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں ناجائز بچوں کی تعداد صفر کے برابر ہے،

حمل کو ضائع کرنا نہ صرف خلاف قانون ہے بلکہ اب یہ فعل بدفی الواقعہ ختم ہو گیا ہے۔

نئے جنسی اخلاق کی تعمیر کے متعلق اس تاریخی تجربے کے آخری حصے کا جائزہ لینا باقی ہے۔ جس کا تعلق شادی اور خاندان سے ہے۔

ماں بننے والی عورتوں کے راستے سے تمام معاشی رکاوٹوں کا دور کر دینے سے سوویت یونین کے عام باشندوں پر نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ ماں اور بچے سے متعلق قوانین عین اس وقت جاری کئے گئے جب کہ ملک بھر میں عصمت فروشی کے انسداد کی مہم جاری تھی۔ اس لیے عورتوں کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانے کی جدوجہد اپنے آخری مرحلے پر پہنچ گئی اور مذکورہ قوانین کی بدولت مرد و عورت میں اصلی مساوات قائم ہو گئی شادی کی راہ میں جتنی معاشی اور مالی رکاوٹیں تھیں وہ دور ہو گئیں اور تاریخ میں یہی خواب پہلی مرتبہ شرمندہ تعبیر ہوا کہ ''جوڑا بھی مجرد فرد جیسی زندگی گزار سکتا ہے''۔ نوجوان عشاق کے لیے شادی کرنا اور والدین بننا ممکن اور آسان ہو گیا، کیونکہ طلبہ تک کو وظائف ملتے تھے اور انہیں بھی دوسرے افراد کی طرح سماجی تحفظ حاصل تھا۔ اس سے نوجوانوں کی اخلاقی اصلاح پر بہت گہرا اثر پڑا، شادی میں تاخیر کی مصیبت کا خاتمہ ہو گیا اور نوجوان اپنی زندگیوں کی تشکیل کے نازک مرحلے میں محبت کی شادی اور والدین بننے کے مفید تجربے سے مستفیض ہوئے، نتائج نے ثابت کر دیا کہ اشتراکی کی سائنس دان ٹھیک کہتے تھے کہ بداخلاقی اور جنسی بے رہروی کی محرک انسان کی ''فطرت'' نہیں بلکہ بداخلاق اور گھٹیا قسم کی زندگی کے غیر فطری طریقے ہیں۔ غیر اخلاقی سماج اور معاشی نظام مردوں اور عورتوں کو بدی کی طرف دھکیلتا ہے۔ کیونکہ اس میں شادی اور ازدواجی زندگی وبال اور بھاری بوجھ ہے اور ہر دو اصناف یعنی مرد عورت برابر کے مظلوم ہیں۔ سوویت یونین سے 20 سال کے عرصے میں اخلاقی دوعملی ختم ہو گئی۔ مردوں نے محسوس کیا کہ شادی اور ازدواجی زندگی کے راستے سے رکاوٹیں دور کرنے اور عورتوں کو سماجی اور معاشی مساوات دینے سے نہ صرف عورتوں کو اوپر اٹھایا جا رہا ہے بلکہ انہیں بھی اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا جا رہا ہے۔

سوویت یونین کے مشہور قوانین طلاق آزادی نسواں کی مہم کا ایک اہم جزو تھے۔ وہ ہمارے ہاں کے قوانین سے بالکل مختلف تھے اور ان کا مقصد ہرگز وہ نہ تھا جو سوویت یونین کے بدخواہ دانستہ طور پر بتایا کرتے تھے۔

طلاق سے متعلق اشتراکی پالیسی کا مقصد انجام کار شادی اور خاندان کو تقویت بخشنا تھا اس کی بنیاد محبت اور شادی کے اس تاریخی تجزیے پر تھی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ سوویت یونین کے ابتدائی قوانین طلاق بہت نرم تھے۔ ان کے مطابق طلاق کے طالب مرد یا عورت کا رجسٹریشن آفس کی معرفت فریق مخالفت کو اتنا لکھ بھیجنا کافی تھا کہ شادی ختم ہوئی۔ بچوں کی حفاظت اور پرورش کے بندوبست کے علاوہ کوئی اور عدالتی کاروائی نہ تھی اور رجسٹریشن آفس کی فیس سینما کے ٹکٹ کی قیمت سے بھی کم تھی۔ سوویت یونین کے قانون سازوں نے ایسی ہر ایک شادی کو توڑ دینے کے حق کو تسلیم کیا، جس کی بنیاد محبت پر نہ ہو اور وہ اپنی اس منطق پر آخر تک قائم رہے کہ صرف دائمی محبت ہی شادی کا ثبوت ہے۔ مرد و عورت میں کسی وجہ سے محبت ختم ہو جائے تو شادی کو بھی ختم ہی سمجھنا چاہیئے اس لیے انہوں نے وہ تمام قانونی اور معاشی پابندیاں ہٹا دیں جو طلاق کی راہ میں حائل تھیں وجہ صرف یہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اگر شادی شدہ جوڑے میں سے کوئی فریق کسی غیر مرد یا عورت سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کرے، یعنی زنا یا عصمت فروشی کے ذریعے

جذبات کی تسکین کرنا چاہے تو سمجھا چاہیئے کہ ان کی شادی محبت پر مبنی نہیں اور ان کی زندگی سوگوار ہے۔

مطلب یہ کہ سوویت یونین میں قوانین طلاق کو بے میل اور جبر کی شادیوں کو ختم کرنے یا ایسی شادی کو توڑنے کے لیے استعمال کیا گیا جنہیں خلاف اخلاق تصور کیا جاتا تھا۔ زار شاہی روس میں ایسے بے شمار رشتے ناطے لاکھوں تھے۔ لہٰذا غیر مشروط طلاق کے ذریعے بے جوڑ شادیوں کی شکست اور محبت کی شادیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے قوانین اور دلائل آفاقی نہیں ہو سکتے۔ ان کا اطلاق محدود ہے۔ بہت سے لوگ اس صورت حال کا تصور کرتے ہی جو طلاق کے نرم قوانین کے ہمہ گیر نفاذ پر ہماری جمہوریتوں میں پیدا ہو سکتی۔ ان کی سخت تردید اور مخالفت کرنے لگیں گے۔ ہمارے ہاں ایسا قانون نافذ کر دیا جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ یہی کہ تقریباً تمام شادیاں فوراً ہی ٹوٹ جائیں گی۔ کیونکہ ہمارے ہاں اکثر رشتے طلاق کی قانونی اور مالی مشکلات کے طفیل قائم ہیں۔ یہ حقیقت بھیانک ضرور ہے۔ لیکن قابل تردید نہیں۔ انقلاب کے بعد مسلسل کئی سال تک روس میں بھی یہی صورت حال برپا رہی۔ لیکن آٹھ دس سال کے عرصے سے سوویت یونین میں طلاق کے واقعات کی تعداد متواتر گر رہی ہے۔ اس کا مقابلہ دوسرے ملکوں سے کیا جائے تو طلاق کی واردات کی کثرت اور سہل قوانین طلاق کی تحریک کی شدت پر آدمی چونک جاتا ہے۔ حالانکہ مذہبی لوگ اس کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس سوویت یونین میں طلاق کو سخت تر بنایا جا رہا ہے۔ نئے سماجی اخلاق کی بدولت شادی پائیدار ہوگئی ہے جو لوگ پے در پے طلاق دے کر نت نئی شادیاں کرتے ہیں، ان کی مذمت کی جاتی ہے۔ انسانی محبت کی شائستگی، حقیقی محبت کی پائیداری اور اس حیاتی ونفسانی حقیقت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ انسانوں میں جنسی تعلقات کی اعلیٰ ترین صورت دو افراد یعنی ایک مرد اور ایک عورت کا ایک دوسرے کے لیے وقف ہو جانا ہے اور جنسی تعلقات کی مکمل تسکین محض اس شادی میں ممکن ہے۔ جو مرتے دم تک نہ ٹوٹے باہمی محبت پر قائم رہے اور جو مشرف بہ اولاد ہو۔ 1944 کے موسم گرم میں ماسکو میں شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق سلسلہ قوانین کا اعلان کیا گئے اور سوویت یونین کے بعض نام نہاد دوست یہ جان کر عجیب شش وپنج میں مبتلا ہو گئے کہ وہاں کوئی شخص طلاق خرید نہ سکے گا۔ گویا طلاق نہ ہوئی ڈاک کا ٹکٹ ہوا لیکن عام ناقد مطمئن نظر آتے ہیں اور بعض مبصر سٹالن کی طرف اخلاق آموز انگلی اٹھائے ہوئے ہیں کہ روس ہمارے طرز زندگی کی طرف مائل ہے۔ کتنی شرمناک سہل انگاری ہے۔

ہمارے ملکوں میں عصمت فروشی عام ہے۔ نابالغوں میں جرائم کا دور دورہ ہے۔ جنسی بیماری کسی انسدادی کوشش سے متاثر نہیں ہوتی، شراب نوشی عام ہے۔ حمل گرانے کے واقعات پہلے سے دگنے چوگنے اور طلاق کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ایسے مبصر پائے جاتے ہیں جو یہ کہہ کر ہمیں تسلی دیتے ہیں کہ روس ہماری طرف مائل ہے۔ گویا بداخلاقی میں وہ ہماری تقلید کر رہا ہے۔

سیدھی بات ہے کہ شادی، ازدواجی زندگی، طلاق اور اسقاط حمل کے متعلق سوویت یونین کے حالیہ قوانین نئے اخلاق کی تعمیر کی مسلسل اور سائنٹیفیک منصوبہ بندی کی ایک کڑی ہے۔ دوسری لفظوں میں وہاں اس منزل مقصود کی طرف ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا ہے۔ جس کی طرف ہم اس کتاب میں مسلسل اشارہ کرتے چلے آرہے ہیں۔

سوویت یونین میں شادی کا نظام اخلاقی محبت کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے جس طرح وہاں

اسقاط حمل کے اسباب ختم ہو جانے پر چند سال سے اس کے خلاف سخت قوانین دوبارہ نافذ کر دیئے گئے ہیں۔اس طرح اب وہاں اس امر کی ضرورت اور امکان پیدا ہو گیا ہے کہ قوانین طلاق کو سخت کر دیا جائے، کیونکہ آزاد اور آسان طلاق کی ضرورت جو وہاں پہلے محسوس کی جاتی تھی، اب باقی نہیں رہی۔اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ وہاں شادی کی ناکامی کے معاشی اخلاقی اور سماجی اسباب بڑی حد تک ختم ہو گئے ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ صورتحال کا کھلا اعتراف قومی ضابطہ قانون میں کرنا ضروری ہے۔یہ ہیں قوانین طلاق کی ترمیم کے سادہ اور منطقی اسباب۔لیکن ہمیں اس کے برعکس بتایا جاتا تھا کہ سوویت حکومت نے ابتدا میں قوانین طلاق اس لیے نہ بنائے کہ سوشلزم بداخلاقی کا پرچار کرتا ہے۔لیکن حقیقت حال یہ تھی کہ یہ قانون محض ایک عارضی اقدام تھے اور ان کا مقصد بداخلاقی پھیلانے کی بجائے طلاق جیسی بداخلاقی کو سرے سے ختم نہیں تو اس کی تعداد میں ہر ممکن کمی کرنا تھا۔

سوویت حکومت نے 18 دسمبر 1917 کو دو انقلابی قانون منظور کئے۔پہلا قانون شادی پیدائش بچوں، اور موت کے اندراج کے متعلق تھا اور دوسرے کو قانون شادی وطلاق کہتے ہیں چونکہ یہ قانون بالکل نئے تھے، اس لیے دنیا بھر میں ان کے خلاف غلط اور جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا۔ایک قیامت برپا کر دی گئی۔لیکن آج یہ قوانین حالات و واقعات اور نئے قوانین کے نفاذ سے بیکار ہو گئے ہیں۔تو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ سب لوگ خاموش ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس تبدیلی کی خبر تک نہیں۔

آیئے ہم چند لمحوں کے لیے ان قوانین سے آگاہی حاصل کریں۔

میں نے مندرجہ ذیل رپورٹ سوویت یونین کی ایک مشہور وکیل عورت بتیسوفہ سے حاصل کی ہے۔جہاں تک حقائق کے قابل اعتبار ہونے کا تعلق ہے۔ہم یہ فیصلہ قاری کی اپنی عقل سلیم پر چھوڑتے ہیں۔وہ فرماتی ہیں۔

سوویت یونین کے قوانین شادی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عورت کو قانونی اعتبار سے آزاد کر دیا۔اسے مردوں کے برابر حقوق دیئے اور عدم مساوات کے آخری قلعے میں شگاف ڈال دیا۔یعنی خاندان میں مساوات پیدا کی۔ جہاں صدیوں پرانے رواج کے مطابق عورتوں کی مظلومیت کو قانونی درجہ مل چکا تھا اور عورتوں پر ظلم وستم وتشدد روزانہ کا معمول اور ایک امر مسلمہ تھا۔عورتوں کو مظلومی اور غلامی پر مردانہ قبائلی نظام کے سماجی رشتوں کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

''لیکن محض نئے قوانین بنا دینے سے سوویت حکومت کو پرانی شادیوں کے بارے میں جو زارشاہی قوانین کے ماتحت ہوئی تھیں۔خود بخود کوئی اختیار حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ان شادیوں کو ناجائز قرار دینے کے لیے صرف یہ کہنا کافی نہ تھا کہ زارشاہی عہد میں اکثر شادیاں ایسی عورتوں کے ساتھ طے پائی تھیں۔جن کو شادی جیسے اہم معاملے میں آزادانہ فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ذرائع حاصل تھے، نہ طاقت اور آزادی۔جن بنیادوں پر زارشاہی روس کے خاندان قائم تھے۔اشتراکی ضابطہ قانون انہیں جائز قرار نہیں دے سکتا تھا۔لیکن انہیں محض اس بنا پر توڑا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ انقلاب سے پہلے جتنی شادیاں ہوئیں وہ بے لوث محبت اور باہمی احترام کے جذبات پر مبنی نہ تھیں۔ بلکہ مادی مفاد اور بارسوخ رشتہ داروں کے حصول کے پیچیدہ نظام پر قائم تھیں۔

''چونکہ انقلاب اکتوبر کا مقصد انسانوں کے درمیان ہر قسم کے عدم مساوات یعنی انسان کی انسان کے ہاتھوں ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنا تھا۔اس لیے خاندان جیسے اہم حلقہ رشتہ داری کو جوں کا توں کس

طرح رہنے دیا جاتا۔ دسمبر 1917 کے قوانین شادی نے خاندان کے متعلق ایک نیا اصول قائم کیا۔ وہ اصول آزاد انتخاب کا اصول تھا اس اصول کے ساتھ ہی یہ اعلاج کیا گیا کہ آج سے سوویت یونین کا ہر کنبہ محبت، باہمی احترام اور مرد و عورت کی مساوات پر قائم کیا جائے گا۔

''ظاہر ہے ایسا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اشتراکی قانون وہ پابندیاں ہمیشہ کے لیے اٹھا دے جو طلاق کے رستے میں حائل تھیں، کیونکہ زار شاہی روس میں صرف کلیسا کی مداخلت پر ہی طلاق حاصل کی جا سکتی تھی اور کلیسا نے اس پر نہایت ہی اخلاق سوز پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔

جن پابندیوں کو روس کی نئی عورت اخلاق سوز کہتی ہے، وہ ہو بہو ویسی ہی ہیں جیسی کہ آج روس کے باہر اکثر ملکوں میں عائد ہیں۔ قصہ کوتاہ ہمارے ہاں کے اکثر قوانین طلاق کی طرح زار شاہی کے زمانے کے قوانین طلاق کی رو سے بھی طلاق صرف اسی صورت میں دی جاتی تھی جب کہ گواہ یہ ثابت کر دیں کہ مرد یا عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اپنی دلیل کے ثبوت میں بیلسوفہ نے ان المیوں کا حوالہ دیا۔ جنہیں طالسطائی نے اپنے ناول ''اینا کرنینا'' اور ''زندہ لاش'' میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ قانون کی تلاش کے تلے انسانی تعلقات اور احساسات بری طرح پامال اور مردہ ہوتے جا رہے تھے''۔

1917 کے قانون طلاق کی پہلی طلاق کی پہلی دفعہ کے مطابق ایک فریق یا دونوں فریقوں کی درخواست پر شادی منسوخ کی جا سکتی ہے۔ دوسری دفعہ بھی اسی طرح انقلاب پسندانہ تھی۔ اس کے مطابق تنسیخ شادی (طلاق) کسی عدالتی کاروائی کے بغیر محض رجسٹرار کے دفتر میں درخواست دینے سے حاصل کی جا سکتی تھی۔

تاہم موصوفہ اس بات کا اعتراف کرتی ہیں۔ کہ ''اس میں شک نہیں کہ اس قانونی رعایت کا ناجائز استعمال بھی ہوا۔ بعض ایسے لوگ جو اخلاق سے قطعاً عاری تھے انہوں نے محض ہوس پرستی کے لیے متعدد عورتوں سے نکاح کئے اور سوویت یونین کے قوانین طلاق کے جمہوریت دوست اصولوں کو نام نہاد ''آزاد محبت'' کے نظریے کے حامیوں نے غلط معنی پہنائے، انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ قانون ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہیں کہ خاندان غیر ضروری چیز ہے کیونکہ یہ انفرادی آزادی کو ختم کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود 1917 کے قانون طلاق کی اشد ضرورت تھی اور وہ بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس نے رشتہ شادی کو عورت کی غلامی اور خاندان میں عدم مساوات کا ذریعہ بنانے کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا''۔

رکاوٹوں کو پھاند جانے کا پکا ارادہ کرنا تھا۔ یہ جدوجہد ایک مشکل اور پیچیدہ ترین نفسیاتی جدوجہد تھی اور یہ اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی دشوار تھی کہ روسی عورت کے سامنے کوئی مثال نہ تھی۔ جس سے اسے کچھ مدد ملتی۔

''دنیا میں ایسی کوئی مثالی عورت موجودہ نہ تھی جس میں وہ تمام شخصی اور سماجی خوبیاں موجود ہوں، جن کی بدولت وہ مرد کے ہم پلہ بھی ہو اور اپنے فطرت اوصاف، اپنی نسوانیت، اپنے وقار اور مادرانہ شفقت کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہو۔ کیونکہ یہ اوصاف عورت کی فطرت کا لازمی جزو ہیں۔ انسانیت کا ماضی نسوانی سیرت کے ایک پہلو کی مثال پیش کرتا تھا اور قدرتاً وہ کسی ایسی عورت کو پیش کرنے سے قاصر تھا۔ جس کا متوازن اور ہمہ گیر ارتقا ہوا ہو۔ ایسی مثال ماضی کے بجائے مستقبل ہی پیدا کر سکتا تھا''۔

یہ قانون دان خاتون اس عہد کے ابتدائی دنوں کی تصویر نہایت بے باکی اور وضاحت سے پیش

کرتی ہیں۔ جب کہ عورتوں نے نئے قوانین طلاق کو ذہنی طور پر قبول کر کے اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنا شروع کیا۔ یعنی جس زمانے میں روس میں طلاق اس قدر عام تھی کہ ہمارے ملکوں میں اسے طنزاً بڑ کی مہر والی طلاق'' کہا جاتا تھا۔ اس وقت جو صورت حال تھی اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

''حالات ایسے تھے کہ عورت کو نئے سماجی مقام تک اٹھانے کے لیے نئے سوویت معاشرے کو صرف اپنے ذرائع سے کام لینا تھا اور اشتراکی تحقیق محض نظریے تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اسے زندگی کے تجربے سے عملاً نتائج اخذ کرنا تھے۔ اس لیے بعض اوقات غلطیوں کی صورت میں مردوں اور عورتوں کے لیے ناقابل برداشت ذاتی مصائب پیدا ہو جاتے تھے خاندانی تعلقات کے بگڑنے اور گھریلو جھگڑے پیدا ہو جانے سے یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ اور دشوار بن جاتا تھا۔

لیکن پنجسالہ معاشی منصوبوں پر عمل درآمد کے زمانے میں نہایت ہی خوشگوار تغیر رونما ہوا لاکھوں عورتوں نے صنعت، ہوابازی، سائنس، انجینئرنگ اور آرٹ میں مہارت حاصل کر کے اپنا معاشی اور ثقافتی معیار بلند کر لیا اور اس عہد میں سب سے زیادہ جہاد نفس عورتوں نے کیا۔

چنانچہ بیلسوفہ فرماتی ہیں:۔

''عورت کے لیے سب سے زیادہ مشکل قربانی یہ تھی کہ اسے اپنے خاندان اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا اور اسے اپنے گھر اور خاوند کی طرف کم از کم توجہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ لہٰذا یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ عورت کو اپنے لباس بالوں، چہرے وغیرہ کی آرائش کی فرصت ہی نہ ملتی تھی''۔

1930 اور 1939 کے ہمارے ہاں کے بہت سے ''ناقدین'' نے حصول منفعت کی غرض سے سوویت کی سیاحت کی، لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اشتراکی لڑکیوں کے ظاہری فقدان کشش کی وجہ سمجھنے کی کوشش کی اور کتنوں نے یہ محسوس کیا کہ اشتراکی عورت نے کچھ عرصے کے لیے بناؤ سنگھار، بالوں کی آرائش، ناخنوں کی سجاوٹ، فیشنی جوتوں اور دوسرے جوتوں اور دوسرے سامان آرائش کو ''تمام انسانیت کے بہبود کی مشترکہ جدوجہد'' پر قربان کر دیا تھا

محترمہ بیلسوفہ فرماتی ہیں۔

''روسی عورتوں نے اکثر ضروریات زندگی کو ترک کر کے، خوبصورت لباس اور دوسرے آرائشی سامان کی قدرتی نسوانی خواہش کی کم از کم تکمیل اور وقت میں کفایت کر کے بے غرض مشقت کے ذریعے ہزار ہا سال کی ارتقائی کمی کو پورا کیا اور حقیقی مساوات کی شاہراہ پر گامزن ہو گئیں''۔

حالانکہ ہمارے ہاں اکثر ناقدین سوویت زندگی کو بہت قریب سے دیکھ آئے ہیں۔ لیکن بھی وہ اس بے ہودہ رائے کا اظہار کرنے سے نہیں شرماتے کہ

''اشتراکی لڑکیوں کو معلوم ہی نہیں کہ انہیں کیا درکار ہے''۔

محترمہ بیلسوفہ جواب دیتی ہیں:۔

''ہر اشتراکی عورت اس عارضی مگر ضروری محرومی سے باخبر تھی۔ اس نے خوشحالی اور مضبوط گھرانے کی خواہش، ماں بننے کی مسرت، محبت کے انسانی جذبات اور شوہر کے ساتھ رفیقانہ تعلقات، آرام اور نسوانی تمناؤں کو کبھی فراموش نہ کیا''۔

تاہم عارضی طور پر ایک عجیب اور غلط رجحان ضرور پیدا ہوا۔ بعض عورتیں انتہا پسند ہو گئیں۔ انہوں نے حقیقی مساوات اور ظاہری یکسانیت میں تمیز نہ کی اور عادات واطوار اور لباس میں مردوں کی تقلید کرنے

لگیں۔لوگوں نے ایسی عورتوں کوایک خاص نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔جس کا انقلابی عہد کے ابتدائی دشوار ایام میں خوب شہرہ تھا۔یعنی انہیں مذاقاً فوجی اشتراکیت کے نمونے کہنے لگے۔ظاہر ہے ایسی عورتیں عام مجالس میں زیادہ نمایاں ہوتی تھیں اور غیر ملکیوں کی نظریں تو خاص طور سے سیدھی انہی پر پڑتی تھیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔ پنجسالہ معاشی منصوبے پر کامیاب عمل درآمد کے دور میں سوویت یونین کا عام معیار زندگی بہت بلند ہوا اور عورتوں کی حیثیت میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔اب اسے اس سوال سے نجات مل گئی کہ وہ گھر کا کام کاج کرے یا ملازمت، اطمینان سے انفرادی زندگی گزارے یا سماج کی گراں قدر خدمت سرانجام دے؟ اب وہ حسب منشا زندگی بسر کرسکتی تھی۔بیلسوفہ کا قول ہے۔

''جس عورت نے اپنی فعالیت اور عملی جدوجہد سے رائے عامہ کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ بھی ایک کامیاب انجنیئر ،ہوا باز، ڈاکٹر، سائنسدان، زرعی فارم کی صدر یا انعامی کارگر بن سکتی ہے اب اس کے سامنے ذاتی فلاح، بچوں کی پرورش اور تربیت کے بیشمار مواقع تھے اب اس کی حیثیت مرد کے برابر ہو گئی اور نیا اشترا کی خاندان سن بلوغ کو پہنچ گیا''۔

نیلسوفہ کی زبانی اس نئے دور کی خصوصات یہ ہیں۔

''آج سوویت یونین کی ہر عورت شادی کے فیصلے میں آزاد ہے۔اس پر مادی منفعت کا کوئی خیال یا کوئی قانونی یا دوسری ناہمواری اثر انداز نہیں ہوسکتی وہ اشترا کی برادری کی باوقار اور معزز رکن ہے۔وہ اپنی خانہ آبادی اور خاندانی مسرتوں کے انتخاب میں بالکل آزاد ہے۔عورت سے متعلق مرد کے زاویہ نگاہ میں بھی مساوی تغیر واقع ہو چکا ہے۔عورت کا تمسخر و عجز اور مرد کی خود پسندی یہ دونوں چیزیں جو نئے کنبے کو قدیم زار شاہی سے ورثے میں ملی تھیں، اب ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئی ہیں۔ نئے اشترا کی گھرانے کی تعمیر بالکل اچھوتی بنیادوں پر ہو رہی ہے۔

خاندان کی نئی ساخت اس وقت تک ناممکن تھی۔ جب تک عورت کو پوری آزادی یعنی مساوات حاصل نہ ہو جاتی۔ چنانچہ بیلسوفہ کہتی ہیں۔

''آج سوویت یونین میں ایسے تمام قانونی اور عملی لوازمات پیدا کئے جا چکے ہیں۔جن کے بغیر ایسے خاندان کی تعمیر مشکل ہے۔جس کی بنیاد مرد و عورت کے درمیان پر خلوص احساسات محبت، دوستی اور احترام، ہم خیالی اور مزاج کی ہم آہنگی ہو''۔

انسانی خاندان میں اس انقلابی ترقی کے بعد 1917 کے قوانین بیکار ہو گئے۔ جنگ عظیم سے پہلے نہ صرف زار شاہی روس بلکہ ہمارے ملکوں میں بھی خاندان کی تباہی کا دور شروع ہو چکا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے ہاں تو آج تک جاری ہے اور بے شمار گھریلو مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔سوویت یونین میں ان تمام مسائل کو پوری طرح حل کر لیا گیا اور وہاں کے باشندے اب اپنی توجہ بڑے بڑے معاملات کی طرف مبذول کرنے کے قابل ہو گئے۔

اب وہ اپنے مستقبل کو شاندار بنانے اور اپنی آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے کوشاں ہو گئے، سوویت حکومت پر شروع سے یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ انسانی خاندان کی تباہی کی خواہاں ہے اور تمام بچوں کو ریاست کے محافظین کی حیثیت سے پالنا چاہتی ہے لیکن واقعات نے اس الزام کی تردید کر دی۔ سوویت یونین نے گزشتہ بیس برس میں خاندانی زندگی کا جو نیا اور بلند معیار قائم کیا وہ مرد عورت، زن وشوہر کے تعلقات میں انقلابی تبدیلی کئے بغیر حاصل نہ ہوسکتا تھا۔سوویت یونین کے نئے قوانین شادی

وخاندان کا مقصد اسی معیار کو پائیدار بنانا ہے۔

وہاں 8 جولائی 1944 کو جو نئے قوانین پاس ہوئے، ان کے نفاذ پر ہمارے ہاں کے اخباروں میں بڑی سرعت سے سخت قسم کی تبصرہ بازی شروع ہوگئی، لیکن حیرانی کی بات ہے کہ نام نہاد تبصرہ نگاروں نے ان انقلابی تغیرات کی طرف اشارہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی جو اس سے پہلے سوویت خاندان میں رونما ہو چکے تھے۔

ان قوانین کا اعلان کیا گیا تو روس کے باہر ہر کہیں ادھم مچایا گیا کہ روس نے اپنی ابتدائی پالیسی کو اچانک اور حیران کن طریقے سے منسوخ کر دیا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ 1927 میں سوویت یونین کو بڑی بڑی وفاقی جمہوریتوں میں جنہیں سوشلسٹ فیڈریشن آف سوویت ری پبلکن کہتے ہیں۔ نہایت ہی اہم قانونی تغیرات رونما ہوئے۔ یہ نئے قوانین شادی کے متعلق تھے۔ آیئے ان کی نوعیت پر غور کریں۔

ان قوانین نے اس قسم کے انسانی تعلقات کو قانونی شکل دے دی، جیسے ہمارے ہاں قانوناً جائز ہیں۔ یعنی رسمی شادی کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔ 1927 سے پہلے سوویت روس میں صرف وہی شادیاں قانوناً جائز تھیں۔ جن کا اندراج سرکاری رجسٹرار خود کرتے تھے۔ لیکن 1927 کے قوانین میں رسمی شادی کو ایک حد تک ناجائز تسلیم کر لیا گیا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ رسمی شادی کو رجسٹرڈ شادی کے برابر تسلیم کر لیا گیا۔ شادی کا رجسٹر ہونا اب بھی نکاح کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ لیکن سماجی اور معاشی بحران کے دور میں جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کا مزید قانونی تحفظ لازمی تھا۔ اس لیے نئے مجموعہ قانون میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ رسمی شادی کے بعد ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے والے مرد اور عورت کو رجسٹرڈ شادی کی شرائط سے بری الذمہ تصور نہیں کیا جائے گا۔

رسمی شادی کے مندرجہ ذیل عملی ثبوت ہیں:۔

1- دونوں فریق اکٹھے رہتے ہوں۔

2- عام لوگ انہیں شوہر اور بیوی کی حیثیت سے جانتے ہوں۔

3- ان کے پاس مشترکہ گھر ہو۔

4- وہ ابھی تک یا پہلے سے ایک دوسرے کے روٹی کپڑے کا خرچ برداشت کرتے رہے ہوں اور دونوں اپنے بچوں کی پرورش کرتے رہے ہوں۔

ظاہر ہے اس قانون سے ایسے عورتوں کا تحفظ مقصود تھا۔ جنہیں غیر ذمہ دار مرد رجسٹرڈ شادی کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے چھوڑ کر الگ ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طلاق اگرچہ قانوناً کسی بھی رجسٹریشن آفس سے نہایت ہی کم قیمت پر حاصل کی جا سکتی تھی لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ عام لوگ کسی معقول سماجی وجہ کے بغیر طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ عام لوگ ان سے سخت نفرت کرنے لگے تھے اور جن افراد کو کئی بار طلاق ہو جاتی تھی ان کے عزیز اور بزرگ ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے لگے تھے۔ لہٰذا ایسے ماحول میں بعض غیر ذمہ دار افراد میں ناجائز جنسی تعلقات پیدا کرنے کا رجحان پیدا ہونے لگا تھا اور اس کا تدارک لازمی تھا۔

1927 کے قانون شادی کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں میاں بیوی کی نجی جائداد کا فیصلہ خاص طور سے کیا گیا ہے۔ آج بہت سے لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ سوویت حکومت

شخصی جائداد کو ختم نہیں کرتی اور نہ وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن وہ ایسے اداروں کی شخصی ملکیت کو برداشت نہیں کرتی جو منافع اندوزی کی غرض سے دوسروں کی محنت کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ یعنی سوویت روس میں سرمایہ دارانہ ملکیت کو ختم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رسمی شادی کے قانون میں میاں بیوی کی تمام نجی جائداد کو دونوں کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اگر رسمی شادی کے قانون میں میاں بیوی کی تمام نجی جائداد کو دونوں کی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اگر رسمی شادی ٹوٹ جائے تو میاں بیوی کی مشترکہ شخصی جائداد کی مساوی تقسیم اور بچوں کی پرورش کے انتظام کے لیے عدالتوں کے دروازے کھلے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی قرار پایا کہ اگر فریقین میں سے کوئی ایک کام کرنے کے ناقابل ہو تو دوسرا فریق ازدواجی تعلقات ختم ہو جانے کی صورت میں بھی اس کے روٹی کپڑے کا ذمہ دار ہوگا۔

ماسکو کے سرکاری وکیل، براندوف کا کہنا ہے کہ 1927 کے قانون کے رو سے رسمی شادی صرف مذکورہ بالا دو شرائط کے اعتبار سے رجسٹرڈ شادی کے برابر ہے۔ اس قانون میں جائداد کے حق وراثت کو نظر انداز کر دیا گیا لیکن خاص صورتوں میں عدالت عالیہ وراثت کا فیصلہ بھی کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ باقی دوسرے حقوق کو بھی چھوڑ دیا گیا جو رجسٹرڈ شادی میں واجب ہیں۔

براندوف کہتے ہیں کہ ''البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سوویت یونین میں چونکہ ساٹھ چھوٹی بڑی قومیں آباد ہیں، اس لیے وہاں کوئی واحد قانون شادی یا دوسرے رسم ورواج سے متعلقہ مسائل کا بیک وقت احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بیاہ شادی اور رسم ورواج کے بارے میں قانون بنان کا کام مختلف جمہوریتوں کے اختیار میں ہے۔ سولہ وفاقی ریاستوں میں سے ہر ایک اپنا الگ ضابطہ قانون رکھتی ہے۔ تاہم چند قانون ایسے بھی ہیں جن کا اطلاق ملک کے تمام علاقوں پر ہوتا ہے''۔ وہ مثال میں جمہوریہ یوکرین کو پیش کرتے ہیں۔ جہاں 1927 کا قانون شادی کبھی لاگو نہیں ہوا اور رجسٹرڈ شادی کے علاوہ کسی دوسری شادی کو قانوناً تسلیم نہیں کیا گیا۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ نہ صرف 1944 کے قوانین کے نفاذ کے وقت سے بلکہ اس سے سترہ سال پہلے بھی سوویت یونین میں رسمی نکاح اور رجسٹرڈ شادی میں خاص امتیاز روا رکھا جاتا تھا، یعنی رجسٹرڈ شادی کو رسمی نکاح پر ترجیح دی جاتی تھی اور اسے افضل مانا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں تمام یونین میں 1944 میں ایک اور خاص قانونی تبدیلی رونما ہوئی جسے ہمارے ہاں کے مبصرین نظر انداز کر جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ رسمی نکاح کو اب کسی قسم کی قانونی حمایت حاصل نہیں۔ اس ترمیم کی وجہ بالکل عام فہم ہے۔ سوویت یونین میں شادی اور خاندان ترقی کر کے اس درجے تک پہنچ گئے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کے تحفظ کے لیے آفاقی، مسلمہ اور قانونی شادی کے علاوہ کسی دوسرے نکاح کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ یعنی سوویت سماج میں ارتقائی ہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ تمام معاشرہ ترقی کی ایک ہی سطح پر ہے اس لیے تمام سوویت یونین کے لیے اب ایک ہی قانون کافی ہے۔ پہلے کی طرح ایک سے زیادہ قوانین کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میں نے سوویت یونین کی اکادمی علم کے ادارہ قانون کے ایک ممبر اور مصنف پروفیسر سورولوف سے مارچ 1945 میں اس سلسلے میں مزید اطلاعات حاصل کیں۔ انہوں نے مجھے بتایا۔

''سوویت یونین میں رسمی شادی کی تاریخ بڑی سبق آموز ہے۔ 1918 میں قوانین شادی کا جو ضابطہ شائع کیا گیا۔ اس میں بے قاعدہ ازدواجی رشتوں کو قانونی تحفظ کی ضمانت نہ دی گئی۔ کیونکہ ایسا

کرنے سے خاندان کی بنیادیں ہل جاتیں۔حکومت نے پہلے دن سے ہی خاندان اور اس کے استحکام کی طرف خاص توجہ کی تا کہ پائیدار اور صحت مند خاندان کے قیام کے لیے راستہ ہموار ہو جائے''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر موصوف کا یہ بیان درست ہے تو سوویت یونین نے رسمی شادی کو 1926 میں یعنی آٹھ سال تک اسے تسلیم نہ کرنے کے بعد یکا یک قانوناً جائز کیوں قرار دے دیا۔

پروفیسر سورولوف فرماتے ہیں۔

''اشتراکی ریاست اور اس کے معاشی نظام کے ارتقا کی ابتدائی منزل میں رسمی شادی کو قانوناً جائز قرار نہ دیا جاتا تو عورت کے مفاد کو شدید صدمہ پہنچتا۔اس وقت عوام کا ثقافتی اور مادی معیار بلند نہ تھا۔ جنگ کی خوفناک تباہی کے بعد بحالیات کا دور آیا تو افلاس اور بیروزگاری کا مسئلہ بڑی شدومد سے سامنے آیا۔ان حالات میں مفلس اور بے کس عورتیں مادی اعتبار سے خوشحال مردوں کے ساتھ رسماً ازدواجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوئیں۔

''لہٰذا رسمی شادی میں ہر عورت کے لیے روٹی کپڑے کے ماہوار خرچ اور حق وراثت کا قانوناً تعین نہ کیا جاتا تو نقصان صرف عورتوں کا تھا۔لہٰذا سوویت حکومت اس صورت حال کو عام نہ ہونے دے سکتی تھی''۔

یہ اشتراکی قانون دان مزید فرماتے ہیں''۔اس کے بعد حالات پہلے سے زیادہ خوشگوار ہو گئے۔ بے روزگاری ختم ہوگئی۔عورتوں کو تعلیم و تربیت اور ملازمت کے مواقع بہم پہنچائے گئے۔لاکھوں عورتیں صنعت کار بن گئیں اور انہوں نے ملک کی معاشی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی جدوجہد میں کارہائے نمایاں کئے۔روس پر جرمنی کے حملے سے ایک کروڑ 10 لاکھ عورتیں کارخانوں یا دفتروں میں اور ایک کروڑ 90 لاکھ زرعی فارموں میں کام کرتی تھیں۔جنگ کے آغاز کے وقت کارخانوں کام کرنے والے افراد کی کل تعداد میں 45 فیصد عورتیں تھیں۔

علاوہ ازیں عورتوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا اور ساتھ ہی حکومت نے ان کی مالی امداد بھی بڑھا دی۔بچوں کے لیے نئے سکول، نرسریاں (جہاں نرسیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں) کنڈرگارٹن (جہاں عملی اسباق کھلونوں، کھیلوں وغیرہ کے ذریعے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے) اور کریشنز دودھ پیتے بچوں کی پرورش کے ادارے کھولے گئے۔ان کے علاوہ حکومت نے خاندان کی مادی بہبود کے مختلف اداروں میں اضافہ کیا۔اس طرح ازدواجی زندگی کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

پروفیسر سورولوف محترمہ بیلسوفیہ سے اتفاق کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اس مادی بنیاد میں سے مرد و عورت، میاں بیوی کے درمیان تعلقات کا تعین کرنے والے نئے محرکات پیدا ہوئے۔اب عورتوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے قانونی احکامات اور رسمی شادی کی حفاظت ضروری نہ رہی اب کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ رسمی نکاح کرتی تو لوگ اس کے رویے شادی اور خاندان کے لیے نقصان دہ تصور کرتے اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے''۔

تسلیم یہ ہمارے لیے واقعی حیرانی کی بات ہے کہ ازدواجی رشتوں کے استحکام اور خاندان کے تحفظ جیسے نازک مسائل کو قانون ساز لوگ حل کر سکتے ہیں۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہمارے ملکوں میں شادی، طلاق، روٹی کپڑے کے خرچ وغیرہ کے قوانین میں تبدیلیاں کرانے کے لیے بے پناہ شور برپا ہے۔البتہ اکثر مجوزہ تبدیلیاں قوانین طلاق کو نرم کرنے کے متعلق ہیں۔دوسرے لفظوں میں یہ تحریک نرم اور سہل

طلاق کے لئے جاری ہے۔

شادی کے متعلق سوویت یونین اور ہمارے ہاں کے قانونی اقدامات میں جوفرق ہے اس کا تعین اتنا مشکل نہیں، سوویت یونین میں پے بہ پے قانونی تبدیلیاں اس لیے کی گئی ہیں کہ ازدواجی قوانین کو سوویت سماج کے عظیم معاشرتی اور معاشی تغیرات سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں قوانین شادی کی تجدید کے مطالبے کا بڑا محرک وہ خیالی نظریہ ہے۔ جسے ''ترقی پسند'' وکیل، جج، قانون ساز اور پادری تک ''محبت اور اخلاق'' کے متعلق ''نئے زاویہ نگاہ'' کا نام دیتے ہیں یعنی یہاں معاشی تبدیلی کے بغیر قانونی تبدیلی کی توقع کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں سوویت یونین میں عورت کی سماجی حیثیت کے تحفظ استحکام اور انجام کار خود شادی کی پائیداری، یعنی میاں بیوی، بچوں اور تمام خاندانی رشتوں کی استواری کی خاطر قوانین شادی میں ترمیم کی گئی۔ لیکن ہمارے ہاں قوانین شادی میں ترمیم کا مطالبہ کرتے وقت ایسے مقاصد کا نام تک نہیں لیا جاتا اور اس کے برعکس قانون طلاق میں ترمیم کے مطالبے کی سخت مخالفت کی جاتی ہے اور مخالفت میں زیادہ تر ایسے لوگ پیش پیش ہیں جنہیں خدشہ ہے کہ قانون طلاق میں مزید ترمیم ہوگئی تو ازدواجی زندگی اور خاندان کی جڑیں اور بھی کمزور ہو جائیں گی۔ ''یہ حقیقت پسند حضرات'' بار بار چلاتے ہیں کہ ازدواجی زندگی بہت زیادہ پست اور شادی سے پہلے سے زیادہ ناپائیدار ہوگئی ہے اور طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے۔ اس لیے قوانین طلاق پر نظر ثانی کی جائے اور خاندان کی تباہی کا جائزہ لیا جائے۔ اگر ہم سوویت یونین کے قوانین شادی و خاندان مجریہ 1944 کے بنیادی نکات کو دیکھیں تو حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

اولاً جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ سوویت یونین میں اب رسمی شادی کو قانوناً تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلے میں سوویت یونین نہ صرف قانون بنانے میں بہت سے ملکوں سے آگے ہے۔ بلکہ اس لیے بھی اسے سب پر فوقیت حاصل ہے کہ وہاں رسمی شادی کے لیے کوئی معاشی اور سماجی وجہ جواز نہیں رہی۔

ثانیاً، سوویت یونین میں اب شادی پہلے کی طرح ایک عام اور سیدھا سادا طریق نکاح نہیں ہے۔ وہاں آج کل شادی کا خواہش مند جوڑا سب سے پہلے رجسٹرار کے سامنے پیش ہوتا ہے اور خلیفہ بیان دیتا ہے۔ کہ ان کی شادی ہر قسم کے قانونی اعتراض سے مبرا ہے، لڑکا اور لڑکی دونوں شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی تندرستی سے باخبر ہیں اس کے بعد وہ اپنی تمام پہلی شادیوں (بشرطیکہ ان میں سے کسی نے کوئی کی ہو) کا ریکارڈ پیش کرتے ہیں۔ اس صورت میں رجسٹرار بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اگر پہلی شادی سے کچھ بچے ہوں تو رجسٹرار کا فرض ہے کہ ان کی پرورش کے انتظام کی تصدیق کرے ورنہ انکار کر دے۔ کہ شادی نہیں ہوسکتی۔ سوویت یونین کے باشندے ''حلفیہ بیان'' کے سلسلے میں بہت سنگین سزا سے متعلق قانون پڑھ کر سنائے۔ یہ تمام شرطیں پوری ہو جائیں، تب کہیں جا کر درخواست دینے والے جوڑے کی شادی ہوتی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سوویت یونین کے قانون شادی کی ایک شق ہمارے ہاں کی بعض مذہبی قیود سے ملتی ہے۔

اگر چہ وہاں شادی کی درخواست کو سر عام پڑھنے کا رواج نہیں لیکن جس کسی مرد یا عورت کو شادی کے بارے میں کوئی اعتراض ہوا اور اسے اس کا علم ہو جائے تو وہ رجسٹرار کے سامنے پیش ہوسکتا ہے اور شادی کو اس وقت تک رکوا سکتا ہے، جب تک اس کی شکایت رفع نہ ہو جائے۔

امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے لیے سوویت قانون طلاق شاید بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہے کیونکہ ایک ''دہریہ'' قوم نے سہل طلاق کو ختم کر دیا ہے اور طلاق کے راستے میں بالکل نئی مشکلات حائل کر دی ہیں۔ دنیا میں صرف سوویت یونین ہی ایک ایسا ملک ہے جو طلاق کو روز بروز آسان بنانے کی بجائے مشکل تر بنا رہا ہے۔

سوویت یونین میں 1944 سے پہلے کم سے کم خیالی اعتبار سے طلاق اتنا سہل تھا کہ بس رجسٹرار کے نام درخواست لکھنا اور برائے نام فیس ادا کر دینا کافی تھا۔ مرد و عورت دونوں میں سے ہر ایک طلاق کی درخواست دے سکتا تھا۔ دوسرے فریق کو محض اطلاع پہنچا دی جاتی تھی کہ تمہارے ساتھی کو طلاق دے دی گئی ہے۔ کئی سال تک یہی قاعدہ رہا۔ لیکن گزشتہ دس سال کے عرصے میں سوویت یونین کے باشندے طلاق کو نہایت بری نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ بچوں کی تربیت اور عورت کے ماہوار خرچ کی ذمہ داری کے متعلق قانون پاس ہوئے تو غیر ذمہ دار قسم کے لوگ ''ایک ڈاک کے ٹکٹ سی سستی'' طلاق سے دوسری کا ارادہ کرنے سے پہلے کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ باشندوں کا ثقافتی معیار بلند ہوا اور عورتوں کی حالت پہلے سے سدھر گئی تو اطلاق کی شرح بھی رفتہ رفتہ گھٹ گئی۔

نئے قوانین طلاق کے ذریعے پہلے تمام قوانین کو منسوخ کر دیا گیا۔ اب طلاق لینے کے لیے مرد اور عورت دونوں کے لیے عدالت میں درخواست دینا لازمی ہے۔ اس درخواست پر تقریباً دو سو ڈالر خرچ اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی طلاق کی درخواشت کا نوٹس اخباروں میں شائع کیا جاتا ہے، تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سے کہ مجھے خبر نہ ہوئی۔

اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ درخواست دینے والا جوڑا عوامی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جہاں ان وجوہات طلاق کا پوری طرح تجزیہ کیا جاتا ہے۔ جو درخواست میں درج ہوتے ہیں اور ان پر جرح ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کے قانون دان یہ جان کر حیران ہوگے کہ اشتراکی قانون طلاق میں ایک بھی وجہ مذکور نہیں۔ لہٰذا بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ قانون محض ڈھکوسلا ہے یہ دفتر شاہی آمریت کا قانون ہے۔ جسے ''سٹالن نے اس لیے نافذ کیا ہے کہ آئندہ کوئی طلاق نہ ہو''۔ تاہم اس قانون کی یہ تشریح غلط ثابت ہو چکی ہے۔ نئے قانون کے ماتحت ہزاروں شادیاں منسوخ ہو چکی ہیں یا ابھی زیر غور ہیں۔ لیکن طلاق کی شرح 1944 کے پہلے زمانے سے بہت ہی کم ہو گئی ہے۔

سوویت یونین کے لیے قانون میں ''طلاق کی کوئی وجہ'' کیوں درج نہیں؟ جواب بالکل سیدھا سادا ہے، آخر یہ بات قانون سازوں پر کیوں چھوڑی جائے کہ وہ ہمیشہ کے لیے چند وجوہات گھڑ دیں کہ مرد یا عورت کے لیے ایک ساتھ زندگی گزارنا اس لیے دوبھر ہو جاتا ہے۔ شادی ٹوٹنے کے بے شمار وجوہات ہو سکتے ہیں۔ کوئی جھگڑا ایک شادی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن دوسری پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

مرد و عورت میں نا اتفاقی کے تمام تر وجوہات قلمبند کرنے کی کوشش کرنا انتہائی مضحکہ خیز بات نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ معاملہ کوئی اتنا سہل نہیں کہ شمار کر کے بتا دیا جائے کہ ٹریفک رول کی اتنی مرتبہ خلاف ورزی کی گئی۔

سوویت قانون سے تو اس اصول کی تصدیق ہوتی ہے کہ صرف مرد اور عورت ہی جان سکتے ہیں کہ ان کے تعلقات کب اور کیوں قائم نہیں رہ سکتے؟ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ میاں بیوی خود ہی فیصلہ کر

سکتے ہیں کہ ان کی شادی منسوخ ہونا بہتر ہے یا نہیں، عوامی عدالت کا فرض ہے کہ وہ صورت حالات کا بغور جائزہ لے، نئے طریقہ طلاق میں یہ اصول کارفرما ہے کہ شادی محض ذاتی معاملہ نہیں، بلکہ اس سے خاندانی اور سماجی ذمہ داریاں بھی وابستہ ہیں۔ عدالت اسی اصول پر عمل کرتی ہے اور گواہوں کے بیانات کو خاص اہمیت دیتی ہے۔

سوویت یونین میں آج کل اس وقت تک طلاق نہیں مل سکتی۔ جب تک چند ایسے لوگ شہادت نہ دے دیں جو فریقین کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔ پہلی یہ کہ حتی الوسع طلاق کو روکا جائے اسے مشکل بنایا جائے، میاں بیوی پر ان کی سماجی ذمہ داریاں واضح کی جائیں۔ اور دونوں کو راضی نامہ کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح عدالت پر مقدمے کی نوعیت اور حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور وہ اسی کے مطابق طریق کار اختیار کرتی ہے۔

لہٰذا اس قانون سے حتی الوسع طلاق کو روکنا مقصود ہے۔ طلاق سے پہلے میاں بیوی کے لیے عدالت کو یقین دلانا ضروری ہے کہ سمجھوتہ ناممکن ہے۔ فیصلہ کرتے وقت امثال وشرائط کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ مقدمے کی نوعیت وخصوصیت کو سختی سے پیش نظر رکھ کر اس پر غور کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے علامہ دعوی کرتے ہیں کہ سوویت یونین کے قوانین طلاق ہمارے قوانین کی نقل ہیں۔ غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات سوویت یونین کے قانون طلاق کی اصلیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جس کا بنیادی مقصد فریقین میں سمجھوتے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔

دوسرے لفظوں میں طلاق کے مقدمات کی سماعت کرنے والی سوویت عدالتیں ان مشاورتی بورڈوں سے ملتی جلتی ہیں۔ جو کبھی اسقاط حمل کے شفاخانوں میں قائم کئے گئے تھے یہ عدالتیں زیادہ تر طلاق کی روک تھام کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ بعض لوگ کہیں گے کہ کیا ہمارے ہاں کے قوانین طلاق کا بھی یہی منشا نہیں! لیکن صرف زبانی عملاً ہمارے ہاں کے قوانین طلاق ایک ایسا مجموعہ شرائط ہیں۔ جنہوں نے طلاق کے حصول کو اس قدر محال مہنگا بنا دیا ہے کہ بہت تھوڑے لوگ ان سے مستفیض ہو سکتے ہیں، سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں کوئی ایسا قانون نہیں جس کے رو سے یہ لازمی ہو کہ مرد وعورت ازدواجی مشکلات میں گرفتار ہو جائیں تو طلاق سے پہلے کسی مشیر اور ثالث سے رجوع کریں۔ بعض ماہرین نفسیات، ڈاکٹروں اور پادریوں نے بیاہ شادی کے لیے مشاورت خانے تو قائم کر رکھے ہیں مگر انہیں کوئی قانونی حمایت حاصل نہیں۔ سوویت یونین کے نئے قوانین طلاق کے رو سے طلاق خواہ جوڑے کے لیے عوامی عدالت میں قطع تعلقات کے اسباب بیان کرنا لازمی ہے۔ اگر سمجھوتے کی کوشش ناکام رہے تو مقدمہ اعلیٰ عدالت کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ جسے صرف اس حالت میں شادی کو منسوخ کرنے کا اختیار ہے جب کہ ٹھوس ثبوت اور شہادتوں سے اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ رشتہ آئندہ کے لیے باہمی محبت کی بنا پر قائم نہیں رہ سکتا۔ بالآخر طلاق مل ہی جائے تو ایک سو سے لے کر چار سو ڈالر کی مالیت کے رقوم عدالت کی فیس کے طور پر ادا کرنا پڑتے ہیں۔

حاصل؟ ابھی تک اعداد وشمار شائع نہیں ہوئے۔ حال ہی میں ایک شمارہ انگریزی اخبار ماسکو کی خبریں'' کے 25 اکتوبر 1945 کے ایشوع میں چھپا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شادی اور طلاق کے نئے قوانین کے نفاذ سے لے کر اب تک جتنی شادیاں منسوخ ہوئیں۔ ان کی تعداد پہلے سے دو تہائی کم

ہے۔

یہ حقیقت کسی تبصرے سے بالا ہے، جس دن مذکورہ بالا شماریہ چھپا، اسی دن اطلانٹک شہر کے اخباروں مین پنسیلوانیا سٹیٹ کالج کے محکمہ مشاورت شادی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کلفرڈ آر ایڈمنزا کا بیان شائع ہوا۔ڈاکٹر موصوف نے پیش گوئی کی کہ:۔

''1955 تک امریکہ میں دس شادیوں میں سے چار کا انجام طلاق ہوگا، آج سے بیس تیس سال کے عرصے کے بعد ایسی عورتوں کی ایک نسل وجود میں آجائے گی جنہیں شادی کے لیے مرد نہیں ملیں گے۔ کیا یہ عورتیں ہاتھ پر ہات دھرے بیٹھی رہی گی؟ ان میں اور شوہردار عورتوں میں مردوں کے لیے زبردست مقابلے کی صورت پیدا ہوجائے گی:۔ڈاکٹر ایڈمنزا نے مزید کہا:۔

''امریکہ ایک ایسا ملک ہے جہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ شادیاں اور طلاقیں ہوتی ہیں۔ ہر مہینے تقریباً ایک ہزار شادیاں منسوخ ہوتی ہیں اور یہ تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے پیش گوئی کی:۔

آئندہ دس سالوں میں نابالغوں میں جرائم عام ہوں گے اور اخلاق اس قدر پست ہوجائے گا کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملے گی''۔

اس کے ایک ہفتہ بعد شکاگو یونیورسٹی میں عمرانیات کے پروفیسر ڈاکٹر ارنسٹ نے بیان دیا۔آئندہ چند سالوں میں عجلت کی شادی کا رجحان جو جنگ کے زمانے کا ایک خاصہ ہے۔ ملک کے لیے ایک حقیقی مصیبت بن جائے گا۔ معمولی شناسائی مختصر کورٹ شپ اور اتفاقی ملاقاتوں پر ہی شادیاں ہونے لگیں گی، کیونکہ اکثر نوجوان ازدواجی زندگی کی ان لذتوں کے کسر نکالنے کے لیے بے تاب ہوں گے۔جن کے حصول سے وہ لڑائی کے دنوں میں مجبوراً محرام رہے۔

انہوں نے مزید کہا۔

''اکثر مردوں کی عمر شادی کے وقت بہت زیادہ پختہ ہوچکی ہوگی۔ کیونکہ انہیں جنگ کی وجہ سے کئی سال تک مجرد رہنا پڑا۔اگر ایسے ہی طرز عمل کی تکرار ہوئی۔ جیسا کہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد دیکھنے میں آیا تھا تو یہ مرد کمسن لڑکیوں کی طرف مائل ہوجائیں گے۔ معمر عورتیں شادی کی منڈی میں اپنی ناقدری دیکھ کر مردوں کی فوری حصول کے لیے بلاسوچے سمجھے ہاتھ پاؤں ماریں گی، نتیجہ طلاق کی شرح میں اضافے کی صورت میں ظاہر ہوگا''۔

چونکہ امریکہ میں جنگ سے پہلے طلاق کی اوسط 16 فیصد سے قدرے زیادہ ہی تھی۔اس لیے ڈاکٹر موصوف نے اندازہ لگایا کہ مستقبل قریب میں یہ شرح 25 فیصد ہوجائے گی۔لیکن وہ ڈاکٹر ایڈمنز کے مقابلے میں قدامت پسند نظر آتے ہیں۔جنہوں نے پیش گوئی کی ہے کہ طلاق کی شرح اوسط 40 فیصد ہو گی۔

شکاگو کے ماہر عمرانیات، یعنی ڈاکٹر ارنسٹ نے ذرا تفصیل میں جاکر بیان کیا۔

''میدان جنگ سے واپس آکر شادی کرنے والے پانچ سپاہیوں میں سے ایک سپاہی تو بالضرور عدالت طلاق کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔اگر انہیں تجربہ کار مشیر نہ ملے اور وہ غیر معمولی طور پر سخت جان ثابت نہ ہوئے تو باقی چار بھی زد یا بدیر یہ راستہ اختیار کریں گے۔

''مزید 30 فی صد سپاہی پریشانیوں سے بھرپور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ دس میں سے

صرف ایک سپاہی توقع رکھ سکتا ہے کہ وہ شادی کر کے اطمینان کی زندگی گزارے گا''۔

اور یہ سوچا ہی نہیں جاتا کہ ایسی شادیوں سے جو بچے پیدا ہوں گے ان کا کیا کیا جائے گا۔ ہمیں سوویت یونین کو ''ایک بداخلاق، مادہ پرست'' قوم کا طعنہ دیتے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا ہے۔ اس دوران میں ہمارے ہاں ازدواجی زندگی جس قدر تباہ ہوئی ہے اور جس قدر اخلاق گرے ہیں۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن اس بھیانک صورت حال کے تدراک کے لیے کوئی منظّم کوشش نہیں ہو رہی۔

ایک طرف تو ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ عیسائی تہذیب کی بنیاد ہی خاندان یا کنبے کے تقدس پر ہے اور دوسری طرف خاموشی سے بداخلاقی اور طلاق کے بے پناہ طوفانوں کے منتظر بیٹھے ہیں۔ ادھر سوشلسٹ ریاست کا یہ حال ہے کہ وہ خاندان کو نئی اور بلند تر سطح پر لے جانے کی جدوجہد میں متواتر کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔

کتنے نکتہ چین ایسے ہیں جنہوں نے سوویت یونین کے نئے قوانین تحفظ مادر کا مقابلہ دوسرے ملکوں کے قوانین سے کیا ہے؟ یقیناً ایسے ناقدوں کی تعداد بہت ہی تھوڑی ہے۔ بعض نے یہ کہہ دینا ہی کافی سمجھا ہے کہ یہ قوانین ماں کو اس کا اصل مقام واپس دلاتے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کس طرح سوویت یونین میں ایک طویل عرصے تک ماؤں کے حفاظتی مرکز کھولے گئے اور وہاں عورتوں کی حالت سدھارنے کے لیے کس طرح انتھک کوششیں کی گئی۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ بھی نہیں ہو رہا۔

ماؤں کے تحفظ کے قانون پاس کرنے سے پہلے سوویت یونین نے ان کے لیے ہمہ گیر سرکاری امداد کا بندوبست کیا۔ چنانچہ معصوم بچوں کے لباس اور خوراک کی سالانہ امداد کی مالیت پندرہ کروڑ ڈالر تھی۔ یہ کوئی زکوٰۃ نہ تھی، بلکہ اسے اسی طرح قبول کیا جاتا تھا۔ جیسے ہم اپنے پبلک سکولوں کی خدمات قبول کرتے ہیں۔

ماؤں کے تحفظ وظائف کی صورت میں بھی امداد دی جاتی تھی۔ ساتویں بچے کی پیدائش پر یہ وظیفہ چار سو ڈالر سالانہ کے قریب ہو جاتی تھی۔ اس منصوبے کے تحت لاکھوں خاندانوں کو وظیفے ملتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ بڑے کنبے عام کنبوں سے مادی استفادے کے اعتبار سے خسارے میں نہ رہیں۔

نئے قوانین مزید ارتقا کا پتہ دیتے ہیں لیکن ان میں بھی مسلمہ اشتراکی اصولوں سے سرمو انحراف نہیں کیا گیا۔ ان میں ماں کی افضلیت کا اعتراف تین عطیوں کی صورت میں کیا گیا ہے۔ یہ عطیے تمغوں کی شکل میں دیئے جائیں گے۔ پہلے کا نام میٹرنٹی میڈل' دوسرے کا آرڈر آف مدرز گلوری اور تیسرے کا نام ہیروئن مدر ہے۔ پہلا تمغہ درمیانے کنبے کے لیے ہے۔ دوسرا اس سے بڑے کنبے کے لیے اور تیسرا سب سے بڑے کنبے کے لیے ہے۔

اعلان کیا گیا ہے کہ آئندہ تمام ماؤں کے وظیفے بڑھا دیئے جائیں گے۔ باقاعدہ مالی امداد اور مفت طبی امداد کے علاوہ ہر حاملہ عورت کو تیسرے بچے کی پیدائش پر اسی ڈالر وظیفہ ملا کرے گا۔ چوتھے بچے کی پیدائش پر ڈھائی سو ڈالر نقد اور سولہ ڈالر ماہوار اور پانچویں بچے کی پیدائش تین سو چالیس ڈالر نقد اور چوبیس ڈالر ماہوار، غرضیکہ گیارہویں بچے کی پیدائش پر اس کی ماں کو ایک ہزار ڈالر نقد اور ساٹھ ڈالر ماہوار وظیفہ ملا کرے گا۔

صرف سنجیدہ اخلاقی زاویہ نگاہ کے سبب بلکہ جنگ سے پیدا شدہ حل طلب مسائل کے پیش نظر بھی

سوویت یونین کی بن بیاہی لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد دی جاتی ہے۔انہیں ہر ماہ سرکاری وظائف کی صورت میں خود بخود امداد پہنچنے لگتی ہے اور یہ وظیفے 12 سال تک جاری رہتے ہیں اور فی بچہ 20 سے 40 ڈالر کی مالیت کے ہوتے ہیں۔نرسریاں اور رہائشی سکول عام ہیں۔جہاں ماں اپنے بچے کو جتنا عرصہ چاہے چھوڑ سکتی ہے، بچہ اسی کا رہتا ہے، اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔

تمام حاملہ عورتوں کو کام سے 11 ہفتے کی باتنخواہ رخصت ملتی ہے۔پانچ ہفتے بچے کی پیدائش سے پہلے خانہ نشین ہونے کے لیے اور چھ ہفتے بچے کی پیدائش کے بعد تک۔جنگ کے دوران میں انہیں دگنا راشن ملتا رہا۔علاوہ ازیں تمام سوویت یونین میں وسیع پیمانے پر نئی نرسریاں اور کنڈر گارٹن کھولے جائیں گے۔

بداخلاقی کے انسداد کی جدوجہد اور انسانی فطرت کی اصلاح کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں سوویت یونین کی بے مثال کامیابیاں یہ ہیں:۔

1-سوویت یونین میں پہلے اسقاط حمل کو قانوناً جائز قرار دیا گیا اور اس کے بعد سائنسی اقدامات کے ذریعے اس علت کو یکسر ختم کر دیا۔

2-جب معاشی، سماجی اور اخلاقی ارتقا نے اسقاط حمل کر حرکت کو نا قابل معافی بنا دیا تو اسے فرد اور سماج کے خلاف ایک جرم قرار دے دیا گیا۔

3-پہلے محض درخواست پر طلاق کی اجازت دے دی گئی، اس کے بعد بیس برس کے عرصے میں طلاق کے واقعات تقریباً نا پید ہو گے۔

4-اب مصالحتی عدالتیں قائم کر دی گئی ہیں۔تا کہ طلاق کی مصیبت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا ملے۔

5-جنسی بیماریوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔

6-عصمت فروشی کو سماجی اتفاقات کی سطح تک پہنچا دیا گیا ہے۔

7-ماں کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں انہیں دور کر دیا گیا۔

8-مردوں اور عورتوں میں عملاً حقیقی مساوات قائم ہو چکی ہے۔

9-سوویت یونین انسانی محبت اور شادی کو ایک ایسی وحدت میں منتقل کرنا چاہتا ہے جو اخلاقیات کے نئے شریفانہ شعور پر مبنی ہو گی اور دنیاوی و روحانی جبر سے آزاد ہو گی۔

عرصہ ہوا کہ کارل مارکس کے زندگی بھر کے ساتھی، سوشلسٹ فلسفی فریڈرک انیگلس نے پیش گوئی کی تھی۔

''رفتہ رفتہ ایک نئی انسانی نسل معرض وجود میں آئے گی، یہ ایسے مردوں پر مشتمل ہو گی جنہیں زندگی بھر میں پتہ نہیں چلا ہو گا کہ روپے یا کسی دوسری سماجی طاقت کے ذریعے سے کسی عورت کی سپردگی خریدنے کے کیا معنی ہیں اور یہ نسل ایسی عورتوں پر مشتمل ہو گی جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ جانا ہو گا کہ محبت کے علاوہ کسی دوسرے خیال سے اپنے آپ کسی مرد کے سپرد کرنے کے کیا معنی ہیں''۔

اور یہ پیش گوئی آج سچ ثابت ہو گئی ہے۔

شراب کی ممانعت سنگینوں کے بل پر

اب تک ہمارے بحث صرف ایسے مسائل تک محدود رہی ہے۔جن کا تعلق جنسی بے راہ روی سے براہ راست تھا۔لیکن بداخلاقی کے اور بھی مظہر ہیں اور ہم نے ابتدا میں ''سماج کے لیے مضر بدکرداریوں'' کا ذکر بھی کیا ہے۔اس کے باوجود اکثر قاریوں کو ہماری خطرناک فرد گذاشت کا احساس ہو گیا ہوگا۔جس کی طرف ہم نے کہیں کہیں اشارہ کرنے پر کفایت کی ہے۔ہمارے دہ فروگذاشت نشہ بازی، بدکاری کا وہ محرک شراب ہے۔

نشہ بازی ایک سماجی مسئلہ ہے،شراب نوشی، بداخلاقی کا ایک جزو اور نشہ بازی کی عادت کی ایک صورت ہے۔ جسے کوئی گناہ تصور کرے یا نہ کرے اس کا نتیجہ سماج کے لیے ہمیشہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتا ہے۔شراب کے حق میں.... یا اس کے خلاف ازل سے بحث چلی آتی ہے اور ہمارا ارادہ اس بحث میں نئی یا پرانی دلیلوں کا اضافہ کرنا نہیں ہے کیونکہ سوویت یونین میں دونوں قسم کی دلیلوں کا جواب سائنسی اور عملی طریقے سے دیا جا چکا ہے اور انہیں سچ ثابت کیا جا چکا ہے۔ یا جھٹلایا جا چکا ہے۔اور اب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہاں شراب کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جا چکا ہے۔کیونکہ اسے عصمت فروشی اور بدمعاشی کے ساتھ ہی حل کیا جا چکا ہے۔

لیکن پھر بھی کوئی صاحب سوال اٹھا سکتے ہیں کہ آیا شراب نوشی واقعی کوئی مسئلہ ہے۔سوویت یونین میں بیس سال پہلے اور ہمارے ملکوں میں آج تک شراب نوشی ایک ایسا محرک تھا۔

لیکن پھر بھی کوئی صاحب سوال اٹھا سکتے ہیں کہ آیا شراب نوشی کوئی مسئلہ ہے۔سوویت یونین میں بیس سال پہلے اور ہمارے ملکوں میں آج تک شراب نوشی ایک ایسا محرک تھا۔اور ہے، جس کے ذریعے بدمعاشی اور جنسی بیماری پھیلتی ہے۔ ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہر ایماندار پادری، پولیس افسر، ڈاکٹر، محکمہ صحت عامہ کا افسر اور رضا کار کرے گا۔

گناہ کا سوال اٹھایا بھی نہ جائے،تو بھی یہ ایک مسلمہ امر ہے۔کہ اکثر مرد عورتیں اور نوجوان شراب کے نفسانی محرکات سے اثر پذیر ہوتے ہیں،جن سے ترغیب بدکاری کی قدرتی مزاحمت کا جذبہ بے حد کمزور پڑ جاتا ہے۔

وضاحت کے لیے یہ مثال دی جا سکتی ہے۔کہ پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں ہوتے ہوئے کوئی سپاہی یا جہاز شاید ہی کسی طوائف کے پاس جانا پسند کرے گا۔نابالغوں کے جرائم سے متعلق عدالتی کاغذات اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ بہت کم نوجوان نابالغ لڑکیاں پہلے شراب پیئے بغیر جنسی بدفعلی کی مرتکب ہوئی ہیں۔فوجی ڈاکٹروں کا تلخ تجربہ ہے کہ متعدد بار شراب پینے کے اکثر سپاہی اپنی قوت فیصلہ اور فرائض سے اس درجہ غافل اور عاری ہو جاتے ہیں کہ وہ نہ صرف بری سے بری عورت کو خوش آمدید کہتے ہیں۔بلکہ جنسی بیماری سے بچاؤ کی دوا کو استعمال کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔

فعلیات (علم وظائف الاعضاء) اور نفسیات کے ماہر متفق ہیں۔کہ شراب سے تمام قوت مزاحمت ہوا ہو جاتی ہے۔

تاہم شریفانہ طریقے پر بھی بہت زیادہ شراب پی جاتی ہے۔اخلاقی اور سماجی اعتبار سے یہ بھی کوئی کم اہم مسئلہ نہیں۔ ہارورڈ میڈیکل سکول کے پروفیسر اور مساچوسٹس جنرل ہسپتال کے ماہر اعلیٰ امراض نفسیہ، ڈاکٹر سٹیلینے کوب نے شراب نوشی کے اس طبی پہلو پر بڑی صفائی سے روشنی ڈالی ہے۔جس کا جنس اور جرائم سے کوئی تعلق نہیں۔ڈاکٹر کوب کا قول ہے کہ اس برعظیم میں ساٹھ لاکھ افراد ذہنی بیماریوں میں اس حد تک

مبتلا ہیں کہ وہ ایک طرح ''جنون کے لگ بھگ پہنچے ہوئے ہیں۔ان میں پندرہ لاکھ ایسے ہیں کہ وہ نہ شراب سے ہی بناہ کر سکتے ہیں اور نہ اس کے بغیر رہ سکتے ہیں''۔دوسرے لفظوں میں آج کل ہمارے ہاں تقریباً پندرہ لاکھ افراد پکے شرابی ہیں۔

درست ہے کہ ان میں سے ابھی تک جنسی اعتبار سے ناکارہ نہیں ہوئے۔اور آتشک سے مبرا ہیں تاہم وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔اپنی صلاحیتوں کو ختم کر رہے ہیں۔اپنے گھروں اور عزیزوں کا سکون ومسرت تباہ کر رہے ہیں۔اور سماج پر برا اثر ڈال رہے ہیں۔معاشرتی نقطہ نظر سے ہم ان کی عادت شراب خوری کو بداخلاقی سے تعبیر کریں گے۔

سوویت یونین میں جو صورت حال ہے۔اس کے متعلق ہمارے ہاں بے حد دلچسپی ظاہر کی گئی ہے۔

سوویت یونین میں شراب کے مسئلے کے بارے میں ہمارا علم صرف سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔ وہاں کے حالات کے بارے میں خبریں اکثر متضاد ہوتی ہیں۔آج ہم یہ پڑھتے ہیں کہ سرخ فوج کا ایک مشہور کمان افسر پکا صوفی ہے۔وہ مطلقاً شراب نہیں پیتا۔اس خبر کو تحریک امتناع کے علمبردار اور رضا کار خاص دلچسپی اور انہماک سے پڑھتے ہیں۔لیکن دوسرے ہی دن یہ پڑھ کر وہ چونک جاتے ہیں کہ اس سے بھی دو بڑے اور مشہور جرنیلوں سے اتحادیوں کی کامیابی کی خوشی میں شراب پی۔اور یہ کہ ووکا (آتش ناک روسی برانڈی، اور شراب) سوویت یونین کی سرکاری دعوتوں کے موقعوں پر پیش کی جاتی ہے۔لہٰذا یہ حضرات فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں شراب نوشی آداب معاشرت کا ایک ایسا مظہر ہے۔جسے سوویت حکومت نے فرد کے ضمیر پر چھوڑ رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے ماہرین نے، جو شراب نوشی کے مسئلے کے مطالعے میں بری طرح کھوئے ہوئے ہیں۔آج تک یہ دریافت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔کہ سوویت یونین میں شراب کے ساتھ آخر کیا بیتی۔

صورت حال یوں ہے کہ اشتراکی سائنس دانوں نے بدکاری، عصمت فروشی اور جنسی بیماری کی انسدادی جدوجہد کے دوران میں محسوس کیا کہ جنسی مسائل اس وقت تک پوری طرح حل نہیں ہو سکتے۔ جب تک ان کے ساتھ ہی شراب کے مسئلے کو حل نہیں کیا جاتا۔لہٰذا وہ اسی طریقے پر میدان عمل میں کود پڑے جو جنسی بداخلاقی کے خلاف ان کی کامیاب جدوجہد کا خاصہ تھا۔سوویت میں شراب کے انسداد کی جدوجہد سماجی تجربات کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے۔

اس جدوجہد کا آغاز تو ماضی بعید میں ہو چکا تھا۔ہزار ہا سال سے روس جانے والے سیاح گواہی دیتے آئے تھے۔کہ سلطنت زار میں شراب نوشی کی بدعت عام ہے۔

ہمہ گیر شراب نوشی اور ہمہ گیر جرائم۔زنا، عصمت دری، آتشزدگی قتل منظم قتل عام، یہ جرائم شاہی محل سے لے کر کسان کے غلیظ جھونپڑے تک زار شاہی روس کے ہر طبقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

روس کے مشہور ناول نگار تر جنیف رقمطراز ہیں۔

''عام طور سے ایک شہری خود فراموشی تک کفایت کرتا ہے۔لیکن ایک پادری کسی مقدس موقعہ پر خوب پیٹ بھر کر پیتا ہے''۔

روس کے کٹر مذہبی لوگ سال بھر میں بے شمار تہوار مناتے تھے۔اور عیسائی اور تاروں کی یاد میں بے حد وحساب پیتے تھے۔حتیٰ کہ کثرت شراب خوری مذہبی تہواروں کی ایک مستقبل خصوصیت بن گئی تھی۔لیکن انقلاب کے بعد صرف پندرہ سال کے عرصے میں یہ صورت حال یکسر بدل گئی اور امریکہ کے مشہور ڈاکٹر

کنگس بری اور نیوشولم یہ اطلاع دینے کے قابل ہو گئے کہ ہم نے ایک تہوار کے دن بحیرہ سود سے دریائے والگا کے منبع کی طرف دور تک سفر کیا۔ لیکن ہم نے بہت کم شراب نوشی ہوتے دیکھی، اور کسی فرد کو شراب کے نشے میں بے ہوش نہ پایا، حالانکہ خود جہاز میں اور ہر بندرگاہ بے روک ٹوک شراب بک رہی تھی۔

اب ہم اس ظاہری تضاد کی اصلیت بیان کریں گے۔ ہمارے ملکوں میں اصل حقائق کو ابھی تک خفیہ رکھا گیا ہے۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ کہ امتناعی قوانین سے بے نیاز رہتے ہوئے سائنسی اصولوں سے کام لے کر شراب نوشی کی لعنت کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ہمارے ملکوں میں امتناع کی تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ بھول کر بھی سوویت یونین کا حوالہ نہیں دیتے۔ شاید وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ کہ روس نے سو سال سے زیادہ عرصے تک شراب نوشی کے خلاف ہر ممکن طریقے سے وسیع پیمانے پر جدوجہد کی لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک واحد عملی حل تلاش کر لیا گیا۔ اور اسے آزمایا گیا۔ یہ آخری طریقہ پہلے تمام طریقوں سے اس لیے افضل ہے۔ کہ یہ کامیاب ہوا۔

روس میں شراب نوشی پر قابو پانے کی منظم کوششیں 1819 شروع ہوئیں اس وقت تک روس میں ہر جگہ شراب فروشی ہوتی تھی۔ اور جس کا جی چاہتا تھا یہ بیوپار شروع کر لیتا تھا۔ ان دنوں امریکہ اور انگلستان میں جو تجاویز پیش ہو رہی تھیں زار کی حکومت نے سب سے پہلے ان پر عمل کیا اور شراب کی بکری پر سرکاری اجارہ داری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ نظام اجارہ داری آٹھ سال تک قائم رہا اور حکومت کے لیے بہت نفع بخش ثابت ہو۔ لیکن شراب نوشی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ اس رفتار وہی رہی۔ علاوہ ازیں اس سسٹم کا نفاذ بہت دقت طلب تھا۔ اور رشوت ستانی کے سبب جلد ہی بدنام ہو گیا۔ آخر کار 1926 میں زار روس نے شراب کی تقسیم کا انتظام پرائیویٹ کارپوریشنوں (بڑی کمپنیوں) کے حوالے کر دیا۔ اور ساتھ ہی شراب کی بکری پر ٹیکس لگا دیا۔ اس طرح ایک ایسے نظام کی بنیاد پڑی جو اپنی ابتدائی شکل میں ٹیکس کی بھرمار کے باوجود شراب کی روز افزوں بکری کے موجودہ نظام سے مشابہ تھا۔ اور یہی طریقہ ابھی تک بہت سے ملکوں میں رائج ہے۔ مقصود تھا کہ شراب کو اوسط درجے کے شہری کے لی مہنگی اور ریاست کے لیے منفعت بخش بنا دیا جائے۔

زار شاہی روس میں شراب پر سرکاری کنٹرول حکومت کے لیے بہت نفع بخش ثابت ہوا۔ ایسے لوگوں کی جیبوں سے بے شمار روپیہ کھینچا جو ودوکا کی مقدار میں کمی کرنے کی بجائے ضروریات زندگی کو قربان کرنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ لیکن ٹیکس کے بتدریج اضافے پر بھی شراب کی کھپت کم نہ ہوئی۔

کوئی تیس سال تک شراب نوشی ترقی پر اور سلطنت زار زوال پر رہی جب حالت بہت خراب ہو گئی۔ تو پادریوں نے وعظ و تلقین اور توبہ کا پرچار شروع کیا۔ سیاسی اصلاحات کی جو تحریک انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی وہ 1859 میں اپنے عروج پر پہنچی۔ تو کلیسا نے زار کو شراب کی کشید کے تمام کارخانے بند کرنے پر راضی کر لیا۔ لیکن زار کی رعیت بھی آخر اسی طرح کے انسان تھے، جیسے دوسرے ملکوں کے لوگ ان پر الٹا ردعمل ہوا۔ اور جو لوگ محض بیر (جو کی شراب جو ہلکی ہوتی ہے) پر کفایت کرتے آئے تھے۔ شراب کو ترک کرنے کے بجائے ودوکا (تیز برانڈی) پینے لگے۔

تین سال بعد سرکاری کنٹرول کا نیا طریقہ رائج ہوا جس سے ہم سب اچھی طرح آگاہ ہیں یعنی لائسنس کا طریقہ جاری کر دیا گیا۔ اور شراب کی پرچون کی دوکانیں گھٹا دی گئیں زار نے یہ اقدام تحریک

امتنا کے لیڈروں کو خوش کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔

اس کے بعد تقریباً تیس سال کے عرصے میں زار کی حکومت شراب کی کشید کے سرکاری اور لائسنس یافتہ کارخانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن اس اثنا میں ودوکا کی بکری پہلے سے بھی بڑھ گئی۔

1846 میں ڈاکٹر سیمیونو وچ الیگزیف امریکہ آئے۔ یہ انسان دوست ڈاکٹر مشہور مصنف اور فلسفی کونٹ طالسطائی کا گہرا دوست تھا۔ امریکہ میں ان دنوں جو امتناعی سرگرمیاں جاری تھیں، اسے ان سے روشناس کرایا گیا۔ اور وہ یہ جذبہ لے کر اپنے وطن واپس گیا کہ وہ روس کے عوام کو رضا کارانہ طور پر شراب چھوڑنے کی تلقین کرے گا۔ اس نے مشہور امتناع پسند جماعت انتی سیون لیگ کے انداز میں کئی کتابیں لکھیں، اس کی کوشش کا صرف ایک نتیجہ نکلا کہ زار نے ایک قانون کے ذریعے اس قدیم رواج کو جرم قرار دے دیا۔ جس کے مطابق کارخانہ دار اپنے مزدوروں کو تنخواہ کا ایک حصہ نقدی میں اور دوسرا حصہ ودوکا کی صورت میں ادا کیا کرتے تھے۔

اس طرح روس کے صنعتی مرکز امریکہ کے قدیم کانوں کے مرکزوں کی طرح مغربیائے گئے۔ یعنی کارخانہ داروں نے اب کارخانوں کے قریب ہی شراب کی دوکانیں کھول لیں اور مزدور لوگ اپنی تنخواہ وصول کرتے ہی ان کی نذر کرنے لگے۔ لیکن بے روک آزاد شراب نوشی کے منفی اثرات صنعتوں سے منافع کی تخفیف کا موجب ثابت ہونے لگے اس وقت تک روس کے دیسی اور غیر ملکی سرمایہ داروں نے مل کر زار کی وسیع اور زرخیز سلطنت اور لاکھوں مزدوروں کو خوب لوٹنا شروع کر دیا تھا انہوں نے پیداوار کے جدید اصول رائج کئے مشینی صنعت کے فروغ کے ساتھ مزدوروں کے ہنر اور محنت کی لوٹ کھسوٹ بڑھی۔ ایک مزارع تو شراب کے نشے میں دھت ہوتے ہوئے بھی اپنے قدامت پرست جاگیردار کے کھیتوں میں اس کے حسب منشا کام جاری رکھ سکتا تھا۔ لیکن شراب کی عادت اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیاں کارخانہ داری کے نئے نظام کے لیے وبال بن گئیں۔ لہذا انیسویں صدی کے اختتام پر روس میں امتناع شراب کی طاقتور اور شدید تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک کا سرغنہ کلیسا تھا۔ نہ حکومت بلکہ اس کے پیچھے نئے صنعتی سرمایہ دار تھے۔

ان جدید سرمایہ داروں کو ڈالرنکولائی گریگوریف جیسا قابل لیڈر مل گیا۔ اس نے 1994 میں ''قاصد امتناع'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس کی مہم پوری طرح منظم تھی اس نے شراب کی تجارت میں حکومت کی کثرت شرکت کو بداخلاقی سے تعبیر کیا اور بتدریج بڑھتے ہوئے ٹیکسوں کی سخت مخالفت کی۔ ڈاکٹر گریگوریف نے شراب پر ''سرکاری کنٹرول'' کا پردہ تار تار کر دیا۔ اس کی پروپیگنڈہ مہم کے نئے صنعتی سرمایہ داروں کی بے پناہ مالی امداد حاصل تھی۔

لیکن یہ مہم بری طرح ناکام رہی۔ اور حکومت کے ٹیکسوں کی سنگین دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ جب تک زار تخت شاہی پر براجمان رہا۔ اس کی آمدنی میں شراب کے ٹیکسوں کی بدولت بالکل اسی طرح اضافہ ہوتا رہا۔ جس طرح آج کل امریکہ کے ریاستی بجٹ یا مستعمرہ کینیڈا کی آمدنی میں آئے سال اضافہ ہوتا رہا ہے، جہاں سرکاری کنٹرول اور ٹیکسوں کی بھرمار کی بدولت شراب کی کھپت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تاہم جو طوفان شراب کے خلاف اٹھا تھا۔ اسے دبایا نہ جا سکا۔ 1898 میں زار کے اپنے حلقوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور زار کا ایک طاقتور چچازاد بھائی شہزادہ سکندر اس قصیئے میں حکومت کا

زبردست مخالف بن گیا، اس نے امیروں وزیروں کو اپنا حامی بنانا شروع کیا اس کے مقاصد کافی حقیقت پسندانہ تھے۔ وہ ایک امیر جاگیردار تھا۔ جس نے یہ دریافت کر لیا تھا کہ صوفی مزدور کی طرح صوفی کسان بھی زیادہ مفید اور نفع بخش محنت کش ہے۔ دوسرے ملکوں میں جو امتناعی مہمیں جاری تھیں، ان کے مطالعے کے بعد اس نے اپنا سارا زور روس میں امتناعی تعلیم پھیلانے پر صرف کر دیا۔

سب سے پہلے اس نے تمام شراب دشمن گروہوں کو ایک جماعت یعنی انجمن امتناع میں متحد کیا، اس نے اپنے اور پنے ساتھیوں کے سرمائے سے انجمن کا خزانہ بھر دیا۔ جس میں نہ صرف ہزاروں بلکہ لاکھوں روبل اس وقت جمع ہو گئے جب کہ روبل کی قدر نصف ڈالر کے برابر تھی۔ اس کے بعد اس نے ہر طرف روپے کا چھٹا دے دیا۔

اس مہم کا سرچشمہ ماسکو میں الیکس محل امتناع تھا۔ اس ہیڈ کوارٹر میں تربیت یافتہ کارکنوں کا ایک بڑا عملہ تھا۔ جس نے دنیا میں سب سے پہلے امتناعی تعلیم کے سائنسی مرکزوں کا منصوبہ بنایا اور تعلیمی مہم کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے ایک دوسری عمارت میں ہزاروں کتابوں پر مشتمل ایک کتب خانہ کھولا۔ کیمیائی اور وظائف اعضاء کے معائنے کی تجربہ گاہیں کھولیں۔ جن کا عملہ بہترین ماہرین فن پر مشتمل تھا۔ انہوں نے تنخواہ وار محقق، اہل قلم مقرر اور استاد رکھے۔ یہ تھا ہمارے ہاں جدید تحقیقاتی مرکزوں کا باوا۔ اس کی مثال یصیل یونیورسٹی میں تجزیہ شراب کا سکول ہے جو حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ جس کا عملہ مشہور ڈاکٹروں ماہرین فعلیات ونفسیات ماہرین عمرانیات، قانون دانوں اور پادریوں پر مشتمل ہے۔ جو بڑے انہماک سے یہ تحقیق کرنے میں مصروف ہیں کہ شراب انسانی دماغ، جسم اور سماجی تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا یہ پروفیسر صاحبان کسی شرابی باپ کے لڑکے سے تمام ضروری باتیں دریافت نہیں کر سکتے۔

شہزادہ سکندر کی انجمن امتناع نے حقائق اور قیاسات دونوں قسم کے مواد کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا۔ اور اس نے وہ کچھ کر دکھایا۔ جس کے متعلق ییل کا سکول ابھی تک منصوبہ ہی نہیں بنا سکا۔ یعنی اس نے یہ تمام چیزیں نہایت دل کش انداز میں لاکھوں عوام تک پہنچا دیں شہزادے نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری رکھیں۔ اس نے اس مقصد کے لیے پارک، باغات ہر عمر کے افراد کی تفریح گاہیں عظیم الشان ریستوران، تماشا گاہیں تھیٹر غرضیکہ ہر موقع اور مقام کو استعمال کیا۔ ان میں سے اکثر ادارے مفت چلائے گئے اور جب تک وہ چالو رہے نہایت مقبول عام رہے۔ حالانکہ وہ شراب کا قطرہ تک مہیا نہ کیا تھا۔ وہاں باقاعدہ وقفوں کے بعد شوقین اور کچھ سننے کے لیے بے قرار مجمع کو ہوشیار مقرر خطاب کرتے اور شراب نوشی کی اصلیت سے انہیں باخبر کرتے۔ 1903 اس مہم کے عروج کا سال تھا۔ اس پر صرف ماسکو شہر میں پچیس لاکھ ڈالر صرف ہوئے۔ شہزادے کی انجمن امتناع روس کے طول وعرض میں تین سو ستر امتناعی تھیٹر چلاتی تھی۔ اب خرچ کا اندازہ لگا لیجئے۔ نتیجہ؟ وہی ڈھاک کے تین پات۔

امتناعی سرگرمیوں کی مخالفت 1905 میں نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ اس سال جب کہ سیاسی دباؤ ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ روس کا ایک مشہور ومعروف اور جابر رئیس، ڈیوک اعظم سرگش جو ماسکو کا گورنر جنرل اور زار وقت کا چچا تھا۔ انجمن امتناع میں شریک ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ شاہی خاندان دوسرے افراد کو بھی اس تحریک میں لایا۔ ان میں زار وقت کا ایک دوسرا چچا ڈیوک اعظم کونس ٹینیٹسن بھی تھا۔ اس نے ایک نام نہاد تنظیم، کل روس عیسائی مزدور یونین قائم کی اور اس کی صدارت خود سنبھالی۔ وہ شراب کی مکمل بندش کا حامی تھا۔ اس پروگرام سے زیادہ بااثر اور عمدہ پروگرام ذہن میں نہیں آ سکتا۔

لیکن اس تحریک کا اور اس کے ساتھ ہی محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی لوٹ کھسوٹ کا عوامی ردعمل اس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ جب کہ کسی نے ڈیوک اعظم سرگس کی گود میں ایک اعلیٰ ساخت کا بمب اٹھا پھینکا۔ تشدد کے اس توقع کے ساتھ ہی ڈیوک اور اس کی مہم تاریخ کے ہمپٹی ڈمپٹی کرداروں دیجوں کی پوری کے کردار جن میں انڈے کا نام پٹی ہے کی گود میں جا سوئی۔ اور اس طرح دبی کہ دوبارہ ابھر نہ سکی۔ تمام واعظ اور وعظ اور شراب نوشی کے متعلق حقائق اور اعداد و شمار اس طرح منتشر ہوئے کہ ان کو پھر کبھی جمع نہ کیا جا سکا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل غور بات یہ ہے۔ کہ کس طرح شراب کی اجارہ داری اس امتناعی مہم کی مکمل ناکامی کا باعث ہوئی۔ جب حکومت نے 1894 میں شراب کی فروخت خود سنبھالی تھی تو پادریوں نے شراب کی نئی سرکاری دکانوں کی کامیابی کے لیے دعا کی تھی۔ اور سرکردہ امراء، وزراء اور صنعتی سرمایہ داروں نے یوم افتتاح پر شراب سپلائی کرنے کے ٹھیکے، شراب کی پرچون پر سرکاری اجارہ داری جو کینیڈا کے رائج الوقت نظام سے مشابہ ہے۔ قائم ہونے کے پندرہ سال بعد قانونی طور پر جائز ودو کی کھپت ایک کروڑ چالیس لاکھ گیلن سالانہ سے پچیس کروڑ گیلن سالانہ ہوگئی۔

1904 سے 1913 کے درمیان شراب کی بکری سے حکومت کو پانچ ارب روبل منافع ہوا۔ بادی النظر یہ میں یہ رقم معمولی ہے۔ لیکن اس کا حکومت کی کل آمدنی سے مقابلہ کیا جائے تو اصلیت واضح ہو جاتی ہے اس اثنا میں حکومت کی کل آمدنی بیس ارب تھی۔ یعنی اکیلی شراب سے حاصل ہونے والا منافع کل آمدنی کا ایک چوتھائی تھا۔ اور یہ حقیقت ہے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر بھی زار کی حکومت کو اپنی کل آمدنی کا چوتھا حصہ صرف شراب کی بکری کے منافع سے حاصل ہوتا تھا۔ اس صورت حال کا موازنہ کینیڈا سے کیا جا سکتا ہے جس کے بعض صوبے کئی سال سے اپنے بجٹوں کو زیادہ تر مختلف کی شراب کی بکری سے حاصل شدہ منافعوں کے بل پر متوازن بنا رہے ہیں۔

روس میں امتناعی تعلیم کی وسیع مہم اور شراب پر سرکاری کنٹرول کے وقت سے لے کر 1914 تک ودو کا کی کھپت پہلے سے پانچ گنا سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ اور شراب پینے والوں کی جیبوں سے ٹیکس میں جانے والی رقم دن بدن بڑھتی گئی۔

لیکن شراب کے خلاف جدوجہد جاری رہی۔ اس اثنا میں ایک نئی تنظیم یعنی سکولوں میں امتناع شراب کی جدوجہد کرنے والی انجمن کی بنیاد پڑی۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جس شدت سے روس شراب نوشی کی مصیبت میں مبتلا تھا۔ اس کی مثال دینا کے کسی ملک میں نہ ملتی تھی۔ اس سوسائٹی نے سلطنت کے طول وعرض کا دورہ کیا اور اصل صورت حال کے متعلق اعداد و شمار جمع کئے 1913 میں وہ ایسے حقائق شائع کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جن کی اجازت زار شاہی کے محکمہ احتساب (سنسر) نے دی مثال کے طور پر اسی فی صدی سے زیادہ نوجوان روسی طلبہ اور ساٹھ فی صد سے زیادہ روسی لڑکیاں ودو کا کی عادی تھیں۔ ایک تعلیمی ضلع میں طلبہ کی کل تعداد پانچ ہزار سات سو تھی۔ سوسائٹی کے کارکن اس ضلع میں حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے گئے اور ڈھائی ہزار ایسے طلب سے ہم کلام ہوئے جو شراب کے نشے میں دھت تھے یا جنہوں نے اعتدال پی رکھی تھی۔ کارخانہ داروں کے دباؤ پر ماسکو کی بلدیہ تحقیقات کی اور معلوم ہوا کہ ماسکو کے بالغ باشندوں میں نوے فیصد نہایت تیز شراب پینے کے عادی تھے۔

نوبت رفتہ رفتہ ہی یہاں تک پہنچی تھی۔ شاہی مشیر نکولس ڈی کریمر کو امتناعی مہم کا کھوکھلا پن پہلے ہی

نظر آ گیا تھا اس نے 1906 میں زار کے سامنے جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں کہہ دیا تھا کہ یہ خیال غلط ہے کہ لوگ تفریحی سرگرمیوں کی بدولت شراب پینا چھوڑ دیں گے۔ یا تھیٹروں اور پارکوں میں ڈرامے اور تقریریں کرنے سے شراب نوشی کا انسداد ممکن ہے۔ لیکن خود ڈیمی کریمر کی تجاویز بے معنی اور ناکارہ سی تھیں اس کے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی کہ انجمن امتناع کے وسیع پراپیگندائی ادب کو ہمارے ملک کی طرح صرف وہی لوگ پڑھتے اور اثر لیتے تھے جو خود شراب نہیں پیتے اور پکے پرہیزگار تھے شراب نوش حضرات ایسے ادب کو ہاتھ نہ لگاتے تھے اور وہ شہزادہ اسکندر کی تفریح گاہوں میں مفت جی بہلاتے تھے اس طرح جو روپیہ بچاتے اس سے ودوکا خرید کر پیتے تھے۔ 1910 میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ امتناعی مہم کی خیر و برکت سے شراب کی کھپت اور بڑھ گئی اور اس مہم کی جتنی کمیٹیاں تھیں ان میں سے فی کمیٹی نو کے حساب سے سرکاری ٹھیکے چل نکلے۔ تاہم ناکامی اور مایوسی کے باوجود امتناعی تنظیمیں اس بدعت کے خاتمے پر غور کرنے کے لیے ایک کل روس اجتماع بلانے میں کامیاب ہو گئیں اس اجتماع میں ٹریڈ یونینیوں نے بھی شرکت کی اور انہوں نے شراب نوشی سے پیدا ہونے والے سماجی اور معاشی مسائل اٹھا لیے۔ انہوں نے ڈوما رزار روس کی پارلیمنٹ میں دباؤ ڈالا کہ سرکاری ٹھیکوں کے اوقات فروخت کو قانوناً محدود کیا جائے لیکن اس کانگرس کے انعقاد سے جو نتیجہ نکلا وہ صرف یہ تھا کہ پارلیمان میں ایک بل پیش ہوا جس میں ودوکا میں نشے کی نسبت پچاس سے سنتیس فیصد کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ لیکن یہ بل بھی قانون نہ بن سکا۔

اس کے چار سال بعد یعنی 1914 میں زار شاہی ریاست کے لیے شراب کا مسئلہ ہنگامی صورت اختیار کر گیا۔ شاہی حکومت نے انگلستان اور فرانس کے ساتھ فوجی اتحاد کی پالیسی مرتب کی تھی۔ لہٰذا لاکھوں سپاہیوں کو جدید ترین اسلحہ جنگ سے لیس کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا اور زار روس کو صنعتی سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کئے بغیر نہ بن پڑی۔

لیکن شراب کے سلسلہ میں سرمایہ دار اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے ان کا مطالبہ تھا کہ حکومت شراب پر ٹیکس کم کر کے کسی اور ذریعے سے بجٹ کو متوازن بنائے اور ودوکا کی بکری کو حتی الوسع گھٹائے۔ لہٰذا 1914 میں زار نے اعلان کیا کہ شراب پر مزید ٹیکس نہیں لگائے جائیں اور ان مقدار میں اضافہ بھی نہ کیا جائے گا اسی سال مشرقی محاذ پر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مورچوں میں شراب نوشی جاری رہنے سے کوئی نقصان نہ تھا۔ لیکن کارخانوں اور دیہات میں اس کا بہت برا نتیجہ نکلا کیونکہ پیداوار خاطر خواہ نہ ہو سکی اس لیے سرمایہ داروں نے زار روس کو الٹی میٹم دے دیا۔

آخر کار شراب کی خرابی کا آخری لمحہ آ پہنچا۔ زار نے ڈرامائی اور جابرانہ انداز سے تمام روس میں شراب کی جبری اور مکمل بندش کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ معظم نے فرمایا کہ یکم جولائی 1916 کی صبح سے ودوکا یا بیر کی کشید اور فروخت کو مابدلت کی ذات اقدس کے خلاف سنگین جرم تصور کیا جائے گا لیکن شراب کی فروخت کے معاملے کو ہر علاقے کے مقامی حکمران کی مرضی اور فیصلے پر چھوڑ دیا گیا۔

اس فرمان کا اجرا اس قدر خلاف توقع تھا اور اس پر اس قدر شدت اور تکمیل سے عملدرآمد ہوا کہ ساری قوم سکتے میں آ گئی۔ پہلی سے کوئی پراپیگنڈا اور کوئی رسم افتتاح ادا نہ کی گئی تھی۔ لہٰذا اعوام اس سخت اقدام کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے سے قاصر رہے وہ دم بخود تماشائی بنے رہے اور ادھر دہشت آفرین خفیہ پولیس کی رہنمائی میں مسلح سپاہیوں کے دستے ایک ٹھیکے سے دوسرے ٹھیکے پر چھاپہ مارتے۔ شراب کے تمام ذخیرے کو بدروؤ میں بہا دیتے اور دکان پر تالا چڑھا دیتے جہاں تک کشید گاہوں کا تعلق ہے وہ

بالکل مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ بڑے سے بڑے رئیس یا وزیر کی جرأت نہ تھی کہ شاہی فرمان کی مخالفت کرے۔ مسلح سپاہیوں کے دستوں نے شراب کی ہر بھٹی اور ہر کشید گاہ پر حملہ کیا۔ تمام ووڈکا اور بیر دریاؤں میں بہا دیا اور اس کے آلات کشید کو اس طرح تباہ کر دیا کہ دوبارہ مرمت کے قابل نہ رہے۔ چند ہفتوں کے اندر زار شاہی میں شراب کی پیداوار پوری طرح بند ہو گئی۔

تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ شراب کا قطعی امتناع اس طریق پر عمل کیا گیا۔ عوام پر اس کارروائی کا جو ردعمل ہوا ہو گا وہ کبھی سامنے نہ آ سکا۔ شراب نوشی کے مخالف اور شرابی دونوں زار کے اس کے اس ہنگامی جبری اور مکمل اقدام پر دم بخود تھے۔ سولہ کروڑ باشندے خاموش، حیران اور مبہوت رہے۔

زار روس نے قلم کے ایک ہی جھٹکے سے اپنے مقبوضات میں شراب اور شراب خوری کا صفایا کر دیا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر امریکہ میں اٹھارہویں ترمیم کے لیے زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ روس کی بدرروؤں میں لاکھوں، کروڑوں گیلن ''شیطانی'' یعنی شراب کے بہاؤ کے تصور پر بعض مبصرین خوشی سے دیوانے ہو گئے انہیں پراپیگنڈے کے لیے زبردست مواد مل گیا زار روس نے کوئی امتناعی قانون پاس نہ کیا تھا۔ اس نے چٹکی بجاتے ہی شراب کی جڑ مار دی تھی اس کی تمام رعایا ڈر کے مارے چپ رہی۔ 1916 کے نصف آخر اور 1917 کے ابتدائی مہینوں میں روس کے باشندوں کو شراب کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ لاکھوں نابالغ لڑکے جو روزانہ چالیس فیصد الکحل آمیز شراب کے پیمانے کے پیمانے پر پیمانے خالی کرنے کے عادی تھے وہ نالی کے راستے ووڈکا کے غائب ہو جانے پر کافی صحت مند نظر آنے لگے۔ گویا یہ امتناع قدرے کامیاب رہا۔

اور یہ امتناع دراصل کل نو مہینے تک کامیاب رہا۔

جو عادت عارضی طور پر دب گئی تھی۔ وہ نو مہینے کے بعد اچانک لاوے کی طرح پھر اچانک پھوٹ پڑی۔ روس کے لاکھوں انسانوں میں ناقابل برداشت پیاس بھڑک اٹھی ادھر میدان جنگ میں روسی فوجوں کے ٹکڑے اڑ رہے تھے ادھر روس پر بھوک اور بیماری کے بادل چھا گئے۔ تمام سلطنت میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص فرار کا متمنی نظر آنے لگا۔ پراگندہ خیالات متحدہ طور پر بوتل پر جا ٹھہرے۔

اور انہوں نے بوتل کو پیدا کر لیا۔ جس سرعت سے زار نے بندش کا فرمان جاری کیا تھا اسی سرعت سے روس دوبارہ ووڈکا میں ڈوب گیا۔ شراب خانہ ساز یعنی دیسی شراب اور اس کی ناجائز فروخت کا دور آیا۔ کسانوں نے غلے کی جگہ آلو بوئے، میلے کچیلے، ہر صاف ناصاف طریقے سے ان کا خمیر اٹھایا اور شراب قطرہ بہ قطرہ ٹپکنے لگی۔ جو علاقے جرمن حملہ آوروں کی زد میں پڑتے تھے وہاں کے کسانوں نے غلے کے ذخیروں کو شراب میں تبدیل کر دیا اور بڑی آسانی سے روپیہ اکٹھا کر لائے۔ اس دیسی شراب کو تیار ہوتے دیر لگتی تھی۔ لیکن شہریوں اور سپاہیوں میں آنکھ جھپکتے میں کھپ جاتی تھی۔ جو کچھ امریکہ میں شراب خانہ ساز کے دور میں ہوا تھا۔ وہ روس والوں کی ادنیٰ سرگرمیوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔ زار کی سلطنت چند مہینوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناجائز شراب میں تیر رہی تھی۔

یہ شراب کافی حد تک زہرناک تھی اور اکثر مہلک ثابت ہوتی تھی۔ لاکھوں روسیوں نے اپنے تلخ تجربے سے یہ سبق سیکھا کہ خالص شراب چند آدمیوں کے لیے مضر تھی مگر شراب خانہ ساز جو طبی نگرانی سے بے نیاز تھی۔ زود یا بدیر مضبوط سے مضبوط جسم کو بھی کھوکھلا کر دے گی اس قسم کی شراب میں زہریلا مادہ اس کے نشیلے جزو کی بجائے ان خارجی کیمیائی اجزا کی ملاوٹ سے پیدا ہوتا ہے جو غلیظ کبات اور خمیر اٹھانے

اور کشید کرنے کے ناصاف طریقوں کا خاصہ ہے۔

اس مکمل امتناع کا ایک اور خاص نتیجہ نکلا چونکہ وودکا کھلے بازار میں فروخت نہ کی جاسکتی تھی اس لیے چاء کی دکانیں اور بدمعاشی کے اڈے خلاف قانون کلال خانوں میں بدل گئے شراب کی خفیہ فروخت کے پس پردہ ہر قسم کی بدکاری پھلنے پھولنے لگی۔ حالانکہ شراب کی ناجائز فروخت، خرید یا استعمال کے لیے سنگین اور خوفناک سزائیں مقرر تھیں۔ لیکن سنگدل سے سنگدل پولیس افسر بھی ان سزاؤں کو برائے کار لانے کا حوصلہ نہ کرسکا۔

یوں شراب کے مکمل امتناع کی یہ انوکھی سکیم جو سنگینوں کے بل پر نافذ ہوئی اپنے المناک انجام کو پہنچی۔

روس کے ایک پروٹسٹنٹ پادری، تقدس مآب پردخونوف جو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے کل روس یونین کے صدر تھے ایک مرتبہ امریکہ آئے تو انہوں نے مذکورہ بالا صورت حال کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

قانون امتناع شراب کے نفاذ سے پہلے اگر ہر درمیان گھرانے میں ایک شخص شرابی تھا تو بندش کے زمانے میں ہر گھر بہ یک وقت کشید گاہ اور شراب خانہ بن گیا۔ ہر کہیں عورتوں اور مرد کھلے بندوں قانون کو توڑ کر وودکا تیار تھے، لوگ پی کر سوتے تھے۔ ناشتے پر پیتے تھے۔ نشے کی حالت میں کام پر جاتے تھے۔ بیہوشی کے عالم میں کلیسا جاتے اور مائیں اپنے بچوں کو کھانے کے ساتھ شراب بھی دیتی تھیں۔

شراب نوشی کے انسداد سے متعلق بے شمار متضاد خیالات اور آراؤں میں سے صرف 5 بڑے نظریے چنے گئے، چونکہ ہمارے ہاں ان میں سے ہر ایک کے بے شمار حامی ملتے ہیں اس لیے ان کا مختصر سا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1- امتناع:۔

زار روس نے یہ طریقہ اتنی خوبی سے آزمایا تھا کہ سوویت حکومت اس کی ہمسری نہ کرسکتی تھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ طریقہ اس تجربے سے بھی زیادہ بری طرح ناکام رہا تھا جو ان دنوں امریکہ میں کیا جارہا تھا، شراب کی قانونی ممانعت کا طریقہ بالکل لچر ہے۔ اس کے علاوہ اسے اشتراکی اخلاقی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ اشتراکی اخلاق جبر کے بجائے ترغیب کے حامی تھے۔

2- تعلیم:۔

اس سلسلے میں سوویت حکومت نے شہزادہ اسکندر کی تعلیمی مہم کا مطالعہ کیا۔ جس کا کوئی امید افزا نتیجہ نہ نکلا تھا۔ ایسی تعلیم شرابی کے لیے ہوئے سے کم نہ تھی۔ کیونکہ اس میں شرابی سے ذاتی قربانی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ شرابی کو یہ کہہ دینا کہ اس کی صحت اچھی ہوجائے گی اور اسے ذاتی سکون ملے گا، بالکل الٹی منطق تھی، کیونکہ لوگ ذاتی تسکین ہی کے لیے تو پیتے ہیں۔ سبب خواہ کچھ بھی ہو، تاریخ ثابت کرچکی تھی کہ محض تعلیم کے ذریعے قوم سے نشہ بازی چھڑائی نہیں جاسکتی۔

3- مذہب:۔

آج ہمارے سامنے پوشیدہ شرابیوں کی اصلاح کی تنظیم کی صورت میں مذہبی تجربہ موجود ہے۔ مسئلہ شراب کو حل کرنے کی یہ کوشش بھی امید افزا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریقہ بعض نفسانی

بیماریوں میں موثر ثابت ہوتا ہے لیکن سوویت حکومت اس کی حمایت نہ کر سکی۔ کیونکہ تمام کلیسا ان دیہاتی پادریوں کی طرح بدنام تھا جو بری طرح شراب کے عادی تھے۔

4- نفسیات

نفسیاتی طریق علاج کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، کیونکہ ساری دنیا میں بھی اتنے ماہرین امراض نفس موجود نہیں تھے کہ اکیلے ماسکو کے شرابیوں کے لیے کافی ہوتے۔ عملی نقطہ نظر سے نفسیاتی طریق اور مذہب میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ اس کا دائرہ عمل چند لوگوں تک محدود ہے۔ لیکن یہاں سوال قوم کا تھا۔ اگرچہ اس کے موقل دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے تمام قوم کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس کا اطلاق لاکھوں افراد کس طرح کیا جائے۔ علاوہ ازیں اشتراکی کی ماہرین کی عقل سلیم یہ نہ مانتی تھی کہ روس کے لاکھوں باشندے ذہنی امراض میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ شراب نوشی کا سبب جسمانی اور ذہنی خلل کے علاوہ کچھ اور ہے۔

5- سرکاری کنٹرول:۔

اس سلسلے میں بھی حکومت کے پاس پہلے سے بے شمار تجربے موجود تھے جنہیں وسیع پیمانے پر آزمایا گیا تھا۔ ان کے مطالعے سے یہی پتہ چلا کہ روس کے شہنشاہوں مختلف نے شراب کی فروخت پر کنٹرول کے جو متعدد طریقے استعمال کئے تھے، ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ شراب اور زیادہ کثرت سے پی جانے لگی۔ حتیٰ کہ اس کی کھپت فی کس 12/5 گیلن سالانہ جا پہنچی لہٰذا سوویت ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ سرکاری کنٹرول کا طریقہ بھی ناکارہ ہے۔ اس سے شراب نوشی کثرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے کہ یہ نتیجہ کینیڈا میں کس طرح سچ ثابت ہوا۔ شراب پر کئی سال تک کامیاب اور شاندار صوبائی کنٹرول کے باوجود آج مستعمرہ کینیڈا میں شراب کی کھپت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ جنگ کے زمانے کی سخت راشن بندی سے پہلے کینیڈاوی قوم کو کثرت سے پینے والوں کی قوم نہ مانا جاتا تھا۔ لیکن 1941 میں کینیڈا والوں نے ایک کروڑ دو لاکھ گیلن شراب پی جس میں شراب کے علاوہ بیرا ورانگور کی شراب بھی شامل ہے۔ گویا وہاں کی کھپت اس قدر بڑھ جائے گی کہ زار شاہی روس کی مثال زندہ ہو جائے گی۔

خیر مذکورہ بالا تجزیے کے بعد سوویت حکومت نے جو بنیادی نتیجہ اخذ کیا۔ اس جامع اظہار کے لیے شاید عیسائی عورتوں کی انجمن امتناع کی بانی اور تادم مرگ اس کی صدر، فرانسس دلارد کے مشہور مگر ایک عرصے سے بدنام مقولے سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے۔ وہ الفاظ یہ ہیں اکثر لوگ اس لیے مفلوک الحال نہیں کہ وہ پیتے ہیں، بلکہ اس لیے پیتے ہیں کہ وہ مفلوک الحال ہیں

یہ ہے شراب کی اصل حقیقت۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ مذکورہ انجمن کی اراکین نے نیک نیتی اور خلوص کے باوجود اس زبردست اور اہم حقیقت کو سالہا سال سے بھلا رکھا ہے۔ فرانسس دلارد نے نفسیاتی، مذہبی، تعلیمی اور سرکاری کنٹرول کے پھیلائے ہوئے انتشار کو کوڑے کرکٹ کی طرح اٹھا کر الگ پھینک دیا اور وہ مسئلہ شراب کی تہ تک جا پہنچا۔ یہ مسئلہ صرف معاشرتی اور معاشی ہے۔ لوگ اس لیے پیتے ہیں کہ وہ مایوس اور پریشان ہیں۔ ان کی زندگی بربادی، محرومی اور بے اطمینانی کی زندگی ہے۔ جب تک اکثریت کے لیے ایک ایسا سازگار ماحول پیدا نہ کر دیا جائے کہ اس میں شراب ایک ضرورت نہ رہے اس وقت تک وعظ، تلقین، تعلیم اور جبری امتناع سبھی بے کار ہیں اور ٹھیک اسی طرح بیکار ہیں۔ جس طرح جنسی اخلاق کا

سدھار اس وقت تک ناممکن ہے جب تک معاشی طاقتیں مرد وعورت ہر دو کو عصمت کی خرید اور فروخت پر مجبور کرتے ہیں۔

زار روس کی رعایا شراب کی طرف اس لیے مائل ہوئی کہ ان افلاس ایک ناقابل تردید حقیقت تھی۔ لہٰذا سوویت یونین کے ماہرین کو ایک ہمہ گیر قومی فلاح و بہبود کے پروگرام ہی میں نجات کی صورت نظر آئی۔ یہ تھا پہلا بنیادی نتیجہ۔

دوسرا بنیادی نتیجہ جو اشتراکی ماہرین نے اخذ کیا، یہ ہے کہ کوئی فرد اگر ماحول سے متاثر ہو کر پیتا ہے تو قوم کی ترغیب دلانے والی چیز وہ بے شمار سرکاری آمدنی ہے جو شراب کی فروخت پر ٹیکسوں کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔

لہٰذا عملی اقدامات؟

طلاق اور اسقاط حمل کے انسدادی اقدام کی طرح سوویت حکومت نے شراب نوشی کے تدارک کے لیے جو پہلا قدم اٹھایا، وہ بھی الٹا نظر آیا۔ 1926 میں سوویت حکومت نے ایک سنسنی خیز اعلان کیا۔

سوویت حکومت نے شراب کی ناجائز فروخت سے منافع کمانے والے لوگوں کا کاروبار ختم کرنے کے ساتھ ہی شراب پر سے تمام قسم کے ٹیکس ہٹا دینے کا فیصلہ کیا اور یہ کام بڑی برق رفتاری سے ہوا۔ زار کی طرح مسلح سپاہیوں کی مدد سے نہیں، بلکہ نہایت عام اور سادہ طریقے سے یعنی شراب پر سے تمام ٹیکس اڑا کر اور ودوکا کی پرچون قیمتوں کو فی کوارٹ (چوتھائی گیلن) پینسٹھ سنٹ (ایک ڈالر میں سو سنٹ ہوتے ہیں) تک گرا کر۔

ظاہر ہے شراب نوش حضرات حیرت و مسرت سے بھونچکا رہ گئے۔ اس فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی روس کے اخباروں میں زار کی تجارت شراب کے متعلق پورے اعداد و شمار شائع کئے گئے اور بتایا گیا کہ لوگوں نے سابقہ حکومت کو شراب کے ٹیکسوں کی صورت میں بے شمار روپیہ ادا کیا، اشتراکی منتظمین کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس افشائے راز کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس سے شرابی اور صوفی دونوں بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی نئی حکومت ودوکا پر ٹیکس لگا کر منافع کمانا نہیں چاہتی اور پرچون سے جو تھوڑا بہت منافع حاصل ہوگا۔ اسے انسداد شراب نوشی پر خرچ کرنے کے لیے صحت عامہ اور تعلیم کے محکموں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

عوام کی حیرت اور دلچسپی کوئی حد نہ تھی۔ شراب کی قیمت میں انتہائی کمی کے اعلان کا دن روس میں غیر سرکاری تہوار یا میلے کا دن تھا۔

حکومت نے جو نئی قسم کی مصفٰے اعلیٰ اور سستی ودوکا مہیا کی وہ منول منر فروخت ہوئی اور ناجائز طور شراب تیار اور فروخت کرنے والے لوگ اسی دن سے دیوالیے ہو گئے۔

ادھر مے نوش برادری میں مسرت کی پہلی دھیمی ہوئی، ادھر سوویت حکومت نے نئے قوانین کا اعلان کر دیا۔ ان کی رو سے آئندہ تمام کارخانوں کے قریب مزدوروں اور سرکاری ملازموں کی تنخواہ کے دنوں اور تہواروں کے موقعوں پر شراب بیچنے کی ممانعت کی دی گئی اور ملیشیا کو کمسن شرابیوں اور ایسے لوگوں کو سخت سزائیں دینے کا اختیار دے دیا گیا جو نشے میں بے ہوش پائے جائیں۔

اس کے بعد روس کے طول و عرض میں ایک نئی قسم کی پروپیگنڈائی مہم چلائی گئی۔ مہم سائنٹیفک تھی۔ اصولاً یہ امتناعی انجمن کی مہم سے قدرے مختلف تھی۔ کیونکہ اب شراب کے خلاف پروپیگنڈا کرتے وقت

شرابی کی ذات پر شراب کے برے اثرات کا ذکر تک نہ کیا جاتا تھا۔ جہاں تک شراب کے علمی حقائق'' کا تعلق ہے انہیں نظر انداز بھی نہ کیا جاتا تھا اور ان کو بڑھا چڑھا کر بھی نہیں بتایا جاتا تھا۔

سوویت یونین کے ماہرین فعلیات و (علم وظائف اعضاء) نے بتایا کہ شراب ایک عام نشہ آور دوا سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سکون آور ہے اور بعض اوقات مفید بھی، کیونکہ یہ وقتی طور پر عضوی فعالیت کو موقوف کر دیتی ہے اور دماغ اور مرکزی نظام عصبی کو متاثر کرتی ہے، اس اعتدال سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ تو صرف شرابی کی قوت کار کردگی میں مزاحم ہوتی ہے۔ اس کے مستقل عادت سے خون میں آکسیجن کے امساک کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ شراب اعضا کے حیات آفرین نظام میں خطرناک اختلاف بھی پیدا کر سکتی ہے شراب اور چند دماغی بیماریوں میں خاص تعلق ہے۔ یہ کئی ذہنی امراض کا باعث ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کثرت شراب نوشی اکثر لوگوں کو دائمی تکان، حادثات اور بیماریوں کے خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ قصہ کوتاہ روسی عوام کو شراب کے بارے میں جو فیصلہ سنایا گیا اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا کہ شراب ایک ضرورت نہیں، اس کا جسم اور دماغ پر مفید اثر نہیں پڑتا۔ اگر چہ یہ مختلف افراد پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتی ہے، لیکن فائدہ کسی کو بھی نہیں پہنچاتی۔

جس طریقے سے یہ حقائق عوام کے ذہن نشین کرائے گئے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اس سلسلے میں سینما اور تھیٹر سے بہت زیادہ کام لیا گیا۔ ڈراموں اور فلموں میں روسی عوام کی روزمرہ کی سرگرمیوں کے ذریعے شراب کے متعلق ایسی چیزیں بتائی گئیں، جن کا براہ راست تعلق روس کو ایک طاقتور، صنعت کار اور زراعت پیشہ قوم بنانے کے منصوبے سے تھا۔ بچوں جوانوں، مردوں اور عورتوں کی چست ڈرامائی انداز میں بتایا گیا کہ شراب نوشی مستقبل کے معماروں یعنی انجنوں کے ڈرائیوروں، ٹرکوں، ٹریکٹروں، فصل کاٹنے کی مشینوں اور کارخانوں کی قیمتی مشینوں کو چلانے والے مردوں اور عورتوں نئے بجلی گھروں کے خاکے اور منصوبے بنانے والے انجنیر وں، یونیورسٹی کے طالب علموں اور کوئلہ کھودنے والے کارکنوں پر کس بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

کہانیوں میں شرابی پر نکتہ چینی ہرگز نہ کی جاتی تھی اور یہ نہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے۔ بلکہ دکھایا یہ جاتا تھا کہ یہ شخص کتنا نادان ہے۔ یہ اتنا سادہ ہے کہ اسے ابھی یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ وہ نئے سماج کی تعمیر میں حصہ لینے لگے تو اس کی زندگی کی کس قدر پر لطف اور مسرت بخش ہو جائے۔ کسی سے ہرگز نہ کہا جاتا تھا کہ مت پیو، کہانی میں شرابی کو ایک گنہ گار فرد کی طرح نہیں پیش کیا جاتا تھا بلکہ اسے ایک مضحکہ خیز، آداب مجلس سے بے خبر شخص کی حیثیت سے دکھایا جاتا تھا۔

ظاہر ہے اس طریقے سے پکے شرابی متاثرہ ہو سکتے تھے ان کے لیے سوویت منصوبے میں ایک دوسری چیز موجود تھی۔ انہیں خطرناک مجرم تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ وہ ساری قوم کے فلاح و بہبود اور ترقی کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ضرور تھے خاص طور جس وقت ودوکا پنیسٹھ سنٹ فی کوارٹ جیسی سستی قیمت پر دستیاب ہو رہی ہو تو ان کے ذہن قومی فلاح و بہبود کے خیالات کو کس طرح قبول کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے؟

ایسے لوگوں کے لیے ترک شراب کے جو طریقے اختیار کئے گئے وہ ان طریقوں سے ملتے جلتے تھے۔ جن سے عصمت فروشی میں کام لیا گیا تھا۔ جن علاقوں میں شراب خوری ایک نازک مسئلے کی صورت اختیار کر گئی تھی وہاں امتناع شراب کے سائنسی ادارے کھولے گئے۔ ودوکا کی امتناعی مہم کے کسی کارکن کو

کوئی بے ہوش شرابی ملتا تو وہ اسے قریب کے امتناعی مرکز میں لے جاتا۔

اس کے بعد اس کا نام، گھر کا پتہ اور دفتر یا کارخانے کا نام لکھ لیا جاتا اور اسے چھٹی دے دی جاتی۔ اس کے دفتر یا کارخانے کے ٹریڈ یونین کو اس کے متعلق پوری رپورٹ بھیجی جاتی۔ ہر دفتر اور کارخانے میں ایک خاص کمیٹی مقرر تھی وہ رپورٹ ملتے ہی ایک لمبا چوڑا اشتہار تیار کر لیتی۔ اس میں متعلقہ شخص کی تصویر یا کارٹون ہوتا۔ جس کے نیچے اس کا نام لکھا ہوتا۔ علاوہ ازیں اس کی بوتل سے شراب پینے کی کیفیت سے لے کر بعد کی تمام حالت کا نقشہ کھینچا ہوتا تھا۔

یہ سب کچھ اس شخص کے دوبارہ کام پر واپس آنے سے پہلے مکمل ہو جاتا، وہ کام پر واپس آتا تو اس اشتہار سے اس کا شایان شان خیر مقدم کیا جاتا۔ لہٰذا وہ دفتر یا کارخانے میں بدنام ہو جاتا اگر وہ شخص دو یا تین بار یہی حرکت کرتا تو اسے لوگوں میں اور بھی زیادہ سوا کیا جاتا۔

جن لوگوں کو بار بار گھیر کر امتناعی مرکزوں میں لے جایا جاتا اس کے خلاف ان کی یونین اور دوسری عوامی ادارے سخت نضباطی کاروائی کرتے۔

یہ طریقہ شرابیوں میں بے شمار امتناعی کتابچے تقسیم کرنے سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوا۔ شرابی کے لیے دیوالیہ پن، آوارہ گردی، فاقوں اور گھریلو جھگڑے اتنے زیادہ ڈراؤنے نہ تھے لیکن اسے دوستوں میں شرمندہ کرنے اور قوم کی ترقی میں دوڑ اٹکانے والے شخص کی حیثیت سے بدنام کرنے کا یہ طریقہ قوم کے لیے اصلاح اخلاق کا یا ایک کارگر ذریعہ بن گیا۔

چند سالوں میں ہی اس طریقے سے روس میں شراب نوشی تقریباً ختم ہو گئی اور درجنوں کی حد تک پینے والوں کی تھوڑی سی تعداد باقی رہ گئی۔ یہ لوگ کل شرابیوں کا ایک فیصد تھے ان لوگوں کو باقاعدہ شفاخانوں میں بھیجا گیا۔ یہ خاص شفاخانے پورے ساز و سامان سے آراستہ تھے اور ان میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کا علاج کیا جاتا تھا۔ اکثر لوگ اتنے قلیل عرصے میں صحت یاب ہو گئے۔ گویا وہ امتناعی مرکزوں کا تفریحی دورہ کرنے گئے تھے۔ جس دن انہیں شفاخانوں سے رہا کیا جاتا، اس سے اگلے دن ان کی صحت یابی کی خبر نمایاں کر کے چھاپی جاتی۔

لیکن سوویت یونین کے امتناعی پروگرام کی بعض شقیں ایسی بھی ہیں جو بادی نظر میں الٹی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ابتدا میں جو حکومت نے ریستورانوں اور ہوٹلوں میں شراب کی کھپت بڑھانے کی بہت زیادہ کوشش کی۔ یہ فیصلے ایسے ماہرین امراض نفسیہ کے مشورے سے کیا گیا تھا، جو شراب نوشی کے محرکات اور مواقع کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

کھانے کے ساتھ شراب کی اجازت کا اقدام بظاہر قدامت پسندانہ اور اصلاحی مقصد کے خلاف تھا۔ لیکن یہ اقدام اس لیے کیا گیا کہ ہوٹلوں میں کھانے کے ساتھ پی لینا، شراب خانوں اور ایسے ہی دیگر مقامات پر جہاں صرف شراب ہی ملتی ہے۔ پینے سے یا نہار منہ اور خالی پیٹ پینے سے کم مضر ہے، علاوہ ازیں شراب پر حکومت کے طویل المیعاد کنٹرول کا تجربہ ثابت کر چکا تھا کہ بغیر کھائے شراب پینا انتہائی افلاس کی علامت ہے۔ اس سے شرابی کی تمام تر توجہ شراب پر مرکوز ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کثرت نوشی اور عادت کی پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے سامنے یہ سوال آ جاتا ہے کہ کھانا کھائیں یا شراب پئیں اور اکثر اوقات نگاہ انتخاب شراب ہی پر پڑتی ہے اور کھانے کو ملتوی کر دیا جاتا ہے۔

ماحول اس سے بھی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ سوویت قانون سے صرف خوبصورت، خوش انتظام

اور باسلیقہ فیملی ریسورانوں میں شراب مہیا کی جاسکتی تھی۔ایسے مقامات پر جا کر پینے والوں کے کردار اور سیرت میں نمایاں اور خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ کم پیتے تھے۔ کیونکہ انہیں کھانا بھی کھانا ہوتا تھا اور عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کی موجودگی میں زیادہ بھی نہ پی سکتے تھے ورنہ تضحیک بننے کا خطرہ تھا۔

ایسے مقامات پر عارضی طور پر شراب نوشی کی کھلی چھٹی دے کر سوویت حکومت نے نافہم لوگوں کی توقع کے خلاف نتیجہ اخذ کیا۔اس سے شراب کی کھپت بڑھنے کی بجائے بے حد گھٹ گئی لیکن ہمارے ہاں کیا صورت حال ہے؟ بلدیہ شکاگو کے محکمہ علاج امراض نفس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی بی روسٹان نے امریکی میڈیکل ایسوسی ایشن کے جریدہ کے ایشوع بابت مارچ 1945 میں تحریر کیا کہ ''ہماری قوم کے آگے شراب کے مسائل موجودہ شدت اور خطرناک انداز سے کبھی نہ اٹھے تھے'' اس نے تسلیم کیا کہ حالت اس قدر نازک ہے کہ قانون امتناع کی طرف دوبارہ رجوع کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر روسٹان نے ایک نئی ترکیب ایجاد کی، یعنی اس نے ایک نئی ہستی کے منصۂ شہود میں آجانے کا انکشاف کیا اور اس نئی شخصیت کو اس نے ''دروازے کی چٹائی'' کا شاندار خطاب دیا۔اس نے کہا کہ سمندر پار سے واپس آنے والے اکثر سپاہی اپنی بیویوں کی صورت میں ''ایسی دروازے کی چٹائیوں'' سے دوچار ہوں گے جنہوں نے ''شراب نوشی'' کی حسین زندگی کا در باز کرنے کے لیے اپنی آموزش پر پانی کی طرح روپیہ بہایا ہوگا۔

''یہ دروازے کی چٹائی اب شراب خوری کے نقشے کا ایک مستقل جزو ہے یہ شخصیت پٹہ بازی کی کند تلوار اور گدیلے کی طرح دوہری حیثیت سے شراب خور مرد کے سر پر مسلط ہے'' ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ شراب خور مرد بوڑھی اور بیوہ ماں، کنواری بہن یا مجبور بیوی کی صورت میں اپنے آپ کو بے شمار دورازے کی چٹائیوں'' میں گھرا ہوا پاتا ہے۔اور شراب نوش عورت اپنے دوسرے یا تیسرے خاوند یا پھر تنہائی سے تنگ آکر اپنے چہیتے عاشق، یا ناکام شادی کے بعد اپنے دل پسند دلبر کی صورت میں متعدد ''دروازے کے بوریوں'' سے دوچار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر روسٹان نے شرابی عورتوں اور مردوں کی تعداد کے درمیان نسبت نکالی اور ثابت کیا کہ حال ہی میں یہ نسبت، نسبت معکوس کی شکل میں بدل گئی ہے۔اس نے یہ انکشاف کر کے تمام ماہرین طب کو درطہ حیرت میں ڈال دیا کہ 1931 میں چار یا پانچ مردوں کے مقابلے میں صرف ایک عورت شراب نوش تھی اور 1943 میں دو مردوں کے مقابلے میں ایک عورت۔

امراض نفس کے اس ماہر نے ''خفیہ شرابیوں'' کی ایک بہت بڑی تعداد کا انکشاف کیا انہیں شراب کی کھپت میں بے پناہ اضافے کا ایک سبب قرار دیا اور دعویٰ کیا کہ اب یہ معاملہ عوام سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے جزوی حل کی توقع بھی عوام ہی سے وابستہ کرنی چاہئیے''۔اس نے متنبہ کیا کہ ''خفیہ شرابیوں'' کی انجمن اصلاح کو چاہئیے کہ وہ القائے ارادی کے زجحان کو دبانے کے ساتھ ہی جو کوئے ازم (coueism) ہی کی ایک قسم ہے، اپنی کوتاہیوں اور کامیابیوں پر کڑی نظر رکھے۔

ڈاکٹر روسٹان کے خیال میں شراب خوری ایک سماجی بیماری ہے اور اکیلے ڈاکٹر اس کا تدراک نہیں کر سکتے۔اس سلسلے میں وہ ییل یونیورسٹی کی تحقیقاتی کونسل بہت زیادہ تعریف کرتا ہے۔لیکن اس تحقیقاتی کونسل نے بھی تو آج تک کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں دکھایا۔شراب کے معاملے میں امریکی ماہرین کا باہمی اختلاف رائے حیران کن ہے۔مثال کے طور پر ہاورڈ میڈیکل کالج کے مشہور معالج امراض نفس اور

محقق ڈاکٹر ابراہام میرسن نے1944 میں امریکہ کی ترقیات سائنس کی انجمن کو بتایا کہ مردوں کے مقابلے میں سات گنا زیادہ عورت شراب کی عادی ہیں۔اس طرح اس نے ڈاکٹر روسٹان کے اندازے کو غلط ثابت کر دیا۔دراصل بات یہ ہے کہ ابھی تک ایسے اعداد شمار جمع ہی نہیں کئے گئے۔

ڈاکٹر مامیرسن کا خیال ہے کہ کثرت شراب نوشی بذات خود کوئی مسئلہ ہی نہیں، دراصل شراب اس وقت ایک حل طلب مسئلہ بنتی ہے جب لوگ محض نشے کی غرض سے پینے لگیں اور جب تک پی نہ لیں،کل نہ پائیں۔بالخصوص اس وقت جب کہ مے نوش سیری کی حد تک پی کر بھی ایک جام کا مطالبہ کرے۔البتہ ان کے نزدیک حد سے زیادہ پینے کے معنی شراب خوری کی پختہ عادت کی شاہی سڑک پر چل نکلنے کے ہیں۔

یہ ماہر نفسیات چار قسم کے شرابی گنواتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں بھی وہ ڈاکٹر روسٹان کے ''دروازے کے چٹائی یا بوریئے'' والے نظریے کی تردید کرتا ہے۔خیر وہ چار قسم کے شرابی کون سے ہیں؟

1-وہ مجہول شخص جو دو جام پیئے بغیر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔

2-جو شخص ہنسی مذاق میں جان بوجھ کر بے انتہا پیتا چلا جاتا ہے۔

3-دماغی اعتبار سے غیر متوازن شخص جس کی شراب نوشی کی عادت ایک مرض کی علامت ہے۔

4-ایسا شخص جو محض شوق میں شراب کا عادی ہو جاتا ہے وہ زندگی بھر مسرت اور لذت کی خاطر پیتا ہے اور شراب کے لیے زندہ رہتا ہے۔

یہاں دروازے کی چٹائی یا بوریئے'' والے خاندان کا نام تک نہیں اور نہ کسی ایسے مسئلے کا ذکر ہے، جسے ڈاکٹر روسٹان شراب خوری کا دائی'' مظہر'' کہتا ہے۔

نظریوں میں اختلاف تسلیم،لیکن جب دو ماہر ایک دوسرے کے شماریاتی حقائق کو سرے سے جھٹلائیں۔تو ہم ان کے نظریوں کو علمی تحقیق کے ہم پلہ کیسے سمجھ سکتے ہیں؟

وہ ایک بات پر متفق ہیں۔ڈاکٹر مامیرسن کے قول کے مطابق ''یہاں بھی دماغی حفظان صحت کے تمام پروگراموں کی طرح سماج کی بدعنوانیوں، غلیظ اور گھنی آبادی کی سماجی خرابیوں اور بے روزگاری سے دو چار ہونا پڑے گا۔مختصراً یہ کہ شراب خوری کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے اور اس پر قابو پانے سے پہلے معاشرے کی نفسانی بیماریوں کے علم پر ایمانداری سے عبور حاصل کرنا ہوگا''۔اور ڈاکٹر روسٹان صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ''شراب خوری ایک عوامی مسئلہ ہے'' آج کل علم حقائق کی بجائے ترقی پسندانہ گپ کا رجحان عام ہے۔اور اصل صورت حال کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔اس قسم کی سطحی دلیلوں کا مقصد حقیقت سے گریز کے سوا کچھ نہیں، جہاں تک شراب کی تحقیق کا تعلق ہے۔اس برعظیم کے اکثر مقبول عام رسالے شراب نوشی کی نازک صورت حال کو چھپانے کے لیے محققین کے حوالے دیتے چلے آرہے ہیں۔ان رسالوں میں شراب کشید کرنے والوں کے اشتہارات جتنی زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں۔اسی قدر وہ شراب کے مسئلے انداز سے پیش کرتے ہیں۔

لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ حفظان الکحل کی قومی کمیٹی کے ناظم ڈائرکٹر ڈاکٹر آر'دی سلیگر اور میری لینڈ کے ہارم لوج سینے ٹوریم کی ناظمہ وکٹوریہ کرنیفورڈ نے اپنے حالیہ بیانات میں حقائق سے گریز کرنے کی کوشش نہیں کی، انہوں نے امریکی میڈیکل ایسوی ایشن کے جرنل کے 6 اکتوبر1945 کے الیشوع میں صاف صاف کہہ دیا کہ ''امریکہ میں شراب نوشی ایک خطرناک قومی مسئلہ بن گئی ہے''۔

ان سائنس دانوں کو یقین ہے کہ گزشتہ 25 برس میں کثرت شراب نوشی کا رجحان اس لیے پیدا ہوا

ہے کہ ہمارے موجودہ کلچر نے انسانی جذبات پر حد سے زیادہ باؤ ڈالا ہے۔انہوں نے جرائم پر شراب کے اثرات سے متعلق بحث کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ سماجی جرائم کا اقدام ایسے لوگ کرتے ہیں۔جن کی شخصیتیں کمزور اور نامکمل ہوتی ہیں، جو جذباتی اور متلون مزاج ہوتے ہیں، جو ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے، یا جو ذہنی انتشار اور مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات شراب نوش حضرات بھی سماجی جرائم کے مرتکب پائے گئے ہیں اور ان کی عادت شراب نوشی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول کے مطابق ٹھیک طرح نہیں ڈھال سکتے اور اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔

ان کے خیال میں جرائم کا سبب شراب نہیں چونکہ اعتدال سے زیادہ پی لینے سے قوت فیصلہ اور ضبط نفس عارضی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔اس لیے نشے کی حالت میں مجرمانہ حرکات کے سرزد ہونے کا امکان ہے۔

وہ عادی شراب نوشوں کو ایک الگ طبقہ قرار دیتے ہیں اور انہیں مندرجہ ذیل چھ اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔

1- جو لوگ جسمانی کمزوری کے سبب زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے نا قابل ہیں اور شراب نوشی کے علاوہ دوسری بدعادتوں میں مبتلا ہیں ایسے شخص انجام کار اخلاقاً بہت زیادہ پست اور سماج میں رہنے کے نا قابل بن جاتے ہیں انہیں تا عمر دماغی بیماریوں کے ہسپتال میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

2- وہ لوگ جو جذباتی اور عقلی اعتبار سے ناقص ہیں اور نفسانی انتشار اور ذہنی اختلال میں مبتلا ہوتے ہیں۔اس لیے وہ شراب پی کر زندگی کی تلخیوں سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

3- وہ شخص جو زندگی کے نا خوشگوار حالات سے دو چار ہونے سے گھبراتے ہیں اور پیتے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنا انہیں پسند نہیں ہوتا وہ اسے برداشت کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔

4- ایسے افراد جو اپنی ذاتی خامیوں، کسی کمزوری کے شعور، جنسی عدم مطابقت اور اسی قسم کی دوسری کمزوریوں کے احساس کو دبانے کے لیے پیتے ہیں۔

5- وہ لوگ جسمانی اور روحانی کرب اور تکلیف کو فراموش کرنے کے لیے پیتے ہیں۔

6- ایسے افراد جو عادت، وقت اور جسمانی تغیرات کے علاوہ زندگی کے بڑھتے ہوئے رنج وآلام کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے عام مجلسوں میں پیتے پیتے شراب کے مستقل عادی ہو جاتے ہیں۔

اس بیان اور ڈاکٹر مامیرسن کے اس بیان میں مشابہت واضح ہے۔لیکن دونوں میں اختلاف بھی شدید ہے۔ جہاں تک شراب کی تحریک دلانے والے اسباب کا تعلق ہے۔سلیگر اور کرنیفورڈ اس شخصیت کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے جسے ڈاکٹر روسٹان نے ''دروازے کی چٹائی یا بوریا'' کہا ہے'' بلکہ وہ مندرجہ ذیل محرکات گنواتے ہیں۔

''خود فراموشی کے رجحانات یعنی کسی ناشگوار ذہنی حالت کو برداشت نہ کرنے کی عادت کوئی عملی اقدام کئے بغیر ذاتی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش۔اعتدال سے زیادہ اکساہٹ اور حیاتی مسرت کی آرزو،

فرائض اور ذمہ داریوں سے جی چرانے کی عادت، جس سے خیالی پلاؤ پکانے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ خود اعتمادی، خود نمائی، راحت اور سکون جیسے لازمی محسوسات جن کو بعض لوگ شراب پی کر وارد کرنا چاہتے ہیں''۔

یہ ماہر اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ مے نوشی ایک توراثی ایک توراثی چیز ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی عمل ثبوت نہیں۔ لیکن ماہرین امراض نفس مانتے ہیں کہ بعض افراد کے آباؤ اجداد مسلسل شراب پیتے آئے ہوں۔ تو ان کی قوت مزامت کمزور ہو جاتی ہے۔ اور وہ آسانی سے شراب کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔

یہ سب مقولے اور حقائق کافی دلچسپ ہیں۔ لیکن سلیگر اور کرنیفورڈ کا بیان اپنے نتائج کے باعث بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ وہ عام ماہرین کی طرح شراب خوری کے معاشرے پر اثرات کا سطحی جائزہ لینے کی بجائے اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ سماجی اعتبار سے شرابی کو مریض تصور کرنا چاہیئے۔ اور تعلیم کے ذریعے سے نئے سرے سے رہنے سہنے، جوش اور اکساہٹ کے عمل اور ردعمل، مایوسی، انتشار کے متعلق نئی عادتیں پیدا کرنے کے قابل بنانا چاہیئے۔

وہ کسی شرابی عورت یا مرد کے وجود محض کو شرابی مسئلہ نہیں مسئلہ مانتے بلکہ وہ سماجی پیمانے پر عملی اقدام کی اپیل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

''ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے سماجی ماحول کی تبدیلی یا اصلاح کے پروگرام میں وسیع انسدادی اقدامات کو شامل کریں۔ تاکہ وہ ذہنی کھنچاؤ اور پریشانی میں اضافے کے بجائے صحت مند برادرانہ زندگی کے ذریعے قدرے سکون اور تحفظ کا موجب ہو''۔

ہوسکتا ہے کہ یہ بیان ترکیب بندی کے اعتبار سے قدرے گریز خواہ ہو۔ لیکن یہ ان لاتعداد بیانات سے زیادہ گراں قدر ہے۔ جو پچھلے دنوں شراب نوشی کے اسباب کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ اس میں شراب نوشی اور سماجی بدکاری کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق وہی بنیادی سوال اٹھایا گیا ہے، جس کا جواب عرصہ ہوا سوویت یونین دے چکا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ نئی زندگی کا بھرپور سماجی شعور پیدا کرنے کے ساتھ ہی خود سماج میں کس طرح تبدیلی لائی جائے کہ تمام افراد کو خاطر خواہ تحفظ اور سکون نصیب ہو؟

امریکہ میں شراب کی کھپت دن رات تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ محکمہ تجارت نے 1944 کے بارے میں اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ ان کے مطابق متوسط درجے کے شخص نے اس سال کے دوران میں چون دالر شراب پر خرچ کئے۔ منشیات سے قومی آمدنی کے بل کی قدر سات ارب ڈالر تھی۔ جو تمام قومی آمدنی کا پانچ فیصد ہے۔ لیکن محکمہ والوں نے متنبہ کیا کہ قومی آمدنی میں اضافے سے براہ راست شراب کی کھپت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ 1943 میں شراب پر ٹیکس بڑھا دیئے گئے تھے اور اس طرح جو شراب بکی، اس کی مالی قدر تینتالیس فی صد زیادہ تھی۔ اور اس فاضل آمدنی کا نصف ٹیکسوں کے ذریعے وصول ہوا۔ غرضیکہ امریکہ میں ایک سال کے عرصے میں شراب کی کھپت تقریباً بیس فی صد بڑھ گئی۔

جنگ کے سالوں کے متعلق سویت یونین کے اعداد و شمار بھی تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت زیادہ کم ہوں گے، کیونکہ وہاں فوجی اقدامات کے سبب بہت سی کشید گاہیں تباہ ہو گئی تھیں، لیکن شراب کی پیداوار اور کھپت میں کمی کا یہ ایک اتفاقی سبب ہے۔ اسے ملک یا قوم کا وصف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا مقابلے کے لیے جنگ سے پہلے کے سالوں کے اعداد و شمار موجود ہیں۔

1936 تک تمام سوویت یونین میں شراب کی کھپت گھٹ کر فی کس تقریباً 4/5 گیلن سالانہ رہ گئی

تھی۔اس کا مقابلہ امتناعی مہم کی ناکامی کے دوسرے سال سے کیجئے جبکہ فی کس 12/5 گیلن کی اوسط تھی۔گویا اوسط کمی تقریباً پچاس فی صد یا فی کس 3/5 گیلن سالانہ کے قریب ہے۔

شاید آپ اس سے متاثر نہ ہوئے ہوں،سوویت یونین کی آبادی پر غور کیجئے،آج سے دس برس پہلے وہاں کروڑ نفوس آباد تھے،لہٰذا سوویت یونین کی امتناعی سرگرمیاں اس قدر کامیاب رہیں کہ مہم کے ابتدا میں دس سال تمام قوم میں شراب کی کھپت دس کروڑ گیلن سالانہ کے حساب سے اور کم ہوگئی۔

یہ ایک بے مثال واقعہ ہے۔

لیکن سوویت یونین کی امتناعی مہم کی کامیابی کو عصمت فروشی اور جنسی بیماری کی انسدادی مہم کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔وجہ ظاہر ہے کہ شراب نوشی کا مسئلہ نزاکت کے اعتبار سے جنسی بیماری اور عصمت فروشی سے کم اہم ہے۔دراصل سوویت یونین کے طبی ماہرین میں آج کل شراب کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔سرخ فوجوں کے بعض ڈاکٹر میدان جنگ میں کام کرنے والی نرسوں کو جو ریڈ کراس سوسائٹی کی رکن ہیں دواؤں میں ودکا سپلائی کرتے ہیں اور خاص حالات میں ڈاکٹر پی اے پینی کوف جیسی ہستیاں شراب کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتی ہیں ڈاکٹر موصوف کے اس مشہور نسخے میں دو اونس ودکا بھی شامل ہے جو معدے کے زخموں کے لیے ہے،آج کل روس میں شراب نوشی کے متعلق کوئی مہم نہیں چل رہی اور خود ہمارے ہاں کے ماہرین محسوس کرتے ہیں کہ حقیقی مسئلہ الکحل بازی کو ختم کرنا ہے نہ کہ شراب نوشی کی ہر صورت کو کیونکہ بین الاامی تقاریب میں رسمی طور پر پینا اور بعض دواؤں میں شراب کا ملانا گزیر ہے۔

الکحل بازی یا محض نشے کی خاطر عام شراب نوشی سوویت یونین میں ناپید ہو چکی ہے۔ان کا امتناعی جہاد کامیاب ہے۔اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اب بہت پیتے ہیں۔یعنی ایک سال میں دس کروڑ گیلن کم۔

بچوں کے تحفظ کی عدالتیں

تو قتل نہیں کرے گا۔تو چوری نہیں کرے گا۔

یہ حکم ان احکام خداوندی میں سے ایک ہے جو قدیم زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے،جرائم کے انسداد کی جدوجہد ان سے بھی پرانی ہے صدیوں تک اس جدوجہد کا نتیجہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ نکلا۔جدید زمانے میں سائنس نے ترقی کی اور تمام اسرار قدرت کی باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوا تو اس کے ساتھ ہی جرائیم کی تحقیقات بھی شروع ہوئی۔1936 میں بلجیم کے ایک محقق،اے کویئے لٹ نے شماریات جرائم پر تاریخ میں سب سے پہلا تحقیقی مقالہ لکھا اس کا نام ''انسان اور اس کی صلاحیتوں کا ارتقا تھا''۔یہ برسلز سے نکلنے والے ایک جریدہ صحت ''عسے ڈی فزیک سوشیل'' میں شائع ہوا۔اس مقالے میں انہوں نے لکھا۔

سماج کے شکم میں ہر جرم کا ہیولی پہلے سے موجود ہوتا ہے۔جس کا ظہور بعد میں ہو کر رہتا ہے۔خود سماج ایسے حالات پیدا کرتا ہے،جن میں جرائم پروان چڑھتے ہیں۔بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جرائم کے لیے سماج ہی زمین تیار کرتا ہے،مجرم تو محض ایک آلہ ہے یہی وجہ ہے،کہ ہر معاشرے کی تنظیم اور جرائم پیشہ لوگوں کو وجود دونوں لازم و ملزوم رہے ہیں''۔

اس محقق نے اپنے بیان کو انقلابی کہا اور اعلان کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ میرا بیان بادی النظر میں یاس انگیز معلوم ہو لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں امید کی جھلک موجود ہے۔ کیونکہ اس میں اشارۃً کہہ دیا گیا ہے کہ سماج کے اداروں افراد کی عادتوں، تعلیم اور طرز زندگی پر اثر انداز ہونے والی ہر شئے کی تبدیلی سے انسانی فطرت کی اصلاح ہوسکتی ہے''۔

لیکن یہ محقق اور اس کے پیرو ماہرین علم جرائم ایسی قابل عمل تجاویز پیش کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔ جن سے انسان کی فطرت کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔

فرانسس دلاور کی مسئلہ شراب کے متعلق تاریخی تحقیق کی طرح کوئیلٹ کے اس فیصلے کو بھی سن کر بھلا دیا گیا۔ جس میں سماج کو جرائم کا جنم داتا کہا گیا ہے۔ آج تک علم جرائم اور قانون کے ماہریں کی زیادہ تر توجہ بدکاری کے اسباب کی تلاش کی بجائے سزا کی جستجو پر مرکوز رہی ہے۔

سائنس تقریباً سو سال سے ثابت کر چکی ہے کہ جرائم کی ذمہ داری فرد کی بجائے سماج پر عائد ہوئی رہی ہے۔ لیکن اس اثنا میں ہمارے قانون کا رخ الٹی طرف رہا ہے اور فرد کو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ قانون دان حضرات کا ایمان چلا آتا ہے کہ صرف سزا ہی وہ جادو کا ڈنڈا ہے جس سے مجرم کو دوبارہ قانون شکنی نہ کرنے کا سبق سکھایا جاسکتا ہے۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ سزا بالکل بیکار چیز ہے۔ خود ہمارے قانون سازوں نے اس کا عملاً اعتراف کرتے ہوئے اکثر جرائم کی سزاؤں کو کافی نرم کر دیا ہے۔ آج کل ہم اس دور سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ جب کسی مرد یا عورت کو خرگوش چوری کرنے کی پاداش میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یا غیر اخلاقی افعال پر کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود ہم اس نظریئے پر جمے ہوئے ہیں۔ کہ محرکات جرائم بے شک سماجی ہیں، لیکن مجرم کو قرار واقعی سزا دینے سے جرائم کو ختم نہیں تو کم تر ضرور کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر جرائم کی رفتار دن بدن تیز ہو رہی ہے اور بعض نئی قسم کے جرائم جنم لے رہی ہیں۔

نازیوں نے اس نقطۂ نظر کو انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ جرمنی کی وزارت عدل وانصاف کے رکن مسٹر فویضلر نے ہٹلری علم جرائم کا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

سزا اس قدر سنگین ہونی چاہیئے کہ کوئی آدمی دوبارہ جیل کا مزا چکھنے کی جرأت نہ کرے''

یہ تو اس دور کی طرف مراجعت ہوئی۔ جس میں آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا وحشیانہ اصول کارفرما تھا۔ آج کل مہذب لوگ اس سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ لیکن آپ کسی پولیس کورٹ میں چند دن جایئے۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہمارے قانون اب تک سزا اور انتقام کے اصول پر مبنی ہیں۔ ہم نے حضرت یسوع مسیح کی اس ہدایت کو بالکل بھلا دیا ہے۔ ''امتحان نہ ہو، کہ تمہارا بھی امتحان نہ ہو''۔

ہمارے ہاں علم جرائم کے بہت سے ''سائنٹیفک'' مکاتب خیال ہیں اور وہ کافی حد تک انسان دوست ہیں۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے۔ علمائے جرائم بالکل کورے ہیں۔ گذشتہ پچاس برس میں مجرمین کے ذہنی امراض کے علاج کے متعلق کئی مقالے ہمارے سامنے آئے ہیں، بعض حضرات نے قانون شکنی کے سماجی اسباب کو محض زبانی تسلیم کیا ہے۔ ان کا مجوزہ طریق کار سراسر انفرادیت پسندانہ ہے اور وہ تحلیل نفسی یا عندوکرین غدود (بے نلکی کے بعض غدود اپنے سیال کو براہ راست خون میں داخل کرتے

ہیں) پر طبی عمل یا جدید ترین اصلاحی قید خانوں کو واحد حل تصور کرتے ہیں۔علم جرائم کے طبی ماہرین جرائم پیشہ لوگوں کی صحت کی بحالی پر تو زور دیتے ہیں۔لیکن ان کے مرض کے سبب کو نظر انداز کر جاتے ہیں، یہ طریقہ ویسا ہی غیر سائنسی ہے۔جیسے کسی طوائف کو آتشک سے شفا پانے کے بعد دوبارہ بازار میں بٹھا دیا جائے، راز شاہی حکومت نے جرائم کے انسداد کے لیے ویسا ہی طریق کار اختیار کیا، جیسا کہ بدمعاشی اور شراب نوشی کے خلاف جدوجہد میں بیان کیا گیا ہے۔روسی عدالتیں عام طور سے جرائم پیشہ لوگوں کے لیے سائبیریا کی مشقت گاہیں اور قرون وسطیٰ اسی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں قید تنہائی درہ زنی اور ایسی ہی دوسری ایذائیں تجویز کرتی تھیں۔حالانکہ روس کا ہر جج، وکیل، جیل کا نگران اور پولیس کا سپاہی اس نظریئے کو غلط ثابت کرتا تھا سزاؤں کے ذریعے جرائم کا انسداد ہوسکتا ہے۔شاہی حکمران جواباً اور بھی سنگین سزائیں دیتے تھے، انقلاب سے بیس سال پہلے خطا کار بچوں پر خاص طور سے ظلم ہوتا تھا۔اس عرصے میں دس سے سترہ سال کی عمر کے گمراہ بچوں کی تعداد پہلے سے دگنی ہوگئی۔اور زار شاہی روس میں ہر طرف آوارہ مزاج، چور، شرابی، بیمار، اور بدمعاش بچوں کی فوجیں گھومتی نظر آنے لگیں، مسلح ڈاکوؤں اور قتل کے واردات میں دہشت ناک اضافہ ہوگیا۔

انقلاب کے بعد عام ہنگامی صورت حال کی وجہ سے 1922 تک جرائم کے خلاف کوئی باقاعدہ اور منظم مہم نہ چلائی جاسکی، لیکن اسی سال یعنی 1922 میں سوویت حکومت نے پہلا ضابطہ فوجداری شائع کیا۔ان قوانین کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ جرائم اور سماج کے سائنسی ادراک پر مبنی تھے، سوویت یونین کے سرکاری وکیل (پروکیوریٹر) اے دشنکی نے نئے قانونی نظر کی یوں تشریح کی ہے۔

عام افلاس بے روزگاروں کی لاتعداد فوج، حقوق یافتہ طبقوں کی بدعنوانیاں چھوٹے سوداگروں کا زیادہ سے زیادہ نفع کی امید پر سامان خریدنے کے لیے جنونی مقابلہ تجارتی دستاویزات (یعنی اسٹاک) کو اندھا دھند فروخت کرانے والے دلال، ناجائز اثر ورسوخ کے بل پر چلنے والے لاکھوں مجرمانہ کاروبار، غبن اور جعلسازیاں یہ ہیں جرائم کی پیداوار کی زرخیز زمین۔جن کی ذمہ داری سماجی تعلقات کے اس نظام پر عائد ہوتی ہے، جس میں ذاتی ملکیت کا عمل ہے۔اور جس کی خاطر ہزاروں بدکاریاں اور ناجائز حرکات بلاخوف سزا سرانجام پاتی ہیں۔

سوویت یونین کا ضابطہ فوجداری اس لحاظ سے ان تمام ضابطوں سے نرالا تھا کہ رومن قانون سازوں کے وقت سے لے کر آج تک اس قسم کا ضابطہ قانون وجود میں نہ آیا تھا، جو نئی قسم کے سماجی تعلقات پر مبنی ہو، اس نئے نظام میں فرد کے ذاتی مالی واسباب کے علاوہ باقی تمام شخصی جائداد کا کوئی خاص احترام نہیں کیا گیا۔ضروری مال واسباب کے علاوہ باقی کے ذخیروں کو حقیقتاً خلاف اخلاق تصور کیا گیا تھا۔اس ضابطے کا مقصد چور، خائن اور جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دینا نہ تھا۔بلکہ انہیں یہ سمجھانا تھا کہ اب ملک میں ایسے حقوق یافتہ طبقے باقی نہیں رہے۔جو بلاخوف پاداش قانون جرائم کا ارتکاب کرسکیں۔سوویت یونین میں صحت مندانہ تعمیرات رونما ہورہے تھے، ذاتی خودغرضانہ اور مالی منافعوں کی ہوسناک لڑائی کا رخ قومی خوشحالی کی جدوجہد کی طرف موڑا جارہا تھا۔اور جرائم کے خیابان میں بل چل رہا تھا۔

1923 میں سوویت عدالتوں میں جتنے مقدمات جرائم فیصل ہوئے۔ان کا اشاریہ سو فرض کیا جائے تو یہ 1926 میں تریسٹھ اور 1929 میں صرف ساٹھ تھا۔چھ سال کے عرصے میں دس میں چار جرائم ختم ہوگئے تھے۔

اس کے علاوہ سوویت یونین کے ماہرین علم جرائم اپنی جدوجہد کے آغاز کو 1930 سے شمار کرتے ہیں، جب کہ زراعت اور صنعت کی برق رفتار اجتماعی ترقی کے پیش نظر سوویت یونین کے ضابطہ فوجداری میں نمایاں تبدیلیاں کی گئیں، کئی سال سے قومی جائداد کی چوری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اور اس قسم کے چوروں کے خلاف مقدموں کی تعداد تمام مقدموں کی تعداد کے نصف سے بھی زائد تھی۔ جرائم پیشہ لوگوں کی اخلاقی تعلیم اور معاشی بحالی کے منصوبے کی بدولت پانچ سال کے عرصے میں جرائم کی تعداد میں ساٹھ فی صد اور اس کے ساتھ ہی ہر قسم کے جرائم کی مجموعی تعداد میں ایک تہائی کمی واقع ہوگئی۔

یہ کامیابی کیسے ہوئی؟

بعینہ ان طریقوں سے جو شراب نوشی اور بدکاری کے انسداد کی جدوجہد میں بروئے کار لائے گئے۔ لہٰذا ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، سوویت یونین میں جرائم پیشہ لوگوں کی اصلاح کے لیے جو طریقے اختیار کئے گئے، ان کے متعلق دوسرے ملکوں کے بہت سے اہل قلم حضرات تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ سوویت یونین کے سرکاری وکیل، مسٹر وشنسکی نے ان کا جامع خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

''جن جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ سرمایہ دار ملکوں میں آوارہ گردوں اور اچھوتوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ سوویت یونین میں انہیں ملک کی اقتصادی ترقی میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی جاتی ہے اور وہ سوشلسٹ سماج کے سرگرم معمار بن جاتے ہیں۔ بحیرہ ابیض اور بحیرہ بالٹک کو ملانے والی نہر اور دریائے والگا سے ماسکو جانے والی نہر کی کھدائی اور تعمیر سے سینکڑوں جرائم پیشہ لوگوں کو عملی تعلیم ملی، جنہیں ان نہروں کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے کام پر لگا دیا گیا۔ اس تجربے کے بعد زندگی کے متعلق ان کا نقطہ نظر ہی بدل گیا۔ اور ان میں ایمان دارانہ روزی کمانے کا شوق پیدا ہوا۔

سوویت یونین کی انسداد جرائم کی مہم کا نقطہ عروج وہ واقعہ ہے، جو دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے رونما ہوا۔ ماسکو کے قریب جرائم پیشہ لوگوں کے اصلاح و تربیت کے لیے کئی سال سے ایک ادارہ مصروف کار تھا۔ جو بولشیفو کالونی کے نام سے مشہور ہے، یہ مرکز کئی لحاظ سے ان فیکٹریوں سے مشابہ تھا۔ جو پیشہ ور عورتوں کی اصلاح کے لیے قائم کی گئی تھیں، اس ادارے کو ہزاروں سیاحوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی سرگرمیاں رفتہ رفتہ وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں اور اس کالونی کی معاشی اور تہذیبی زندگی اور قدر خوش گوار اور دل کش بن گئی کہ 1939 میں ایسے گریجویٹوں کی تعداد جو شادی کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے ہیں، ان نو واردوں کو ملا کر بھی بڑھ گئی، جنہیں عدالتیں سزا کے طور پر وہاں بھیج رہی ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر بولشیفو کالونی میں اصلاحی پروگرام کو ترک کر دیا گیا۔ لہٰذا یہ بستی ایک اصلاحی ادارے کی حیثیت سے ختم ہوگئی۔ اور اسے نئے سرے سے معزز شہریوں کی آزاد بستی کی حیثیت سے آباد کیا گیا۔ جن لوگوں نے امریکی نظام اصلاح پر وارڈن لاڈیس کی مشہور تصنیف ''سنگ سنگ میں بیس ہزار سال'' پڑھی ہے ان کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جرائم کے انسداد کے متعلق ہماری ان تھک جدوجہد اور سوویت یونین کی عملی کامیابی میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ جہاں بولشیفو کالونی تھوڑے عرصے میں قید خانے سے آزاد برادری میں تبدیلی ہوگئی۔

سوویت یونین میں اب بھی کئی قید خانے موجود ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ماضی کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ جرائم کے مقدمات کی سماعت کرنے والی عدالتوں میں ہر سال کم سے کم تر مقدمے آتے ہیں۔ ہمارے لیے شاید سوویت یونین کی انسداد جرائم کی جدوجہد کا سب سے زیادہ موثر کن پہلو وہاں کے

نوجوانوں کی سیرت میں انقلابی تبدیلی ہے عملی تجربے کے پندرہ سال بعد 1935 میں روسی بچوں کی جرائم کاریوں میں متعدبہ تغیر رونما ہوا اور بچوں کی اصلاح کے عملی تجربے کے اٹھارہ مہینوں کے درمیان ہی ان کے جرائم میں بائیس فیصدی کمی واقع ہوگئی ادھر ہماری حکومت ہمیں ابھی سے متنبہ کررہی ہے کہ ہمیں جنگ کے بعد خطا کار بچوں کی تعداد میں اور بھی اضافے کا سامنا کرنا پڑے گا آج بھی یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے جس سے لاکھوں گھرانوں کی مسرت اور مستقبل خطرے میں ہے بے شمار اسکیمیں اور نظریئے پیش کئے جارہے ہیں لیکن ہمارے بچوں کے نام نہاد مصلحین میں جو اختلاف اور انتشار پایا جاتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ حوصلہ فرسا ہے جو انسداد بدکاری اور شراب کے مجاہدوں کی صفوں میں دیکھا گیا۔

سوویت یونین نے بچوں کی اصلاح کے لیے جس تکنیک سے کام لیا اسے منظر عام پر لانے کی ہر کوشش کو روکا گیا ہے نئے سوویت قانون میں گمراہ بچوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گروہ بلا امتیاز جرائم بارہ سال تک کی عمر کے بچوں پر مشتمل ہے دوسرا گروہ بارہ سے سولہ سال تک عمر کے ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جو ادنی قسم کے قانون شکنیوں کے مرتکب ہوتے ہیں تیسرے حصے میں بارہ سے سولہ سال کی عمر کے وہ نوجوان شامل ہیں جو سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور سولہ سال سے زیادہ عمر کے جرائم کار نوجوانوں کو بالغوں کی طرح باقاعدہ عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

قانون کی رو سے پہلے دو گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو گرفتار کر کے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا جاسکتا خواہ انہوں نے اس جرم کا اقدام کیا بھی ہو جس میں وہ پکڑے گئے ہوں وہ ضابطہ فوجداری کے موجب بیگناہ اور معصوم ہیں ان کے جرائم کی ذمہ داری ان کے والدین، معلمین، بالغ لوگوں، سکولوں یا ہمسایوں یا خود سماج پر عاید کی جاتی ہے۔

لیکن یہاں ہمارے کان ایک ناقابل فہم شور سے پک گئے ہیں۔ ہم ججوں، پولیس والوں اور پادریوں کو یہ چلاتے سن سن کر تھک گئے ہیں کہ والدین گھر، سکول اور کلیسا اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کررہے ہیں اور وہی بچوں کی تقصیروں کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن سوویت یونین میں انہیں حقیقتاً ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ان کے خلاف مقدمے چلائے گئے اور مجرم ثابت ہونے پر خاطر خواہ سبق سکھایا گیا۔ بعض خطا کار بچوں کے خلاف سوویت یونین کے عام شہری نالش کرتے ہیں۔ لیکن اکثریت ایسے بچوں کی ہے۔ جنہیں ملیشیا (قومی رضا کار) یا پولیس عدالت میں پیش کرتی ہے۔ ملیشیا یا پولیس کے کارکنوں کو حکم ہے کہ وہ نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کو بازاروں، عام عمارتوں یا جگہوں پر بالخصوص سکول کے اوقات میں آوارہ گردی کرتے دیکھیں، یا جب کبھی ان کے متعلق کوئی شبہ پیدا ہو تو انہیں ٹوکیں، بچوں کی یہ سخت نگرانی محض انہیں گمراہ ہونے سے بچانے کے لیے کی جاتی ہے۔ اگر کوئی بچہ جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے پایا جائے وہ سکول اور گھر سے اپنی غیر حاضری کی کوئی وجہ بیان نہ کر سکے۔ یا معلوم ہو جائے کہ اس کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہورہی تو ملیشیا والے اسے حوالات لے جاتے ہیں۔

یہ حوالات ہمارے ہاں کے حوالات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گھروں پر مشتمل ہوتے ہیں، جن میں عموماً دو یا تین کمرے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں خصوصی تربیت یافتہ معلم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس کی امداد کے لیے چند رضا کار بھی ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ پولیس یا ملیشیا والا لڑکے یا لڑکی کے بارے میں مفصل رپورٹ درج کراتا ہے۔ اور اسے وہاں چھوڑ کر چلا جاتا ہے لیکن گرفتاری کا تکلف روا نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ قانون کے رو سے بچوں کو تھانوں میں لے جانا یا بالغ مجرمین

کے ساتھ رکھنا منع ہے''۔

مذکورہ بالا معلم بچ کے والدین یا وارث اور سکول کو فوراً اطلاع دیتا ہے۔ان کے آنے تک بچے کو کھیل، مطالعے اور آرام کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔اس اثنا میں معلم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔کہ اصل نقص کہاں ہے۔اور وارثوں کے آنے تک یقین کرتا ہے۔کہ بچہ اتفاقاً گمراہ ہو گیا ہے۔یا وہ کسی خاص مشکل میں گرفتار ہے، پہلی صورت میں والدین اور وارثین کو متنبہ کیا جاتا ہے۔اور خاص ہدایات دینے کے بعد بچے کو لے جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔اگر یہ معلوم ہو جائے کہ والدین بچے کی نگرانی اور دیکھ بھال کی طرف سے غافل ہیں یا بچہ کسی گھریلو مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔تو باقاعدہ تحقیقات کا بندوبست کیا جاتا ہے۔اور ہوسکتا ہے کہ والدین کے خلاف فرد جرم بھی مرتب کر لی جائے، ادنیٰ قسم کی بیشتر قانون شکنیوں کو اسی طرح دور کیا جاتا ہے۔اور کسی قسم کی عدالتی کارروائی نہیں کی جاتی۔

اگر قانون کی رو سے پہلے دو گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے خلاف نالش نہیں کی جاسکتی، تو کوئی میر یا کپڑے چراتی پکڑی جائے، یا کوئی متیکا سی وزیر کی کھڑی میں پتھر اٹھا پھینکے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے، ایسے بداخلاق بچوں کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن انہیں عدالت میں تنہا نہیں لے جایا سکتا۔ان کے ساتھ ان کے والدین وارثین یا کسی دوسرے بالغ شخص کو بھی عدالت کے کٹہروں میں کھڑا کیا جاتا ہے۔

بچوں کے خلاف ایسے مقدمے کی سماعت جس قسم کی عدالتیں کرتی ہیں، ان کی مثال سوویت یونین سے باہر کہیں نہیں ملتی، یہ وہ مشہور عدالتیں ہیں۔جنہیں علاقائی رفیقانہ عدالتیں'' کہتے ہیں اور یہ 1931 میں قائم ہوئیں، ان عدالتوں سے زیادہ ہمارے عدالتی نظام کی متاثر کن ضد کا تصور تک محال ہے، یہ عدالتیں سوویت یونین میں ہر کہیں قائم ہیں، یہ جج عام شہری ہوتے ہیں جنہیں متعلقہ علاقے کے باشندے صنعتی ادارے یا اجتماعی فارم کے تمام کارکن ایک سال کے لیے چنتے ہیں، ججوں کے یہ گروہ (یا پنچائتیں) ہمارے ہاں کی جیوریوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں،

انہیں عام تنازعوں، ادنیٰ مقدمات فوجداری، بدکاریوں، چھوٹی چوریوں اور بچوں کے خلاف (سنگین جرائم کے علاوہ) مقدموں کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔یہ رفیقانہ عدالتیں ملک کے تمام باشندوں کا اخلاقی معیار بلند کرنے، لوگوں میں سماجی ذمہ داریوں کے اشتراکی اصولوں کی روح پھونکنے اور پسماندہ افراد کے مجلسی اور تہذیبی ارتقا میں ممد ثابت ہوتی ہیں ان کے وظائف کی مکمل روداد جان، این جیزرڈ کی تصنیف'' سوویت قانون رہائش گاہ'' میں دیکھی جاسکتی ہے سوویت یونین (پنچائتی حکومتوں کے دیس) کے اس اچھوتے عدالتی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام جج متعلقہ ماحول اور لوگوں سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ان عدالتوں میں مقدمات کی سماعت عام طور سے بے تکلف مباحثے کی صورت اختیار کر لی جاتی ہے۔یہ عدالتیں عموماً حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں اور سب لوگ بحث میں حصہ لے سکتے ہیں۔عدالت کا اولین فرض کسی بچے کی بدچلنی کا موجب یا اس کی بے راہروی کے ذمہ دار شخص کو دریافت کرنا ہوتا ہے۔لیکن اہم کام ایسا فیصلہ صادر کرنا اور ایسی سزا تجویز کرنا ہوتا ہے کہ جرم کی تکرار کا امکان باقی نہ رہے۔

معمول یہ ہے کہ رفیقانہ عدالت بچوں کے لیے خاطر خواہ تفریحی سہولتیں بہم نہ پہچانے، دوستانہ امداد کے بغیر کسی خاندان کے غیر محفوظ صورت حال میں پھنس جانے، کسی نااہل معلم کو سکول میں باقی رکھنے یا اسی

قسم کی دوسری غفلت پاداش میں خود اپنے آپ کو، یعنی علاقے کے تمام باشندوں کو مجرم ٹھہراتی ہے۔ بہرحال عدالت کا فیصلہ التزاماً کوئی ایسی تجویز ہوتا ہے، جس سے بچے اور اس کے ماحول کی اصلاح ہو جائے۔

اس طریقے سے خطا اور ملزم بچوں کی بھاری اکثریت پر قابو پالیا جاتا ہے سولہ سال سے زائد عمر کے تمام نوجوانوں اور بارہ سے سولہ سال کی عمر کے ایسے بچوں کو جن کے خلاف بڑی چوریوں، خطرناک شرارتوں اور قاتلانہ حملوں کا الزام ہو، انہیں عدالت فوجداری میں پیش کر کے ان پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کی عدالتوں کا کام محض سخت سے سخت سزا تجویز کرنا ہے۔ اس لیے ہم بچوں کی جس قسم کی عدالتوں کا تصور کر سکتے ہیں سوویت یونین میں کوئی عدالت نہیں کیونکہ وہاں نابالغ مجرمین کے خلاف مقدمے کی سماعت یا تو رفیقانہ عدالتیں کرتی ہیں، یا ان کے جرائم کو سنگین تصور کیا جاتا ہے اور ان کے مقدمے فوجداری عدالتوں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ لائحہ عمل پندرہ سال کے تجربے کا نچوڑ ہے۔ لہٰذا ہمارے ملکوں کے لیے غیر معمولی دلچسپی کا موجب ہے سوویت یونین میں خطا کار بچوں کے خلاف قانونی کارروائی کا مسلمہ طریقہ یہ ہے کہ وہاں بچوں کو بلحاظ جرائم دو گروہوں میں منقسم کر دیا گیا ہے،

1- اگر ملزم بہت ہی کم سن ہو یا اس کے خلاف ادنیٰ شرارت کا الزام ہو، تو ملزم لڑکے یا لڑکی کو گرفتار نہیں کیا جاتا اور اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔

2- ملزم بچہ عمر میں بڑا ہو اور اس نے کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہو تو اس کے خلاف باقاعدہ عدالت میں سخت مگر منصفانہ کارروائی کی جاتی ہے۔

تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ قانون شکن بچوں کے دو گروہ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ کوئی ایک عدالت بیک وقت ان سے اچھی طرح نمٹ نہیں سکتی (ہمارے برعظیم کے بعض با عمل قومی رضا کار بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی تک رفیقانہ عدالتوں سی کوئی چیز وجود میں نہیں آئی) وجہ یہ ہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، بچوں کی عدالت ہے، اس کا صدر منصف مقدمے کی رہنمائی خواہ کتنی ہی بے رسمی سے کرے، عدالت کا زیادہ تر وقت بچے کی سکول سے غیر حاضری، آوارہ گردی اور ادنیٰ قسم کی قانون شکنیوں کی غیر ضروری تفصیلات ہی میں ضائع ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں کم سن بچوں کے لیے عدالت میں پیش ہونا ایک دلچسپ ڈرامائی تجربہ ہے اور بسا اوقات اس احساس کا نفسیاتی اثر تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ سولہ سال سے زیادہ عمر کے نوجوان اور بارہ برس سے زیادہ عمر کے وہ بچے جو سنگین جرائم کے اقدام کے قابل ہیں، ایک ایسی عدالت میں پیش ہوتے وقت جو کم سن بچوں کے ادنیٰ مقدموں کا فیصلہ بھی کرے۔ اپنے جرائم کو حد سے زیادہ معمولی خیال کرنے لگتے ہیں۔

روس میں جب کسی لڑکے یا لڑکی کو اعلیٰ فوجداری عدالت کے حوالے کرنا مقصود ہو تو محکمہ وکالت سرکار خصوصی تحقیقات کرتا ہے۔ اگر مقدمے کو اعلیٰ عدالت کے سپرد کرنا ہو، تو ایک مفصل فرد جرم تیار کی جاتی ہے۔ اس فرد جرم میں نہ صرف مبینہ الزام کے مکمل حالات بلکہ ملزم کی شخصیت کی بھی مکمل تشریح شامل ہوتی ہے۔ جسے عموماً ایک ماہر امراض نفس تیار کرتا ہے اور حتی الامکان جرم کا محرک بھی بتاتا ہے۔

بچوں کے خلاف مقدمات جرائم کی سماعت کے اشتراکی طریقے کو اچھی سمجھنے کے لیے دوسرے ملکوں اور سوویت یونین کے دستور قانون کے باہمی فرق کو جاننا ضروری ہے اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ

ہم سوویت یونین کے سرکاری وکیل کے فرائض منصبی کا مطالعہ کریں۔

سوویت یونین کے دستور ساسی کے نویں باب میں درج ہے۔

''یہ دیکھنا کہ تمام عوامی وزارتیں اور ان کے ماتحت اداروں کے علاوہ تمام سرکاری ملازم اور شہری قوانین کی سختی سے تعمیل کرتے ہیں، سوویت یونین کے اعلیٰ وکیل سرکار کا فریضہ ہے''۔

تمام سوویت یونین کے لیے ایک اعلیٰ سرکاری وکیل مقرر کیا جاتا ہے اور اس کے ماتحت ہر جمہوریت اور خودمختار علاقے اور خطے کا ایک ایک سرکاری وکیل ہوتا ہے....جنہیں اعلیٰ سرکاری وکیل پانچ سال کے لیے مقرر کرتا ہے۔ سوویت یونین کی سب سے اونچی پنچایت سات سال کے لیے مقرر کرتی ہے۔

سوویت یونین کا سرکاری وکیل امریکہ کے وکیل کناڈا کے سرکاری وکیل سے ملتا جلتا ہے۔ سوویت یونین میں نہ صرف وفاقی جمہوریتوں اور خودمختار علاقوں بلکہ ہر شہر اور ہر ضلع میں ایک مقامی سرکاری وکیل ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے عدلیہ کے برعکس سوویت یونین کا محکمہ وکالت سرکار ایک واحد ادارے کی طرح کام کرتا ہے اور وہاں پر چھوٹے بڑے سرکاری وکیل کے فرائض تقریباً ایک سے ہیں۔

غرضیکہ سوویت یونین کے ہر چھوٹے بڑے سرکاری وکیل کا فرض منصبی یہ ہے۔ کہ وہ قانون کی یکساں اور وفاقی تشریح کرے اور دیکھے کہ اس تشریح پر ہو بہو عمل ہو۔ اس کا یہ کام خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ملک کے باشندوں سے تعمیل کرانے تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام سرکاری اداروں اور خود عدلیہ سے بھی تعمیل قانون کراتا ہے۔ لغوی معنوں میں سوویت یونین کا سرکاری وکیل دراصل محافظ قانون ہے۔ ہر ایک سوویت سرکاری وکیل اپنے حلقے کے تمام سرکاری افسروں، حتیٰ کہ خود ججوں سے بھی بالاتر ہوتا ہے اور وہ محض عدلیہ کا مددگار نہیں ہوتا۔ یہ تفوق بہت اہم ہے۔ جب سے قانون کا عمل ہوا ہے اسی وقت سے اس کی اصلاح و ترمیم کے لیے مسلسل تحریک بھی جاری ہے اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ریاستوں، ان کی پولیس، ان کے مستغیثوں اور ان کے تمام امدادی اداروں کا رویہ ظالمانہ رہا ہے۔ جسے ایک عام شہری کے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ قانون عوام کا شکار کرتا ہے۔ قانون لوگوں کا دشمن ہے۔ حقیقی انصاف کے نام سے تمام قانونی اور عدلی اصلاح و ترمیم کی تحریک کا مقصد ہمیشہ سے اسی خامی کو دور کرنا ہے۔ سوویت یونین میں قانونی اور عدلی اصلاح نہ تسلی بخش بلکہ بے حد موثر بھی۔

سوویت وکیل سرکار کے دو اہم فریضے ہیں۔ پہلا یہی قانون کی تعمیل، قانون شکنی کا سدباب اور قانون توڑنے والوں کو سزا دینا۔ دوسرا فریضہ مفاد عامہ کا تحفظ ہے۔ دوسرے فریضے میں ان لوگوں کی صفائی کی ذمہ داری بھی شامل ہے جو قانون شکنی میں ماخوذ ہوں، اس کے علاوہ اس فریضے میں نفاذ قانون اور عدل کے اداروں کی سخت نگرانی بھی شامل ہے۔

لہٰذا سوویت یونین کے سرکاری وکیل کے اختیارات بے حد وسیع ہیں اور اسے اپنے اختیارات کو جس غیر جانبداری سے استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کسی دوسرے ملک کے سرکاری وکیل کے لیے ممکن نہیں۔ ہم بجا طور پر سوال کر سکتے ہیں کہ ایسی غیر جانبداری حقیقی ہے یا محض نظری؟

سوویت یونین کے ضابطہ فوجداری کو وضع ہی اس مقصد کے لیے کیا گیا ہے کہ سرکاری وکیل صحیح معنوں میں عوام کا محافظ ثابت ہو۔ مثلاً روس کی سوشلسٹ جمہوریتوں کے وفاقی آئین کے مطابق ابتدائی تفتیش کرنے والے افسر کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف ان حالات کی تحقیق اور تعین کرے جن کی بنا پر کسی شہری

کو جرم سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان حالات کا بھی جائزہ لے، جن کے سبب اس کے جرم کو سنگین یا معمولی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقدمے کی ابتدائی تفتیش کرنے والا شخص خود سرکاری وکیل ہوتا ہے یا اس کا کوئی ماتحت افسر، فرد جرم میں ان تمام شہادتوں کا درج ہونا ضروری ہے جو ملزم کے حق میں ہوں یا خلاف، سوویت یونین کے ضابطہ فوجداری کا اہم اصول یہ ہے کہ سرکاری وکیل اس وقت تک کوئی مقدمہ نہیں جیت سکتا، جب تک تمام شہادتوں سے ارتکاب جرم ثابت نہ ہو۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 306 کے مطابق اگر متغیث کو یقین ہو جائے کہ مقدمے کی سماعت کے دوران میں جن حقائق کا انکشاف ہوا ہے۔ ان سے فرد جرم کو تقویت نہیں پہنچی تو اسے مقدمہ واپس لینے کا اختیار ہے۔

مزید بریں سرکاری وکیل کا فرض ہے کہ مقدمے کے بعد عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کرے ہمارے ہاں سرکاری وکیل اس بنا پر اپیل کر سکتا ہے۔ کہ سزا جرم کے مقابلے میں کم ہے۔ سوویت یونین میں بھی یہی دستور ہے۔ لیکن وہاں سرکاری وکیل کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ سزا کو جرم کے مقابلے پر زیادہ سنگین پائے تو عدالت عالیہ سے اپیل کرے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ مقدمے کی سماعت میں ایسی قانونی اور عدلی خامیاں رہ گئی ہوں جو مجرم کے مفاد کے خلاف جاتی ہوں۔

دوسرے لفظوں میں سوویت وکیل سرکار مدعی بھی ہے اور مدعا علیہ بھی۔ وہ عدالتوں سے اونچا نہ ہوتے ہوئے بھی ایک حد تک تمام عدالتی کاروائی کی نگرانی کرتا ہے۔ قوانین مذکور کی دوسری دفعہ کے مطابق سرکاری وکیل کو نالش کرنے کا اختیار ہے اور اسے ریاست یا عوام کے مفادات کے تقاضے کے پیش نظر مقدمے میں مداخلت کا حق حاصل ہے۔ خواہ مقدمہ کسی بھی مرحلے میں ہو۔

یہ تمام نظام وکالت ایک مرکز کے ماتحت ہے۔ گویا یہ نظام ایک ایسا وفاقی مرکز ہے۔ جسے تمام جمہوریتوں، خود مختار علاقوں اور خطوں کے قانونی اور عدلی نظام پر کلی اختیارات حاصل ہے۔ اس نظام کا مقصد تعمیل قانون میں ہمہ گیری اور یکسانیت پیدا کرنا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس نظام کو لینن نے سوویت حکومت کے ابتدائی ایام ہی میں قائم کر دیا تھا۔ لینن نے اپنے ایک خط میں استالین کو لکھا''۔ سرکاری وکیل کا واحد حق اور فرض یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ مقامی اختلافات اور موثرات کے باوجود تمام ری پبلک (سوویت یونین) میں قانون کی صحیح معنوں میں گیر تشریح و تعمیل ہو''۔

ہمارا اپنا تجربہ شاہد ہے کہ ایسے اصولوں کی پیروی سے بے شمار خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن سوویت یونین کا نظام عدل ان اصولوں کی سختی سے حمایت کرتا ہے اور وہ بالکل نئے قانونی اصولوں پر مبنی ہے۔ سوویت عدالتوں کا بڑا کام سنگین ضابطہ قانون کی پیروی نہیں۔ بلکہ محنت کش طبقے میں نظم وضبط، بالخوص رضا کارانہ نظم وضبط پیدا کرنا ہے کیونکہ یہ عدالتیں اسی طبقے کے اختیارات حکمرانی کی نمائندہ ہیں۔ انہیں سوویت نظام کے ہمہ گیر مدرکات کے مطابق منظّم کیا گیا ہے اور یہ دوسرے ملکوں کی عدالتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ جمہوری ہیں۔

کوئی سوویت عدالت نسل، قومیت یا جائیداد کے تفوق کو تسلیم نہیں کرتی۔ ججوں کا آزادانہ انتخاب ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف عوام کے چنے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ عوام میں سے ہوتے ہیں۔ یہی کچھ ان کی قانونی تربیت ہے اور اکثر سوویت یونین کے جج ابتدا میں وکالت پیشہ نہ تھے بلکہ وہ شہروں یا دیہات کے محنت کش مرد یا عورتیں تھیں۔ عدالتی تقرر کے اس نئے طریقے کا فائدہ ہر خاص وعام پر واضح ہے۔ کیونکہ سوویت یونین کا نظام عدل بالکل اسی طرح جمہوری ہے جس طرح ہمارے ہاں کی مجلس بلدیہ یا میونسپل

کمیٹی۔ ہمارے ہاں کے کونسلروں اور سکول بورڈ کے ٹرسٹیوں کی طرح سوویت جج عوام کے لیے ہیں۔

جب سے جدید ریاست نے جنم لیا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک سوویت یونین کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں اس اصول پر عمل نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس اصول سے مراد قانون کی میکانکی اصلاح و ترمیم نہیں۔ بلکہ اس کا تقاضا ہے کہ تمام قانونی اور عدلی ڈھانچہ لوگوں کے مفاد کے عین مطابق ہو، ورنہ عوامی جج یا تو قانونی تضاد کے سبب کام ہی نہیں کر سکیں گے یا ان قوانین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں جو عوام کے کسی ادنیٰ گروہ کے خلاف ہوں جو بنیادی حقوق کو تسلیم ہی نہ کریں یا جو کسی طرح بھی خصوصی تو جیحات کو روا رکھیں وہ بہت جلد قانون کی تعمیل کرانے والی مشینری کو توڑ دیتے ہیں۔ یہ نکتہ ان نام نہاد مصلحین پر انقلاب فرانس کے وقت ہی سے روشن ہو گیا تھا۔ جو اس کلاسکی عیاری سے کام لینا چاہتے تھے کہ قانون امیر اور غریب دونوں کی روٹی کی چوری سے روکتا ہے۔ لیکن عوامی ججوں کے لیے مشکل ہے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف مقدمے لیں جو اس لیے روٹی چرائیں کہ وہ بھوکے تھے۔

سوویت یونین میں نہ صرف عوامی جج اور عدالتیں بھی نہایت کامیابی سے کام کر رہی ہیں بلکہ گزشتہ 25 برس کے عرصے میں اکثر و بیشتر قوانین کی تعمیل انہی نے کرائی ہے اعلیٰ عدالتیں تو چند ایسے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مخصوص ہیں جو ریاست کے تحفظ سے متعلق ہوں۔ ان کا خاص کام عوامی عدالتوں کی اپیلوں کو سننا ہے''۔ سوویت دستور و رایت'' میں جسے سوویت اکادمی کے علوم کے شعبہ قانون نے شائع کیا ہے، ججوں کی آزادی کی یوں تشریح کی گئی ہے۔

''سوویت جج خود مختار ہیں، کیونکہ سوویت عدالت صرف ایسے قانون کی پابند ہے جو لوگوں کو پسند خاطر ہو اور وہ خاص مقدمات کا فیصلہ کرنے میں ہر قسم کے اثر و رسوخ سے آزاد ہو۔ تمام جج سزا دینے یا فیصلہ کرنے میں صرف قانون کے تقاضوں یا اپنی داخلی رایوں کے پابند ہیں۔ جن پر وہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد پہنچیں۔ ان معنوں میں سوویت عدالت، عوامی عدالت (یعنی پنچایت) حقیقتاً آزاد عدالت ہے''۔

سوویت آئین کی دفعہ نمبر 110 کے مطابق ''تمام عدالتی کاروائی وفاقی جمہوریت، خود مختار جمہوریت یا خود مختار علاقے کے لوگوں کی مادری زبان میں کی جاتی ہے جو لوگ متعلقہ زبان نہ جانتے ہوں، انہیں ایک ترجمان کے ذریعے مقدمے کے تمام مواد سے پوری طرح آگاہ ہونے اور عدالت میں اپنی مادری زبان استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔

چند مستثنیات کے علاوہ تمام مقدمے کھلی عدالت میں سنے جاتے ہیں، مستثنیات میں ایسے مقدمے ہیں جن میں عدالت کے لیے شخص کی ذاتی زندگی کے رازوں کا تفصیلی جائزہ لینا ناگزیر ہو یا جن سے فوجی یا ڈپلومیسی کے اسرار وابستہ ہوں۔

آخری بات یہ ہے کہ ججوں کو چننے والے لوگ چاہیں انہیں واپس بلا سکتے ہیں۔

سوویت یونین میں بالغ مجرمین کے مقدمات کی سماعت کے طریقے کی دو امتیازی خصوصیات ایسی ہیں، جن سے ہماری عدالتیں آشنا تک نہیں، پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مقدمے کی سماعت تین جج کرتے ہیں۔ ان میں صرف ایک جج قانون دان ہوتا ہے اور دوسرے دونوں عام شہری ہوتے ہیں۔ جنہیں کمسن مجرمین کے معاملات کا پورا تجربہ ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ باقاعدہ عدالت میں پیش ہونے والے

ہر بچے کے لیے ایک وکیل صفائی کا مفت بندوبست کرے۔اس حفاظتی اقدام کا مقصد تمام بچوں کا زیادہ سے زیادہ قانونی تحفظ ہے۔ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ہاں کے تمام تجربہ کار وکیل اور قانون دان حضرات اس طریقے کی پرزور حمایت کریں گے، کیونکہ اس سے بچوں کی عدالتوں کے خلاف اس بڑے اعتراض کا ازالہ ہو جائے گا کہ عدالت کی رائے اور غیر جانبداری پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے سے خطرناک ناانصافی کا امکان ہے۔

سوویت عدالتوں میں مقدمے کی سماعت کا طریقہ بالکل سیدھا سادا ہے۔ ہماری عدالتوں کے معمول کے برعکس وہاں قانونی اصطلاحات اور پرانی مثالوں کے حوالوں سے حتی الوسع گریز کیا جاتا ہے اور تینوں جج مل کر روزمرہ کی زبان میں حکم تیار کرتے ہیں۔ ہر شخص کو اپیل کا حق حاصل ہے اور اپیل پر کچھ خرچ نہیں آتا کیونکہ وکلائے صفائی کی فیس سمیت تمام اخراجات حکومت خود برداشت کرتی ہے۔

تاہم سوویت یونین میں بچوں کے مقدمات کی سماعت کے طریقے کی مکمل وضاحت کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ وہاں ملزم کو مجرم یا معصوم ثابت کرنے پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ ان حالات ومحرکات کا تعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن کے تحت کسی جرم کا اقدام ہوا ہو۔لہٰذا ہمارے معمول کے برعکس وہاں بچوں کو مقدمات جرائم میں بہت زیادہ شہادتیں لی جاتی ہیں۔مزید بریں عدالت کا فرض ہے کہ جرم کا خاص سبب دریافت کرے اس طرح جو فیصلے صادر کئے جاتے ہیں وہ ہمارے لیے واقعی حیران کن ہیں۔ مثال کے طور پر سوویت جج اکثر گواہوں یا جرائم کار بچے کے ایسے پڑوسیوں پر برس پڑتے ہیں جو شہادت دیں کہ بچے کے والدین بہت بداخلاق یا شراب کے عادی ہیں یا بچہ کافی مدت سے آوارہ گردی کے لیے مشہور ہے، کیوں کہ ان کی غفلت یہ ہے کہ انہوں نے بچے کے خطرناک مجرم بن جانے پہلے رفیقانہ عدالت کو اطلاع نہ دی مقصد یہ ہے کہ جرم کی تکرار نہ ہو۔ بچہ بھی اس جرم کا دوبارہ مرتکب نہ ہو اور یہ حرکت اجتماعی پیمانے پر بھی دہرائی نہ جائے، اس طریقے پر کسی مقام یا علاقے کے بچوں میں جرائم کے جڑ پکڑنے سے پہلے ہی انہیں ختم کر دیا جاتا ہے، عدالت فوجداری میں شاذ و نادر ہی کسی بچے کا مقدمہ پیش ہوتا ہے اور جب کبھی ایسا اتفاق ہو تو عام اجتماعات اور مجالس میں اس پر بحث چھڑ جاتی ہے۔اخبارات میں اس پر تنقید وتبصرہ شروع ہو جاتا ہے۔اس طرح متعلقہ علاقے کی برادری کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کے ساتھ عدالتی مشینری کی پڑتال بھی ہو جاتی ہے۔

آج کل سوویت یونین میں جرائم بچگان کا مسئلہ فضول نظریہ بازی سے نکل چکا ہے اور اسے سائنسی طریقے سے حل کیا جا رہا ہے۔اقدام اتنے عام فہم اور عملی ہیں کہ جس شخص کو اس مسئلے سے تھوڑا بھی مس ہے وہ ان طریقوں کی قدر ومنزلت سے فوراً آگاہ ہو سکتا ہے۔

ہم اپنے برعظیم امریکہ میں گمراہ بچوں کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ امریکہ ایک مدت سے جدید قیدخانوں، اصلاحی جیل خانوں اور بچوں کے حوالات والی قوم کی حیثیت سے مشہور ہے، یہ بلند نظریہ زیادہ تر چند مقامی نمائش گاہوں کو مشتہر کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔1944 میں بالٹی مور کی ضلع کچہری کے ایک جج رچرڈ ڈبلیو کس نے ''پروبیشن'' نامی جریدے میں مندرجہ ذیل حقائق تحریری کئے۔

1- میں نے ایک نہایت غلیظ قیدخانہ دیکھا جس میں اسی قیدی ایک ساتھ بند تھے۔ان میں 20 بچے تھے، جن کے لیے مردوں سے الگ کوئی انتظام نہ تھا۔

2- ایک شہر کے قیدخانے میں یتیم بچے بھی بند تھے، کیونکہ وہاں لاوارث بچوں کی پرورش کا کوئی بندوبست نہیں۔بچوں کی عدالت کا تو خیر ذکر ہی کیا۔

3- عورتوں کا ایک قیدخانہ اتنا غلیظ تھا کہ میرے کپڑے بدبو میں بس گئے۔نوجوان لڑکیوں کے لیے الگ کمرے نہ تھے۔خاص طور سے دوایسی طالبات کے لیے کوئی الگ انتظام نہ کیا گیا جو دو لڑکوں کے ساتھ چوری کی کار میں آوارہ گردی کرتی ہوئی پکڑی گئی تھیں۔اس جیل کی تمام لڑکیاں پست اخلاق

افراد میں گھری ہوئی تھیں۔ وہ طوائفوں کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں اور انہیں کے ساتھ سوتی تھیں۔

4- قیدی بچیوں کا خاص کھانا پھلیاں اور دن میں دو بار کالی چائے تھی۔ انہیں پینے کو دھ نہ ملتا تھا۔ ان کے لیے نہانے دھونے کے لیے گرم پانی کا بندوبست نہ تھا یہ لڑکیاں سیمنٹ کے فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں پر اٹھتی بیٹھتی اور سوتی تھیں۔ ان کے محافظوں میں کوئی عورت شامل نہ تھی۔

5- بچوں کی میعاد قید ایک سے تین مہینے تک تھی، انہیں کسی قسم کی عدالتی کارروائی کے بغیر جیل بھیج دیا گیا تھا، کیونکہ اس شہر میں بچوں کی عدالتیں نہ تھیں اور تعلقہ دار کو فی قیدی کے حساب سے روزانہ معاوضہ ملتا تھا۔

قصبوں اور بڑے شہروں کے قید خانوں کی یہی حالت تھی۔

امریکہ کی سب سے بڑی انسانی دولت اس کے تین کروڑ بچے ہیں۔ لیکن ان کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے؟ ان کے زبوں حالی کے متعلق جو کچھ عوام کو بتایا جاتا ہے وہ اس سے کہیں بری صورت حال میں گرفتار ہیں۔ 1944 میں ہٹن کی ایک خاتون جج اینا ایم کراس نے کہا کہ سرکاری عہدیدار بچوں کے جرائم کاری کے اعداد و شمار کو دانستہ کم تر دکھاتے ہیں۔ امریکہ میں نیویارک سٹیٹ کی عورتوں کے کلبوں کے وفاق کا تجزیہ، کینیڈا میں وہاں کی بار ایسوسی ایشن کے لیے مرتب شدہ میکروئر رپورٹ اور انگلستان میں دوران جنگ کی متعدد تحقیقات میں متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ بچوں میں جرائم اور بداخلاقی اس قدر عام ہے کہ صرف پولیس ہی کو اس کا صحیح علم ہے۔

لیکن متحرمہ کراس کا کہنا ہے کہ ''ہر ریاست کے دفاتر کی الماریاں گرد آلود تحقیقات سے اٹی پڑی ہیں''۔

میامی کی عدالت بچگان کے جج والٹر بکہام کا قول ہے کہ انہوں نے گزشتہ سال کی نسبت 50 فیصد زیادہ مقدمات جرائم کی سماعت کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان مقدمات کے دوران میں بعض ایسی مفلوک الحال پردیسی دوشیزاؤں کو دیکھا جو عصمت بیچ کر اپنا پیٹ پالنے پر مجبور تھیں اور عدالت انہیں گھر واپس جانے کے لیے ٹکٹ خرید دینے کی مجاز نہ تھی۔

امریکہ کے ایک فوجی افسر کرنل ہومر گیریزن فرماتے ہیں کہ:۔

''ہمارے ملک میں گزشتہ دو سال سے بچوں کے جرائم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے''۔ انطاریو کے چیف جسٹس ذرا بلاغت سے فرماتے ہیں کہ:۔

''میری پریشانیوں کا موجب صرف بچوں کی بڑھتی ہوئی جرائم کاریاں ہی نہیں بلکہ ان کے مقابلے میں ہمارا عجز بھی ہے''۔

عجز یا پریشانی جسٹس صاحب؟

اب ہم امریکہ کے صاحب اختیار حضرات کی رایوں اور نظریوں کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک ہائی سکول کے پرنسپل رالف سی سمتھ کو لیجئے جنہیں روٹری کلب نے اظہار خیال کے لیے مدعو کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''میں نے نوجوانوں میں پندرہ سال گزارے ہیں۔ اس اثنا میں مجھے ایک لڑکی یا لڑکا ایسا نہیں ملا۔ جسے ''پیدائشی بدکردار کہا جا سکے''۔ لیکن میں نے بہت سے بچوں کو مصیبت میں مبتلا پایا۔ ان کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے ان کے گھروں، سکولوں کلیساؤں، برادریوں یا ان کو ان کی مصیبتوں کا ذمہ دار پایا ہے''۔

قومی رضا کار اور پولیس اس حقیقت سے ایک مدت سے آشنا ہے۔ شراب خوری کے مسئلے کے طرح یہاں بھی ہمیں ایک سطحی قسم کا ترقی پسند نظریہ ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''بچوں کی گمرائی کا ذمہ دار سماج ہے''۔ تاہم جو لوگ مسٹر سمتھ کے زاویہ نگاہ کے حامی ہیں۔ وہ ایک خاص محدود حلقہ اثر سے باہر عملاً

کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔ سمتھ صاحب کے بیان میں ایک طویل سوال نامہ شامل ہے، جس کی رو سے روٹیرین حضرات اپنی برادریوں کی بے بسی اور ناکامی کے مفروضے قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ردعمل منفی اثرات کا حامل ہوگا۔ کیونکہ یہ سوال نامہ خود سماج کی ایک سطحی اور بہانہ جو قسم کی مذمت ہے۔

آخر ہم اپنے گھروں، سکولوں، کلیساؤں اور برادریوں کا کیا کریں؟ بعض لوگ فوراً بچوں کی عدالتوں کی اصلاح کی تجویز پیش کریں گے اور ڈاکٹر لوگ بچوں کے معیار صحت کی طرف اشارہ کریں گے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ نفسیاتی رہنمائی کے ذریعے بچوں کی امداد کی جائے۔ مسٹر سمتھ پولیس عدالتی نظام، بے روزگاری اور بہت سے دوسرے عوامل کا ذکر کرنا بھول گئے۔ جنہیں وقتاً فوقتاً بچوں کی جرائم کاری کا مرکز ٹھہرایا گیا ہے۔

انہی سامعین یعنی روٹری کلب کے اراکین کو ایک مرتبہ امریکہ کے تحقیقات جرائم کے وفاقی ادارے (ایف، بی، آئی) کے افسر اعلیٰ جے ایڈگر ہوور کے خیالات سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ان کے الفاظ سن کر حاضرین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''امریکہ میں جرائم کی موجودہ صورت حال خاموش آتش فشاں کی تہ میں کھولتے ہوئے گندھک کے لاوے سے ملتی ہے''۔

1938 میں امریکہ میں انگلستان کے مقابلے میں گیارہ گنا زیادہ لوگوں نے جرائم کا ارتکاب کیا 1943 میں 13 لاکھ سنگین جرائم کا ارتکاب ہوا، جن میں ہر تریپن منٹ کے بعد ایک قتل کی واردات بھی شامل ہے۔ ایف، بی، آئی کے رجسٹروں میں چھ کروڑ امریکی جرائم پیشہ لوگوں کے نام درج تھے جنگ کے بعد سے کمسن لڑکیوں میں جرائم کی شرح 130 فیصد (تقریباً ڈیوڑھی زیادہ) ہوگئی۔

مسٹر ہوور بچوں کے جرائم کے ذمہ دارا داروں یعنی گھروں، کلیساؤں، سکولوں وغیرہ کی فہرست پر سے جلدی جلدی گزر گئے اور اس فہرست میں بزنس (تجارت) کا اضافہ کیا۔ انہوں نے مبہم سا اشارہ کیا جو لوگ جرائم کی طرف مائل ہیں۔ ان پر تاجر پیشہ لوگوں کی خاص عنایت ہے۔ انہوں نے جو اعداد وشمار دیئے ہیں۔ وہ آخری اعشاریہ تک درست ہیں۔ لیکن ان کے تعمیری منصوبے مسٹر سمتھ کی تجویزوں کی طرح مبہم ہیں۔

بوسٹن کی عدالت بچگان کے جج جے ایف پرکنس نے جریدہ ''کرسچن سائنس مانیٹر'' کے 16 جنوری 1945 کے شمارے میں ایک اور ہی نقطہ نظر پیش کیا، انہوں نے قوم کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے فرمایا۔

''بچے ازل سے جرم کرتے آئے ہیں اور ابد تک کرتے ہی رہیں گے''۔

پولیس کی ناقابل تردید تحریری شہادتوں کے سامنے اس قسم کی دلیلیں اتنی مصلحت آمیز اور لچر ہیں کہ فاضل جج کے باقی ماندہ تبصرے کو ردی کی ٹوکری میں اٹھا پھینکنا مناسب ہے تاہم اس میں عقل سلیم کی تھوڑی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ فاضل جج نے امریکہ کی جنگی مساعی کی تعریف کی اور غیر منطقی طریقے سے نتیجہ نکالا کہ ''جو تحریک اس قدر کار ہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔ وہ فی الواقعہ ایک عجیب اور اعلیٰ شے ہے۔ اس کے بعد فاضل جج ہٹلر کی شاندار فوجی فتوحات کے بارے میں رائے زنی کر کے آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں وہ ان فتوحات کی پیدا کردہ تباہی، بدحالی اور نتیجتاً جرائم کی کثرت کا ذکر نہیں اور سیدھے اپنے مقالے کے مرکزی خیال تک جا پہنچے ہیں کہ ''ہم سماج کو بناتے ہیں یا سماج ہمیں''؟

اگرچہ اس سوال کے دونوں حصے درست ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں لازم وملزم ہیں۔ لیکن فاضل جج کا خیال ہے کہ سماج کو ہم ہی بناتے ہیں۔ جدید عمرانی نظریے کو توڑ مروڑ کر وہ ایک نئی ترکیب ''فلسفہ معافی'' ایجاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم بدراہ بچوں کو حد سے زیادہ نرمی کے ساتھ معاف کرتے آئے

ہیں اور انہیں بتاتے آئے ہیں کہ وہ بذات خود جرائم کے ذمہ دار نہیں بلکہ کلیسا، گھر اور سکول برابر کے ملزم ہیں۔ یہ ہے ان کا نیا دعویٰ، ظاہر ہے کہ وہ اپنی اصل نیت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ان کا زاویہ نگاہ ہمیں براہ راست قرون وسطیٰ کے انفرادی ذمہ داری کے اصول کی طرف لے جاتا ہے اور یہ ایک نظریہ ہے جسے ہر ایماندار سائنسدان غلط ٹھہرا چکا ہے۔

اگر چہ فاضل جج پرکنس اپنے نقطہ نظر کو موثر بنانے میں قاصر رہے ہیں۔ تاہم ان کی بات تو توجہ طلب ہے، گمراہ بچے کو صرف یہ بتا دینے سے کہ اس کی بدحالی کا ذمہ دار سماج ہے۔ کچھ حاصل نہیں ہوتا، الٹا بدراہ بچے کے دماغ میں تباہ کن، احساس کہتری پیدا ہو جاتا ہے۔ فاضل جج کا مقولہ درست سہی، لیکن حیرانی کی بات ہے کہ وہ ایک کھلی حقیقت سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ جس سے ہزاروں رضا کار نجوبی آگاہ ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ جرائم کی ذمہ داری سماج پر تو ہے، لیکن سماج کو بدلنے کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا ہے۔

جنگ کے دوران میں صحت اور تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے پسپر کی ذیلی کمیٹی مقرر ہوئی تھی، اس کمیٹی نے 1944 میں امریکی پارلیمان کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں نہایت سنجیدگی سے بچوں کے جرائم کا تجزیہ کیا گیا۔ اپنے تجزیے کے دوران میں اس کمیٹی نے ان لوگوں کی شہادتیں قلمبند کیں جو بچوں کی تربیت، تحفظ، تعلیم، تفریح، مذہب، قانون، محنت صنعت اور دوسرے اداروں کے ذمہ دار ارکان تھے۔ اس کمیٹی کی معلومات کا خلاصہ یہ ہے

1- سنسنی خیز خبروں سے قطع نظر صورت واقعی بہت نازک ہے۔

2- بچوں کے جرائم میں جنگ سے کچھ عرصہ پہلے ہی اضافہ شروع ہو گیا تھا اور جنگ کے دوران میں چند علاقوں کے سوا کہیں بھی کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

3- شماریات قابل اعتماد نہیں۔ کیونکہ اعداد وشمار جمع کرنے طریقے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

4- جرائم کے مختلف محرکات میں سے کسی ایک کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

5- جو مائیں جنگی اسامیوں پر متمکن ہیں وہ جرائم میں اضافے کا باعث نہیں بنیں۔ محنت کش ماؤں کی مذمت کرنے والے بیانات غیر ذمہ دارانہ ہیں۔

پیپر کی ذیلی کمیٹی کو شیلڈون اور ایلینر گلیوک کی اہم تصنیف ''ایک ہزار جرائم کار بچے'' میں جرائم کے قابل اعتماد حقائق دستیاب ہوئے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

1- بچے عام طور سے نو سال سات ماہ کی اوسط عمر میں جرم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

2- جرائم کار بچوں کی تقریباً نصف تعداد صحیح الذہن ہوتی ہے۔ تیرہ فیصد کند ذہن اور سترہ فیصد تقریباً ناکارہ ہوتے ہیں۔

3- 85 فیصد بچوں کا چلن سکولوں ہی میں قابل مواخذہ تھا۔

4- اتنے ہی بچے یعنی 85 فیصد بچے شہر کے گنجان آباد اور غلیظ علاقوں میں رہتے ہیں

5- اتنے ہی یعنی 85 فیصد بچوں کے خاندانوں کے بزرگ اراکین جرائم پیشہ تھے۔

6- 76 فیصد جرائم کار بچوں کا تعلق افلاس زدہ گھرانوں سے ہے۔

یہ سائنسی حقائق تشریح طلب نہیں۔ بچوں کی جرائم کاری واحد سبب سماجی خرابیاں ہیں یہ

خرابیاں پراسرار، فلسفیانہ یا انفرادی نہیں بلکہ عام فہم اجتماعی خرابیاں ہیں۔ مثلاً قلیل آمدنی، گنجان وغلیظ ماحول کے اثرات، غیر سائنسی طریقہ تعلیم، بچے کی جسمانی اور دماغی بہبود سے مجرمانہ غفلت وغیرہ۔

پیپر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا۔ ''تمام گواہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچوں کی جوائم کاری کی روک تھام بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم حفظ ماتقدم کے اصولوں پر کاربند ہوں۔ جو چیز بچے کے لیے مفید ہے وہی عام طور سے انسداد جرائم کے لیے بھی مفید ہے۔ کوئی بچہ محبت اور شفقت سے محروم نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے لیے ایک ایسا گھر ہونا چاہیے جہاں اس کی عمدہ دیکھ بھال اور خوراک ولباس کا مناسب بندوبست ہو اور جہاں اس میں ایسے خیالات وعادات اور اخلاق کی نشوونما ہو جو ایک اچھے شہری بننے کے لیے ضروری ہیں۔ محلوں میں طبی امداد ونگہداشت کا خاطر خواہ انتظام ہونا چاہیئے، جس کا خرچ کسی خاندان کے مقدور سے باہر نہیں ہونا چاہیئے۔ محلے کے پاس ہی ایسے سکول ہونے چاہئیں، جن میں نئی دنیا کے تقاضوں کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت ہو سکے۔ مذہبی اور برادری کے اداروں اور نوجوانوں کی تنظیموں تک ہر بچے کی رسائی ہونی چاہیئے جہاں وہ دوسرے بچوں کے ساتھ عبادت یا کھیل کود اور تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے، اگر کوئی بچہ یا اس کا گھرانا ایسی مشکلات میں پھنس جائے جسے وہ اکیلا دور کرنے سے معذور ہو تو اس کی مدد کے لیے تجربہ کار ماہرین موجود ہوں۔ اسے ہم مختصراً امریکی بچوں کے بنیادی حقوق کا چارٹر کہہ سکتے ہیں''۔

آج تک ہماری نظر سے بچے کی سماجی حیثیت کے متعلق اس سے بہتر بیاں نہیں گزرا۔ جرائم اطفال کے مسئلے کے متعلق اکثر جائزوں میں جو لفظی گورکھ دھندا پایا جاتا ہے۔ مذکورہ رپورٹ اس سے مبرا ہے، کیونکہ یہ رپورٹ ہمیں سیدھے سادے چند الفاظ میں اس اہم بنیادی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ ''بچے بھی انسان ہیں وہ اس ماحول کی پیداوار ہیں جس میں وہ رہتے ہیں اور وہ ماحول خود سماج ہے''۔

چونکہ کمیٹی کے ارکان سے جن لوگوں سے ملاقات سے ملاقات کی تھی ان میں سے ہر ایک نے پرزور درخواست کی تھی کہ بچوں کے جرائم کے مسئلے میں ان کی رہنمائی اور امداد کی جائے اس لیے اس کمیٹی نے تجویز پیش کی کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور بچوں کی ضروریات.... کے لیے قومی پیمانے پر نشر واشاعت اور تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔ تمام نجی، ریاستی، وفاقی اور مقامی اداروں میں اشتراک عمل پیدا کرنے کے لیے ایک مرکز قائم کیا جائے۔

دوسری جمہوریتوں میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ بچوں کے جرائم کے متعلق جو بین الاقوامی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ ان میں کینیڈا کو بہت سراہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں جرائم اطفال کے متعلق ایک قومی قانون، نافذ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف 45 فیصد کینیڈوی بچے اس قانون سے متاثر ہوتے ہیں۔ مستعمرہ کینیڈا میں نظر بندی کی سہولتوں میں حیرتناک ناہمواری پائی جاتی ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں ایک جرم کی سزائیں تبسم آمیز سرزنش سے لے کر کسی اصلاح گاہ میں تین سال کی نظر بندی تک کا فرق ہوسکتا ہے۔ تمام جمہوریت پسند اقوام زنانہ پولیس، مشیروں اور حوالات کے عدم موجودگی کے ساتھ عقل سلیم کا بھی فقدان ہے۔ بچوں کی جرائم کاری کی تحقیق وتفتیش کرالی جاتی ہے اور بس، رضا کاروں کی تربیت اور ماہرین سے صلاح ومشورہ کا کام ایک پشت سے جاری ہے۔ اس کے باوجود بچوں کے جرائم میں کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔

ہمارے خطا کار بچوں کی اکثریت عدالت میں پیش ہوتے وقت صدر منصف کی رحم دلی یا

مزاج پسندی کے علاوہ ہر قسم کی قانونی امداد اور تحفظ سے محروم ہے۔ مقدمے کی سماعت اور سزایابی کے بعد بچوں کے ساتھ جو کچھ گذرتی ہے وہ صرف قیاس کا معاملہ ہے۔

عوام کو تو سرے سے علم ہی نہیں کہ سزا بھگتنے والے بچوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اصل مجرموں یعنی بچوں کو جرائم پر اکسانے والے لوگوں کو شاید ہی کبھی سزا ہوئی ہو۔ بچوں کو جو سزا دی جاتی ہے یا اس کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی تسلی بخش جواز پیش نہیں کیا جاتا۔ جو بچے جنسی بے رہروی میں ماخوذ ہیں ان میں سے کسی کو جنسی حقائق کی تعلیم نہیں دی جاتی۔

اس کتاب میں جتنے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں ان کے حل کے لیے جنسی بیماری اور جنسی تعلقات کی صحیح تعلیم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کیمبوڈ یا یونیورسٹی کے سابق پروفیسر حیاتیات ڈاکٹر موریس اے بائجلو نے اس موضوع پر ایک بصیرت افروز مقالہ لکھا ہے جو رسالہ ''سوشل ہائجین'' کے فروری 1944 کے ایشوع میں شائع ہوا اور امریکی محکمہ عامہ نے پوری طرح اس کی نشر و اشاعت کی۔ اس مقالے میں بڑی حد تک نظریوں کے گورکھ دھندوں میں پڑنے کی بجائے براہ راست حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اسے محکمہ صحت عامہ اور انجمن حفظان صحت کی مشترکہ امداد سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی اشاعت سے پہلے بڑی بڑی کانفرنسوں اور سرکاری عمال نے اس مسئلے پر بہت غور و خوض تھا۔ خود ڈاکٹر بائجلو نے صحیح حقائق جمع کرنے کے لیے بارہ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا، اس مقالے میں ڈاکٹر بائجلو فرماتے ہیں۔ ''مجھے اس مسئلے کی تحقیقات کے دوران میں اپنی ذاتی ملاقاتوں یا خط و کتابت میں ایک بھی ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر، ماہر تعلیم یا وزیر ایسا نہیں ملا جس نے اس خیال کی حمایت نہ کی ہو کہ سکول اور گھر میں جنسی مسائل کی صحیح تعلیم بچوں کی شخصیت اور سماج کی تعمیر کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتی ہے۔ ایسی تعلیم حاصل کرنے والے بچے آئندہ زندگی میں اپنے کردار کو قابو رکھنا سیکھ جاتے ہیں''۔ البتہ اس مسئلے پر اختلاف تھا کہ ''عمومی جنسی تعلیم، جنسی بیماریوں کی روک تھام کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے''۔ لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ ''جہاں تک بچے کے انفرادی تحفظ کا تعلق ہے۔ اس میں یہ احساس پیدا کر دینا کہ جنسی بیماریوں چھوت کی بیماریاں ہیں۔ بہت بڑا تعلیمی حربہ ہے''۔

انہوں نے ڈاکٹر پیرن کی رپورٹ کا حوالہ دیا اور کہا ''ہمارے لیے از حد ضروری ہے کہ ہم ان تمام ذرائع سے جو کلیسا، سکول، سرکاری اداروں یا رضا کارانہ تنظیموں کی استطاعت میں ہیں۔ اپنے نوجوانوں کو شریفانہ زندگی کی زیادہ سے زیادہ تعلیم دیں، میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ جنسی اخلاق کا استحکام و تنزل جنسی بیماری کے متعلق اچھے یا برے نظریے پر منحصر ہے۔ آتشک کی روک تھام کے لیے خوف کافی نہیں، ہمیں اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو بہترین جنسی تعلیم دینی چاہیے۔ ہمیں ایسے سماجی اور معاشی حالات بھی پیدا کرنے چاہئیں، جن کے تحت ہمارا نوجوان طبقہ صحت مند نہ اور معتدل زندگی بسر کر سکے''۔

مزید بریں ''پڑھنے والوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امریکہ کے بہت سے مقامی ادارے اور با اختیار لوگ تعلیم صحت کے بعض امور خاص سے جنسی یا مذہبی امور کی تعلیم کے سخت مخالف ہیں۔ اگر کسی مقام پر جنسی بیماری کی تعلیم کے خلاف تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ البتہ سخت نقصان کا احتمال ضرور ہے''۔

چند سال پیشتر ایک استاد مسئلہ ارتقاء پر بحث چھیڑ بیٹھے تھے۔ ان کے خلاف بالش کر دی گئی، جس سے نہایت ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر بائجلو فرماتے ہیں

''عین ممکن ہے کہ چند والدین اور استاد جنسی بیماری کی تعلیم کی مخالفت کریں۔ اس لیے فی الحال ہر ریاست میں ٹینی زی کی طرح جنسی مسائل کی ابتدائی تعلیم پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا''۔

اس بات پر بار بار زور دیا جاتا ہے کہ جنسی بیماری کی تعلیم کو نام نہاد ''جنسی تعلیم'' اور عام تعلیم صحت سے الگ رکھنے کی ضرورت ہے۔ حیرانی کی بات ہے، جب ایسا پروگرام ٹینی زی میں استعمال ہوسکتا ہے تو اسے قومی پیمانے پر کیوں نہیں شروع کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر بائیجلو نے اپنی رپورٹ میں فرمایا کہ ''سماجی حفظان صحت کے اکثر رہنماؤں میں عرصے سے یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جنسی بیماری کے انسدادی منصوبوں میں جنسی تعلیم کے تمام امور کو برابر کی اہمیت دینا چاہیئے، لیکن گزشتہ دس سال میں یہ خیال بدل گیا ہے اور جنسی تعلیم کی ضرورت کے حق میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی بنیاد جسمانی، دماغی اور سماجی صحت کے ان اصولوں پر ہے، جن سے جنسی بیماری کا کوئی تعلق نہیں۔

''اگر اس خیال کو قبول عام حاصل ہوگیا کہ جنسی تعلیم کا صحیح پروگرام نہ جنسی بیماری سے شروع ہوتا ہے نہ اس کے گرد گھومتا ہے تو یہ جنسی بیماری کو تعلیم کو انسانی رشتوں کی تعلیم کا حصہ قرار دے کر ان کی تعلیم دینے میں بہت کارثابت ہوگا''۔

دوسرے لفظوں میں یہ امر ضروری ہے کہ جنسی بیماری کی تعلیم عام امور صحت کے ساتھ دی جائے اگر آتشک اور سوزاک کو تپ دق اور گلے کے امراض کے ساتھ زیر بحث لایا جائے تو اس کی وہ لوگ بھی مخالفت نہیں کریں گے جو بچوں اور بالغوں کو جنسی تعلیم دینے کے حامی نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ حفظان صحت کے باعمل ماہرین بھی اس نقطہ نظر کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ تعلیمی مقاصد کے پیش نظر جنسی بیماری کو عام جنسی مسائل سے الگ رہنے پر اصرار کرنا عصبیت پسند لوگوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہرگز نہیں۔ دراصل جنسی بیماری کو اخلاق عصمت فروشی، جرائم اطفال وغیرہ سے الگ نہ رکھنا ہی بہتر ہے۔

یہ معاملہ سبھی طبقوں کے لیے ایک سی اہمیت رکھتا ہے۔ جنسی بیماریوں کا ذکر مذکورہ طریقے سے کیا جائے اور محض جنسی موضوعات کا ذکر نہ کیا جائے تو ان بیماریوں کی تعلیمی مہم پر کوئی طبقہ یا گروہ برا نہیں مانے گا۔

بہتر حال جنسی اعتبار سے بدراہ بچوں کو جنسی حقائق کی تعلیم دینے کی فوری ضرورت ہے۔ آج کل بچوں کی عدالتیں ماہرین نفسیات، افسران فلاح و بہبود اور استاد بدکار بچوں کی اصلاح کے لیے کسی منظّم طریق پر کاربند نہیں ہیں۔ خاص طور پر سے لڑکیوں میں دیگر جرائم کی نسبت جنسی غلط کاری کی بدعت عام ہے۔ نیویارک سٹیٹ کی عورتوں کے کلبوں کے وفاق کی طرف سے امریکہ بھر کہ بچوں کی جرائم کاری کی رفتار کا جائزہ شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آج کل زمانہ قبل از جنگ کے مقابلے میں تین سو فیصد (یعنی سہ گنا) زیادہ کمسن نوجوانوں کی گرفتاریاں عمل میں آرہی ہیں۔ حالانکہ پولیس کے پاس بڑے اور سنگین جرائم کی اس قدر بھرمار ہے کہ وہ ان جرائم کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہے۔

دعوت فکر

لوگ ''گناہ'' کیوں کرتے ہیں؟

یعنی لوگ ایسا چلن کیوں اختیار کرتے ہیں۔ جو خود ان کے لیے، ان کے قریبی رشتہ داروں تمام

سماج کے لیے افسوناک اور روحانی ایذا کا موجب ہوتا ہے؟

یا اور بھی واضح لفظوں میں عورت اور مرد زنا کیوں کرتے ہیں؟ ہم جنسی اختلاط کے اکا دکا یا اتفاقی واقعے کی بات نہیں کر رہے، بلکہ ہماری مراد ان ناجائز جنسی تعلقات سے ہے جو اس قدر عام ہی کہ ان کی زندہ مثال وہی ''ایک مہینے میں پانچ کروڑ حفاظتی آلات'' کا استعمال ہے۔

لہٰذا ان معنوں میں لوگ ''گناہ'' کیوں کرتے ہیں؟

اس سوال کو جواب ہمارے ذہن میں اس بے ہنگم قوالی کی طرح ابھرتا ہے جس میں ایک گویے کا سر دوسرے سے ملتا نہ ہو۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ناجائز جنسی اختلاط کی وجہ یہ ہے کہ عورت اور مرد اپنے ضمیر کی آواز نہیں سنتے تو کیا ہم اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ جب تک ضمیر کی مدہم آواز کو زوردار بنانے کے لیے سائنس کوئی آلہ نشر الصوت ایجاد نہیں کر لیتی؟

لیکن مصیبت یہ ہے کہ دوسرا گروہ فوراً صدائے احتجاج بلند کرتا ہے کہ یہ تو قادر مطلق کی توہین ہوئی۔ کیونکہ وہی بتا سکتا ہے کہ ثواب کیا ہے اور گناہ کیا، لیکن افسوس کہ جاگیردارانہ نظام میں روحانی پیشوا عام لوگوں کو یقین دلایا کرتے تھے کہ لاتعداد عورتوں کا طوائفیں بن جانا علامت خیر اور شریف عورتوں کا محبت کرنا دلیل شر ہے (یاد رہے کہ امریکہ اس وقت سرمایہ کاری کے آخری دور یعنی امپیریل ازم یا سامراجیت میں ہے۔ مترجم) تو کیا خدا کے اخلاقی قانون بھی اس وقت بدل جاتے ہیں جب کہ انسان اپنے سماجی نظام کو بدل دیتا ہے؟

اس سوال پر بعض فلسفی جھٹ پٹ بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو کفر ہے اور متنبہ کرنے لگتے ہیں کہ ہم ایسے لوگوں کی غلط تعلیمات کو خدا سے منسوب نہ کریں۔ جو اپنے آپ کو اس کے اوتار کہتے تھے، غرضیکہ اس قسم کی دلیلوں سے بے شمار صفحے کالے کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں عالم لوگ نہایت سنجیدگی سے بحث کیا کرتے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے کھڑے ہو سکتے ہیں اور آج کل ہمارے فلسفی اور بعض سائنس دان بھی یہ سوال پوچھنے کے بڑے شوقین ہیں کہ ''لوگ گناہ کیوں کرتے ہیں؟'' ہو سکتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے مناظرے بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے ہوں شاید ان مناظروں کی بدولت بعض لوگوں نے ہوا بازی کے کچھ بنیادی مسائل پر غور وخوض کرنا شروع کر دیا ہو۔ کہ سوئی پر کسی فرشتے کو اپنا اڑن کھٹولا اتارنے اڑانے میں کیا مشکلیں پیش آتی ہیں یا فضا میں آرتے اترتے وقت چکر کاٹنا کیوں مفید ہے''۔ یا اسی قسم کے دوسرے ''بنیادی'' مسئلوں پر غور وخوض شروع ہو گیا ہو۔

لیکن ہمارے سامنے تو آج کل جنسی اختلاط یا زنا اور جنسی بیماری اور آتشک جیسے خشک معاملے ہیں۔

آج ہر پادری، ڈاکٹر، وکیل، بالخصوص ہر عیال دار شخص کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے واقعات کے رجحان سے واقفیت پیدا کرے۔

موجودہ زمانے میں ہمارے ملکوں کے بے شمار لوگوں کی دماغی بیماریوں کا موجب شراب ہے۔ لیکن اس کے تدراک کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ شراب نوشی ایک خطرناک وبا کی طرح اس قدر عام ہے کہ ہماری حکومتیں اس کی بدولت بے شمار منافع کماتی ہیں۔

امریکہ پر ابھی جنگ کا کوئی خاص دباؤ نہیں پڑا تھا۔ کہ یہاں پر پانچ بچوں کے بعد دو بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی اسقاط حمل کے عمل جراحی کی نذر ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر شہادت دیں گے کہ آج کل

ہمارے ہاں نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ اس سنگین جرم، اس قتل عام کی کثرت کا تصور بھی محال ہے۔ آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہیں اور ادھر کوئی صاحب حمل گرانے کے عمل جراحی میں مصروف ہیں۔ وحشی نازی بھی یورپی بچوں کو اتنی تعداد میں ذبح کرنے کا کامیاب نہ ہو سکے، جتنے کہ آج کل ہمارے ملکوں میں ہر سال چند طریقے سے ضائع کئے جا رہے ہیں۔

مزید بریں محکمہ شماریات حیات یعنی امریکہ کے محکمہ مردم شماری کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر ہالبرٹ ایل دوَن نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ امریکہ میں پیدا ہونے والے بارہ بچوں میں ایک بچہ ولدالحرام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سکول کے پہلے درجے میں ایک لاکھ ستر ہزار ایسے بچے داخل ہوتے ہیں جو اپنے باپوں کے نام نہیں بتا سکتے، ان میں سے قانوناً کسی کا کوئی باپ نہیں اور ان کا کوئی گھر نہیں۔ ان بچوں کو عمر بھر ندامت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان بے گناہ معصوم بچوں کی فوج میں روز افزوں اضافہ کا المیہ اتنا دردناک ہے کہ ڈاکٹر دوئن ان بدنصیب بچوں کی پیدائش کے اندراجات کو سماج کی نگاہوں سے قانوناً خفیہ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں کوئی توقع نہیں کہ امریکی قوم بے باپ کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں کمی کر سکتی ہے۔

ہمارے ہاں اس قدر طلاقیں ہو رہی ہیں کہ لاکھوں عورتیں اور مرد کسی دوسرے عورت کے سابقہ خاوند یا کسی دوسرے مرد کی سابقہ بیوی سے شادی کئے ہوئے ہیں۔ بے شمار بچے زندہ ماؤں کی محبت سے محروم ہیں یا زندہ باپوں کی یہ بٹی ہوئی محبت ان کے لیے عذات سے کم نہیں۔ حالانکہ کلیسا پہلے دن کی طرح آج بھی طلاق کا اسی سختی سے مخالف ہے۔ لیکن طلاق کے واقعات کو کم کرنے سے قاصر رہا ہے۔ دوسری طرف قانون پیشہ حضرات شادی کا احترام برقرار رکھنے کی غرض سے دن رات نرم اور آزاد قانونی طلاق کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔

ادھر طبی تحقیقات جنسی اختلاط کو تمام جسمانی خطرات سے مبرا بنانے کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یعنی اس قسم کی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں۔ جن کے استعمال سے حمل ٹھہرنے یا بیماری لگنے کا خوف جاتا رہے گا۔ اور ان گنت ملاقاتیں کرنا ممکن ہو جائے گا۔

جنسی بیماری، شراب نوشی، اولاد حرام، اسقاط حمل، طلاق، جرائم، بچوں اور نوجوانوں کی خطا کاریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ایک ہیبت ناک اخلاقی بحران، ایک بدمعاشی کا بھوت ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہو رہا ہے۔

ہمارا زاویہ نگاہ سوویت یونین کے نقطہ نظر سے اس قدر متضاد ہے کہ بے حد مایوسی ہوتی ہے۔ یہ پہلی تاریخی مثال ہے کہ سوویت روس میں عام اور بے شمار کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ گناہ کسی مافوق الفطرت ہستی یعنی شیطان یا اہرمن کی تحریک نہیں، بلکہ یہ ایک سماجی برائی ہے۔ جس کا ازالہ محض ٹھوس، عقلی اور سائنسی طریقوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ سوویت یونین کے باشندوں نے بدکاری اور بدمعاشی بدترین صورتوں پر سائنسی اصولوں کی مدد سے بے نظیر فتح حاصل کی ہے۔ روئے زمین پر صرف اہل روس ہی ایک ایسی قوم ہیں میں عصمت فروشی کا نام ونشان تک نہیں۔ انہوں نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جسے ہمارے ہاں کے فلسفی، پادری اور ڈاکٹر ابھی تک ناممکن الحصول خیال کرتے ہیں۔

دنیا کے کسی اور ملک میں قید خانے اور اصلاح گاہیں بن نہیں ہو رہیں۔ صرف سوویت یونین ہی ایک ایسی سرزمین ہے۔ جہاں قید خانے کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں حمل ضائع کرنے کے عمل

جراحی سے واقع ہونے والی اموات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ جہاں طلاق کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔ جہاں خاندان اور ازدواجی زندگی اس قدر قابل احترام ہے کہ بہترین ماؤں کی اعلیٰ سے اعلیٰ اعزاز دیئے جاتے ہیں اور جہاں دماغی اور جسمانی صحت کا معیار اس قدر بلند ہے کہ شراب طبی نادرات میں شامل ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس کی فروخت پر کوئی پابندی نہیں۔

اس فرق کو نمایاں کرنے سے ہمارا مقصد سوویت یونین کا پروپیگنڈا ہرگز نہیں یہ تو ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ ہمیں کم از کم اپنے آپ سے ایمانداری کے ساتھ سوال ضرور کرنا چاہیئے کہ یہ تفوق ہمیں اور ہمارے ملکوں کو کیا سبق سکھا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کے خیال میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اپنے ہاں کی بدکاری سے گھبرانا اور مایوس نہیں ہونا چاہیئے، اگر اہل روس کرامات کے بغیر ہی صرف عملی سائنس ہی کی مدد سے اور تمام نیک نیت لوگوں کو شرافت اور صحت کا معیار بلند کرنے کی ترغیر دے کر بدترین اخلاقی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو ہم کیوں نہیں ہو سکتے؟ کیا ہم اس قدر گر چکے ہیں کہ معاشرتی بوسیدگی کو خوش آمدید کہیں۔

بعض دوسرے لوگ سنجیدگی یا دبی زبان سے کہتے ہیں کہ اب ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ سوویت یونین سے تہذیب اخلاق کا سبق سیکھیں۔ یہ زاویہ نگاہ زمانہ مابعد جنگ کے اتحاد اشتراک سے تعلق رکھتا ہے اور ایسے سیاسی لیڈروں نے اس پر غور تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جنہوں نے گذشتہ بیس برس کے عرصے میں بے شمار تقریریں ''بداخلاق سرخوں'' کی لعنت ملامت کے لیے وقف کی ہیں۔ اس تجویز کا رد عمل عام طور سے خفگی یا مسکراہٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ آخر ''مادہ پرست روس'' سے نیکی کا سبق سیکھنے کا خیال ہمارے لیے کس قدر قابل قبول ہو سکتا ہے؟

لیکن اس معاملے کو زیادہ دیر کے لیے محض خفگی سے ٹالا نہیں جا سکتا اور اکثر حلقوں میں استفہامیہ ابھر آیا ہے۔ انگریزی جریدہ ''کیتھولک ریکارڈ'' کے ایڈیٹر اور مشہور کیتھولک مفکر کونٹ میکائیل ڈی لابدومیر کے الفاظ قابل غور ہیں:۔

وہ سوال کرتے ہیں ''کہ موجودہ زمانے کے بے پایاں بحران کے مقابل آج عیسائیت کس قدر کی ہے؟'' اور بڑی بے چینی سے جواب دیتے ہیں ''کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح نئے سپنے دیکھنے چاہئیں اور نئی امیدیں جگانا چاہئیں''۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ ''عیسائیت مطلوبہ جذبہ پیدا نہ کر سکی تو اشتراکیت (کمیونزم) کا طوفان عوام کو بہا کر لے جائے گا۔ ماسکو کا مقناطیسی مینار روم یا کنٹربری کی برجیوں سے بہت زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہا ہے''۔

ایک حیران کن اعتراف! لیکن بدقسمتی سے کونٹ میکائیل یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ لوگ ہمارے اشتراکی اتحاد کی طرف اس قدر راز جونگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ شاید وہ ہمیں قائل کریں کہ اشتراکی روس میں کشش کے موجب صرف سیاسی اور معاشی محرکات ہیں۔ یعنی لوگ اس لیے روس سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہاں سے بے روزگاری دور ہو چکی ہے یا وہاں کی حکومت کی باگ ڈور محنت کش لوگوں یعنی مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ہے۔ بالکل بجا کہ مزدور اور درمیانہ طبقے کے بے شمار لوگ جنہوں نے معاشی بحران کے دوران میں سخت مصیبتیں اٹھائیں۔ سوویت یونین سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں غیر محدود معاشی ترقی کے منصوبے تیار ہو رہے ہیں اور وہاں کوئی طفیلی یا مسرف

نہیں۔

آیئے ہم بھی ایک اشتراکی ادیب میکسم گورکی کے قول سے مستفیض ہوں کیونکہ اس میں مسرفوں سے متعلق اشتراکی نقطہ نظر کی پوری صفائی اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔''مسرف کا لفظ کوئی گالی نہیں، یہ اس شخص کی اصلی تعریف ہے جس کی زندگی ہمہ اسراف ہے۔ ہمارے سوشلسٹ سماج میں مسرف ایک ایسا جانور ہے جس میں پرانے نظام کی متعدی امراض، حسد اور لالچ اس طرح گھر کر چکے ہیں کہ علاج ممکن نہیں، اسراف پسند شخص کے اصل الاصول، اس کے ایمان اور اس کے روحانی زندگی کو دو سادہ لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ'' مجھے تو اپنا پیٹ بھرنا ہے'' اس کے لیے یہ دنیا ایک ایسا مقام جہاں صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جیتے ہیں اور وہ پیٹ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ لذیذ خوراک سے بھرنا چاہیئے۔ اس کی تمام ترقوت ارادی، اس کا دماغ اور اس کا ہر وصف، جسے وہ روحانی جذبہ کہتا ہے۔ صرف اسی حیوانی مقصد کی طرف مائل ہے''

یہ ہے ایک عظیم ادیب کی نشتر آمیز تنقید، فاشی ایجنٹوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے گورکی نے ایک اور واضح اور اہم بات کہی اور وہ یہ ہے:۔

''سرمایہ دار دنیا ہماری سوشلسٹ دنیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمارا نظریہ اور معاشی عمل انسان کے ہاتھوں انسان کی لوٹ کھسوٹ کی سختی سے مذمت کرتا ہے۔ اور لوگوں کی قدرت کی نعمتوں کے تصویبی، جائز استعمال کی تربیت دیتا ہے۔ لیکن سرمایہ داری زندہ ہی انسانی لوٹ کھسوت پر ہے۔ اور یہ آدمی کو عموماً نفع اندوزی کی ہوس کی تسکین اور قوت زر کا جواز کا ادنیٰ آلہ سمجھتی ہے''۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا معاشرتی نظام، یعنی سرمایہ دارانہ جمہوریت سونے کی طاقت پر قائم ہے۔ جس چیز کو ہم آزاد کاروبار یا تجارت کہتے ہیں۔ ہمارا نظام منافع صرف اس آدمی کی قدر کرتا ہے۔ جو اپنے ہم جنس، ہم پیشہ آدمی کے مقابلے میں دوسروں کو نقصان پہنچا کر ذاتی نفع حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں آگے نکل جائے۔ ہمارے نظام نے ماضی میں ان لوگوں کو بے حد فائدہ پہنچایا ہے جو قدرتاً ارادتاً نہایت سنگ دلی سے تجارتی مقابلے کے لیے مسلح رہے اور ایسے مردوں اور عورتوں کو جنہوں نے سب سے زیادہ محنت کی اور ہمارے معاشرے کی مادی اور تہذیبی اقدار پیدا کیں۔ ان کی بھاری اکثریت کو عموماً بہت ہی کم معاوضہ ملا، دوسری طرف مٹھی بھر لوگ جنگ اور ہولناک بحران میں بھی انتہائی عیاشی میں مصروف رہے۔

کونٹ میکائیل کو یہ جاننے کے لیے ہمارے عوام سوویت یونین سے کیوں ہمدردی رکھتے ہیں، صرف اس تضاد کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اپنے آباؤ اجداد کی طرح ہمیں بھی بچپن سے یہی سکھایا گیا ہے کہ زندگی میں کامیابی کا معیار دولت کا ذخیرہ اور زندگی کو سونے کے دیوتا کی پرستش کے لیے وقف کر دینا ہے۔ ہمارے سماج میں مہربانی، خدمت خلق، جہاد نفس، ایمانداری ہم جنسوں سے محبت اور اسی قسم کے دوسرے نیک جذبے نایاب ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوبیاں تمام تر انہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں جن سے متعلق ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر طرح سے نادار ہیں۔

ہم ہر اتوار کو یسوع مسیح کا پیغام پڑھتے ہیں کہ''ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا ممکن ہے لیکن امیر آدمی کا خدا کی بادشاہت میں گزرنا ممکن ہیں''۔

شاید نصیحت پرانے فیشن میں شامل ہوگئی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہفتہ بھر دولت کی قابل رشک پوجا ہوتی ہے اور خدا کی بادشاہت اتوار کے دن بھی کسی امیر آدمی کے بارے میں متفکر نظر آتی ہے۔ ہمارے تمام صنعتی رہنما، اکثر سیاست دان اور بہت سے پادری خود یسوع مسیح کے فرمان کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور دولت سمیٹنے کی دوڑ دھوپ میں بے محابہ مصروف رہتے ہیں اور جو لوگ اس ہوسناک جدوجہد کے اخلاقی جواز پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کی سخت مذمت کی جاتی ہے۔

ہم نے سرمایہ داری نظام پر تمام قسم کی معاشی ناکامیوں، معاشی دباؤ، بحران، فاقے، غلاظت آفرینی، بدپروری، بیماری، فاشیت اور جنگ کا الزام بار بار لگتے سنا ہے اور کچھ نہیں کیا۔ لیکن سوویت یونین کے لوگوں نے ایک پشت پہلے سرمایہ داری کو ختم کر دیا۔ کیونکہ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ سرمایہ داری نہ صرف مادی مسائل پیدا کرتی ہے، بلکہ وہ بداخلاقی اور بدمعاشی کو بھی سماج میں برداشت کرتی ہے۔ وہ بدکاری کا بیج بوتی ہے اور گناہ کے پودے کی پرورش کرتی ہے۔ اس حقیقت کا اطلاق دوسرے ملکوں پر ہو یا نہ ہو۔ لیکن سوویت یونین کے لوگوں نے بے نظیر کامیابی سے ثابت کر دیا کہ ہم نے اپنے سماج کو اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے خود اپنے کردار اور سیرت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر لی، اور نئے سماجی نظام نے زندگی کے ایک نئے اخلاقی نظام کو جنم دیا۔

آج کل، زمانہ مابعد جنگ میں ہمارے ملکوں میں نئے شہر اور کارخانے تعمیر کرنے کے لیے فنی منصوبوں کو بڑی دھوم دھام سے تیاری ہو رہی ہے۔ ان تمام منصوبوں میں اور ان کے متعلق تمام قیمتی اشتہاروں میں لفظ اخلاق ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ اپنے طرز زندگی کے تحفظ واستحکام اور اس کی لامحدود ترقی کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن اخلاقیات کے متعلق یکسر خاموشی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم عصمت فروشی کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ اسے پلاسٹک کے محلوں میں بٹھا کر اس کی سج دھج میں چار چاند لگانا چاہتے ہیں۔ کیا ہم آسمانی شاہراؤں اور فضائی مستقروں کے ساتھ مافوق الفطرت مجرمین بھی پیدا کریں گے؟ کیا ہماری طبی تحقیقات کے عجوبے دواگھروں کے ان بنڈلوں کی سطح پر آجائیں گے؟ جنہیں ضبط تولید اور انسداد مرض کے لیے فروخت کیا جاتا ہے؟

تسلیم کہ ہم، شمالی امریکہ والوں نے سرمایہ دارانہ نظام سے فائدہ اٹھا کر تاریخ میں ایک انتہائی مال دار تہذیب کو تعمیر کیا ہے۔ ہم بڑے فخر سے دعوے کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس دنیا بھر میں سب سے زیادہ کاریں، بلند ترین عمارتیں، برق رفتار ٹرینیں، براق روشنیاں، نفیس ترین ساز و سامان ہے۔ قصہ کوتاہ ہمارے ہاں کی ہر شے عظیم ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ بداخلاق بچے، سب سے زیادہ حرام کے بچے، دنیا بھر میں سب سے زیادہ طلاقیں، اور آتشک کے ہسپتال ہیں۔

لیکن یسوع مسیح فرماتے ہیں کہ ''انسان تمام دنیا کو حاصل کرے، مگر وہ اپنی روح کو ضائع کر دے۔ تو اسے کونسا نفع ہوا؟''

زیر بحث مسئلہ ایک مذہبی مسئلہ تو نہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ گزشتہ دنوں چند لوگوں نے بے اندازہ دولت جمع کر لی، اور دوسرے لاکھوں انسان افلاس بیماری، بدکاری، بدمعاشی اور جرائم کے سبب تباہ ہوتے رہے۔ ہم تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ اس ''عوامی دنیا'' میں، جس کے لیے ہمارے نوجوانوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، معاملات کو نئے ڈھب سے ترتیب دیں۔ اور یہ خیال عام ہے کہ جس طرح ''آزاد کاروبار'' کا جنگ کے دوران میں جنگی مساعی کے لیے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح آئندہ پرامن تعمیر کے

لیے سامان پہنچانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ ہمارے ہاں اکثریت اس امر کی قائل ہے کہ قدرے پابندی اور ترمیم کے ساتھ سرمایہ داری اب بھی کسی اور نظام حیات سے افضل ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہمارے نظام منافع کا استحکام یا زوال آئندہ چند سالوں میں اس امر پر ہے کہ نظام تمام لوگوں کو کافی کام، خوراک ورہائش، لباس اور صحت کے ذرائع مہیا کرنے میں کامیاب رہتا ہے یا ناکام۔

معاشیات کا یہ کھلا چیلنج ہے اور تمام سنجیدہ لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے ہم نے اپنی جمہوریت کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی اہم ضرورت کو تو محسوس کیا ہے کہ اس میں ہر خواہش مند شخص، بالخصوص ہر عورت، لڑکی اور نوجوان لڑکے کی مستقل اور مکمل ملازمت کا انتظام ہو سکے۔ لیکن ہم نے اس اہم ضرورت کو اس نقطۂ نظر سے کبھی نہیں دیکھا کہ یہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی امید ہے۔

تمام مذہبی اور سیاسی معاملات سے قطع نظر، سوویت یونین نے تجربے سے ثابت کر دیا ہے کہ ''جدید معاشرے میں لوگوں کی نجات یعنی منظّم بدمعاشی، بدکاری، ناجائز جنسی اختلاط، اسقاط حمل، کمسنی کے جرائم، کنبے کی تباہی اور شراب کی بدعادت سے لوگوں کی خلاصی، اسی وقت ممکن ہے۔ جب بیروزگاری اور افلاس کو دور کرنے کے ساتھ ہی بدکاری سے حصول منفعت کی لعنت کو بھی ختم کر دیا جائے''۔

لیکن ہمارے اکثر رہنماؤں کا طریق فکر سائنسی اور استدلالی نہیں ہے کٹر عصبیت پرست لیڈر تو یہ ثابت کرنے کے لیے بے شمار مثالیں گھڑ لائیں گے کہ روس میں بدی کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ ہمارے ہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اگر یہ دلیل درست ہے تو اسے ہمارے لیے اور ہمارے معاشرے کے لیے نیک شگون نہیں ہونا چاہئیے۔ کیوں کہ مقتدر حضرات کی خود فریبی اور جھوٹی تسلیوں کے باوجود لوگ خود یہ سوال اٹھانے والے ہیں کہ ''گناہ کے متعلق ہمارا کیا منصوبہ ہے؟''

آپ صاحب اولاد ہیں۔ تو آپ اپنے من سے یہ سوال پہلے ہی بوجھ چکے ہوں گے، اپنی پانچ سال کی معصوم بچی کو سوتے دیکھ کر آپ نے کبھی نہ کبھی یہ سوچا ہوگا کہ زندگی اسے چودہ سال کی عمر میں کیا سکھانے والی ہے تو آپ کلیجہ تھام کر رہ گئے ہوں گے۔ آپ کا نوکر لڑکا جو ابھی ابھی گھر واپس لوٹا ہے وہ اب اخلاق کے متعلق کیا سوچتا ہے کیا یہ ٹھیک نہیں کہ اب وہ اخلاق کو محض مذاق سمجھنے لگا ہے؟

یہی حال دوسرے بے شمار بچوں کا ہے۔ اور اسی طرح ایک گھرانے کی پریشانیاں لاکھوں خاندانوں کی پریشانیاں ہیں۔ اب آپ اندازہ لگائیے تو معلوم ہوگا کہ گناہ کا تعلق ذات سے نہیں، بلکہ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے اور شاید ان مسئلوں میں سے سب سے بڑا مسئلہ ہے جن سے ہماری قوم دوچار ہونے والی ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے اہل روس کو بھی ہو بہو اسی قسم کے اخلاقی بحران کا سامنا تھا۔ لیکن روس کے نوجوان بداخلاقی کے خلاف ایک ایسا پرچم لے کر بازاروں میں نکل آئے جسے آج تک کسی نے تیار کرنے اور اٹھانے کی جرأت نہیں کی انہوں نے اس پرچم کے ذریعے اعلان کیا کہ ''ہم سائنسی اصولوں کے مطابق نسل انسانی کی اصلاح کریں گے''

اشتراکی سائنس دانوں نے دعویٰ کیا کہ:۔

1- سماج میں بدکاری اور شراب نوشی عام ہو تو گناہ ذاتی معاملہ نہیں رہتا بلکہ اس کی ذمہ داری عین اس طرح قوم پر عاید ہوتی ہے جس طرح تپ دق محرقہ ہذیانی یا گلے وغیرہ کی وبائی بیماریوں کی۔

2- تاریخ ثابت کرتی ہے کہ لوگوں کو قوانین یا مذہب کے ذریعے نیک بننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

3- لوگ گناہ کیوں کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان حالات اور ماحول میں ملتا ہے۔ جس میں عوام رہتے ہیں۔ یعنی سماج کے لیے لوگوں کے مضرت رساں رویے کے بڑے اسباب، افلاس اور بے روزگاری ہیں۔

4- جنسی بداخلاقی صرف ایسے اقدامات کے ذریعے دور کی جا سکتی ہے جن سے دائمی محبت کی قوت کو آزاد کر دیا جائے۔ اور ایسی محبت صرف حقیقی شادی اور ازدواجی زندگی میں نصیب ہو سکتی ہیں۔

5- اخلاق مسلسل بدلتے آئے ہیں۔ انسان فطرتاً شر پسند نہیں۔ بدی کو اس وقت ختم کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ لیڈروں سمیت تمام قوم ذاتی مفاد کے لیے دوسرے لوگوں کو پاؤں تلے کچلنے کی بجائے کسی ارفع اور صالح مقصد میں ایمان رکھتے ہوئے زندگی کو سب کے لیے برابر کی خوشگوار بنانے کی جدوجہد کریں۔

اس سائنسی اصول کی بنا پر، جو یسوع مسیح کی تعلیمات سے حیران کن مشابہت رکھتا ہے۔ سوویت اخلاقیات کا محل تعمیر کیا گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ زمانے میں اشتراکی اخلاقیات کا شہرہ بڑی شدومد سے سننے میں آئے گا۔ اور ہم خود اس کا ذکر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جو گمراہ اور بدنصیب لوگ سوویت یونین کے لوگوں سے نفرت اور حسد کرتے ہیں۔ ان کے لیے ہر ایسے شخص پر ''سرخے'' کا لیبل چپکانا مشکل ہونے والا ہے۔ جو اشتراکیت کی گناہ پر فتح سے متاثر ہوگا۔ آخر جنسی بداخلاقی ایک غیر سیاسی مسئلہ اور کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ یہ خیال کرے کہ روس والوں نے محض چڑانے یا محض سرمایہ داری کو پریشان کرنے کے لیے لاتعداد عوام کی تہذیب اخلاق کی ہے۔ اب کسی قسم کا پروپیگنڈا ابھی جھوٹے اخلاق کی تعلیم یا سچے اخلاق کی تکذیب میں زیادہ عرصے کے لیے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کسی نظام اخلاق کا عروج وزوال اس بات پر ہے کہ اس سے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ ہمارا نظام اخلاق یا بے اخلاقی، لوگوں کو تاریک اور عمیق غار کے لب پر لے آیا ہے۔ ہو متزلزل ہے۔ لیکن سہارا دینے والی چیز ابھی تک ناپید ہے۔ سوویت یونین کے نئے نظام اخلاق نے لوگوں کی فطرتوں کو بدل دیا ہے۔

ہم ان حقائق سے گریز نہیں کر سکتے اور کریں بھی کیوں؟ جب کہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ اگر تاریخ میں بھی کبھی ایسے لوگوں اور قوموں کا پتہ ملتا ہے جنہوں نے بے اطمینانی کے عالم سے بیزار ہو کر شیطان کے ساتھ سودا بازی کرنے سے انکار کر دیا ہو۔ تو یقیناً وہ لوگ ہم ہیں۔ اور وہ قومیں ہماری جمہورتیں ہیں۔

گذشتہ پانچ برس سے ہم نے فاشیوں کے ساتھ صلح جوئی کا مجرمانہ اصول ترک کر دیا ہے اور اپنی جنگی طاقت کو اتنے وسیع پیمانے پر پھیلایا ہے کہ نام نہاد نکتہ چیں تو اسے ہماری تباہی کا موجب ٹھہرانے لگے تھے۔ لیکن وہ طاقت یا جنگ ہمیں تباہ نہ کر سکی۔ بلکہ اس نے ہمیں بتا دیا کہ ہماری طاقت کا راز کیا ہے۔ اور ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم سنیکٹروں سال کی جدوجہد سے حاصل کی ہوئی آزادی کے تحفظ کے لیے اپنے آباؤ اجداد کی طرح عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔

ہم نے یہ کارنامہ اس وقت انجام دیا جب کہ نازی ہمیں حق زندگی سے بھی محروم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ آج ہماری جمہوریت کو اس کے اندرونی فاسد مادے سے خطرہ ہے۔ گمراہ لوگ بداخلاقی کے اصل حقائق کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ''چھتری والے مکتبہ سیاست یعنی امبریلا سکول''

(مختلف الخیال سیاست دانوں کا آپس میں کوئی سمجھوتہ کر کے کمیونسٹوں کے خلاف متحدہ ہو جانے کا نظریہ۔ امریکی یونینسٹ) کے سیاست دانوں کی طرح بدی کے ساتھ سمجھوتہ بازی کی پالیسی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمیں ہٹلر کے میونک والے مکارانہ اعلان کی طرح یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ بداخلاقی کو ''اور زیادہ علاقے کی طلب نہیں''۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ فریب ہے۔ خاندان، ازدواجی زندگی، بچوں کی ایک صلاح نظریہ حیات کے مطابق پرورش، یہ ہیں ہمارے چند ایک مقدس مقبوضات جنہیں شیطانی طاقتیں نرغے میں لینا چاہتی ہیں اور انہیں برباد کرنا چاہتی ہیں۔

سچائی کو چھپانے، فضول وعظ وتلقین یا گناہ گاری پر ماتم کرنے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ ہمارے معاشرے کو جس کے گناہ کا خطرہ ہے۔ وہ درحقیقت تپ محرقہ، ہذیانی سے زیادہ پائیدار نہیں۔ یہ بدخورا کی کے مسئلے سے زیادہ بعید الفہم نہیں۔ اور اب یہ بیرزوگاری اور صحت عامہ کے مسئلے کی طرح انفرادی ذمہ داری نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیالات عجیب وغیرب معلوم ہوتے ہیں۔ میرے لیے ان کی اطلاع اور اس کتاب کے خاتمے کے لیے اس سے بہتر الفاظ تلاش کرنا ناممکن ہے جو کافی مدت پہلے سینٹ پال نے اہل فلپائن سے کہے تھے۔

''بھائیو! آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ باتیں خواہ کسی قسم کی ہوں، اگر وہ سچی ہوں، ایماندارانہ ہو، منصفانہ ہوں، بے لاگ ہوں، پیاری ہوں، دل فریب ہوں۔ اگر ان میں ذرا بھی اچھائی معلوم ہوا اور اگر ان کی تھوڑی سی بھی تعریف ہو تو ان پر غور ضرور کیجئے''۔

پڑھنے والوں سے

اس کتاب کو رضیہ سلطانہ نے marxists.org\urdu کے لئے کمپوز کیا۔

marxists.org کا اردو سیکشن آپ کا بہت شکر گزار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے مواد اور اس کے ترجمے کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم آپ کے شکر گذار ہوں گے۔

اپنی رائے کے لئے درج ذیل پتے پر ای میل کریں:

hasan.marxists.org

اس کے علاوہ اگر آپ اردو یا کسی اور زبان کے سیکشن کے لئے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کرنا چاہیں تو انسانی علمی ترقی میں آپ کا حصہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔